اضافہ شدہ پانچواں ایڈیشن

قیامِ امن اور اقوامِ عالم

عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورتحال کے تناظر میں



ڈاکٹر طٰہٰ قریشی MBE

ممبر برٹش ایمپائر یو کے

شیخ زاید اسلامک سنٹر

یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور پاکستان


بسم الله الرحمن الرحيم

قیامِ امن اور اقوامِ عالم

(عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورتحال کے تناظر میں)

قیامِ امن اور اقوامِ عالم

(عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورتحال کے تناظر میں)

(تصحیح واضافہ شدہ پانچویں اشاعت)

ڈاکٹر طٰہٰ قریشی MBE

ممبر برٹش ایمپائر

شیخ زاید اسلامک سنٹر

یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ محفوظ ہیں

نام کتاب

قیامِ امن اور اقوامِ عالم

(عالمِ اسلام کی سسکتی ہوئی صورتِ حال کے تناظر میں)

مصنف: ——— طٰہٰ قریشی، ممبر برٹش ایمپائر

باراوّل: ——— جنوری:2018ء

اشاعت دوم: ——— اپریل:2018ء

اشاعت سوم: ——— جنوری:2023ء

اشاعت چہارم: ——— فروری2024ء

اشاعت پنجم: ——— مئی2025ء

ضخامت: ——— 360 صفحات

تزئین: ——— ابومیسون اللہ بخش

قیمت: ——— PKR: 3000/- £:10, $:15

ناشر

فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ یو کے

Forum for International Relations Development (FIRD)
43-45 Coldharbour Lane Camberwell, London SE5 9NR
t) + 44-20-3417-6890 m) + 44-79-3902-1060
Email: chairman@fird.org.uk

اِس کتاب کی تدوین کے لئے کتب متداولہ، رسائل و جرائد اور انٹرنیٹ سے تحقیق کی گئی ہے مگر آج کل جعلی خبروں کا رواج بن چکا ہے۔ انسانی حد تک صداقت اور باریک بینی سے کام لیا گیا ہے تاہم کسی بھی طرح کوئی حوالہ یا خبر نادرست اشاعت پذیر ہو جائے تو مصنّف کو اطلاع کر کے شکریے کا موقع دیں۔ ان شاءاللہ آئندہ اشاعت میں اصلاح کر دی جائے گی۔

یہ کتاب کاروباری نقطہ نظر سے تیار نہیں کی گئی۔ اس کی تمام آمدن ایک خیراتی ادارے ''سٹاک ویل گرین کمیونٹی سروسز یو کے'' کو دی جائے گی۔

اَلکتاب گرافکس ملتان

0321-6345534 - 0300-6375837
E-mail: alkitabgraphics1@gmail.com

طٰہٰ قریشی فاؤنڈیشن UK کا قیام

Toaha Qureshi
FOUNDATION UK

میری اس کتاب میں جہاں بہت سی محنت، جدوجہد اور اُس کے ثمرات واثرات پر بات ہوتی ہے، وہاں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ یہ کام کسی ایک شخص کی کاوش سے نہیں ہوسکتا۔ اس میں جہاں والدین کی دعائیں، اساتذہ، اکابر اُمت، علماء کرام، مشائخ عظام کی سرپرستی اور رہنمائی بھی ہمہ وقت شامل حال رہی۔ اہلیہ اور میری اولاد بھی میرے لیے ایک امتحان نہیں بنے بلکہ انسانیت کی خدمت میں ہمیشہ کندھے سے کندھا ملا کر چلے۔ قوموں کے عروج وزوال کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (سورۃ الرعد: آیت:۱۱) ''بے شک اللہ تعالیٰ اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا جس قوم کو خود اپنی حالت بدلنے کا احساس نہ ہو۔''

مزید یہ کہ حضور ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لیے ایک اُصول وضع کر دیا کہ قرآن کے سیکھنے اور سکھانے سے شخصیت بہترین ہوجاتی ہے۔ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ (سنن ابوداؤد) ''سب سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھتا اور سکھاتا ہے۔''

میں نے جب مندرجہ بالا آیت اور حدیث کو پڑھا تو یہی سمجھا کہ، بقول علامہ اقبالؔ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کسی انگریز نے اوپر والی گفتگو کو "God Helps Those Who Help Them Selves" جیسے ایک فقرے میں سمو دیا ہے۔

اس سے مجھے ہمیشہ اپنی اور اُمت کی بہتری کے لیے مزید تگ ودو کا ذوق پیدا ہوا اور اللہ کی نصرت بھی شامل حال رہی، جب درج بالا حدیث شریف کا مطالعہ کیا تو ''سیکھنے سکھانے'' سے متعلق ہمیشہ یہی عنصر غالب رہا کہ قرآن کو سیکھو، سمجھو اور اس پر عمل کرو لہٰذا پوری زندگی اس جذبے اور لگن سے بہت سارے کام شروع کیے اور کامیابی ہوئی۔

جب میں نے اپنے اہل خانہ کے علاوہ دیگر دوستوں کے ہمراہ مختلف موضوعات پر مشتمل متعدد کتب تصنیف کیں۔ تو پھر اصرار ہوا کہ میرے چالیس سالہ فلاحی کاموں کو جاری رکھنے کے لیے ''طٰہٰ قریشی فاؤنڈیشن یوکے'' قائم کی جائے۔ لہٰذا میرے بچوں طلحہ قریشی، سعد قریشی، عمر قریشی، سارہ قریشی، عنبر قریشی کی محنت سے لندن میں اس فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اس کے اغراض ومقاصد مندرجہ ذیل ہیں:۔

① ۔حضور ﷺ کے منصب تاج وتخت ختم نبوت کے کام کو یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویشن کورسز کے لیے سکالرشپ دیئے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں جدید تحقیق کے ذریعے مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت اور فضیلت سے آگاہ ہو کر اعلیٰ سطح پر پیش کر سکیں۔

② ۔اسی طرح پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے کام پر بھی ریسرچ کے لیے وظائف دینا۔

③ ۔پاکستان اور دوسرے ممالک کی یونیورسٹیوں میں الحاق کروانا اور پاکستان کے سافٹ امیج کو بہتر بنانا۔

④ ۔پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ختم النبیین و رحمۃ للعالمین سنٹرز قائم کرنا تاکہ نوجوانوں کو موجودہ ٹیکنالوجی کے تحت تحقیق کرنے میں پوری مدد دی جا سکے۔اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی میں ریسرچ سنٹر کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

⑤ ۔اسی طرح پاکستان کے دیگر اداروں بشمول ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان (HEC) اور نیشنل رحمۃ للعلمین وختم النبیین اتھارٹی پاکستان (NRKNA) کے ساتھ تعاون کو آگے بڑھانا۔

⑥ ۔غریب اور نادار لوگوں کو مختلف نوعیت کے امدادی فنڈز مہیا کیے جائیں۔جس طرح کہ غریب، یتیم اور مسکین بچیوں کی شادی وغیرہ۔

⑦ ۔جیلوں میں ایسے افراد کی مدد جو مناسب فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے ضمانت نہیں کروا سکتے اور کسی وکیل کو متعین نہیں کر سکتے۔

⑧ ۔لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سکولوں کا قیام واخراجات کو مہیا کرنا۔

طٰہٰ قریشی فاؤنڈیشن UK اس وقت، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، لیڈز لاہور یونیورسٹی، منہاج یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی آف منیجمنٹ ٹیکنالوجی لاہور، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے علاوہ کئی اور یونیورسٹیوں کے ساتھ تحقیقی مقالہ جات پر کام کروا رہی ہے۔

مزید یہ کہ طٰہٰ قریشی فاؤنڈیشن یو کے نے نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) اسلام آباد میں 20 ملین روپے کا طٰہٰ قریشی وقف فنڈ (Toaha Qureshi Endowment Fund) جنوبی پنجاب کے نادار طلبہ کے لیے قائم کیا ہے۔

Toaha Qureshi
FOUNDATION UK

انتساب

یہ تحریری کاوش

عالمی بدامنی کا شکار ہونے والے تمام لوگوں کے نام

منسوب کرتا ہوں

اظہارِ تشکر

اس اہم علمی و تحقیقی عمل کو سرانجام دینے کے لئے جن علماء کرام سے رہنمائی لی گئی ان میں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب، مفتی شاہ منصور صاحب اور ان کے رفقا کے علاوہ ڈاکٹر سعید اسکندر صاحب، مفتی محمد عثمان قریشی صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور میرے رفیق فکر ابو میسون اللہ بخش کے نام قابل ذکر ہیں۔

مزید برآں خواجہ سلیم رضا آصف، ڈاکٹر اکرم رانا صاحب، نعیم بلوچ صاحب، شوکت اشفاق صاحب، پروفیسر (ر) نسیم شاہد صاحب، سجاد جہانیہ صاحب، سید مظفّر حسین شاہ، خواجہ منور خورشید صاحب، عامر شہزاد صدیقی صاحب، انجینئر محمد ممتاز خان صاحب، اِرتضٰی ملک صاحب، ارمان یوسف صاحب وغیرھم کا شکر گزار ہوں۔

بطور خاص: اپنی مرحومہ والدہ محترمہ، اہلیہ، بہن بھائیوں اور بیٹوں:

✿ طلحہ محمود قریشی ✿ سعد محمود قریشی ✿ عمر محمود قریشی ✿ فرحان قریشی

بیٹیوں ✿ سارہ قریشی ✿ عنبر قریشی ✿ بتول قریشی ✿ شریفہ قریشی ✿ زینب قریشی اور اپنے پوتے، پوتیوں ✿ آدم قریشی ✿ زکریا قاسم قریشی ✿ ماریہ قریشی ✿ مریم قریشی ✿ نائلہ قریشی ✿ حنّہ قریشی ✿ نواسے نواسیوں ✿ اسمٰعیل قریشی ✿ حفصہ قریشی ✿ عالیہ قریشی

ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بڑے صبر اور تندہی کے ساتھ مجھے کام کرنے کے لئے وقت کی قربانی دی۔

فہرست

نورِ ہدایت.....فرمانِ الٰہی 22
سرچشمہ ہدایت.....ارشادِ رسول ﷺ 22
جناح کا پاکستان.....فرمودۂ قائداعظم 23
دانش کدۂ اقبال.....کلامِ اقبال: 23
مصنف کا تعارف:.....ادارہ 24
کتاب کا تعارف .....پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق گوندل 26

حرفِ آغاز

قیامِ امن اور اقوامِ عالم 29
کتاب کے مقاصد 30
رہنما اصول (Guiding Principles) 31
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس :(Might is Right) 32
راکٹ مین اور بھونکنے والا کتا Rocket Man and The Sound of barking dog 32
مسلم سرمائے کے استعمال کا مختصر جائزہ: 33
سوشلزم۔کمیونزم۔کیپٹلزم۔کیا تمام نظام ناکام ہو چکے ہیں؟ 35
سرمایہ دارانہ نظام اور مالی بحران 2008ء: 36
امریکی جنگ: دہشت گردی کے خلاف یا اسلام کے خلاف؟ 38
التحالف الاسلامی العسکری لمحاربۃ الارھاب: 39
انتہا پسندانہ نظریے کے مقابلے کے لیے گلوبل سنٹر کا قیام 40

مومنین تو سب بھائی ہیں 42
اقوامِ عالم کا تضاد 43
سیاسی اور سوشل نیٹ ورکس 44
مذہب سے بیزار مغربی اقوام 45

پہلا باب

مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہولوکوسٹ

غیر مسلموں کی دہشت گردی۔ ایک سوچا سمجھا منصوبہ: 46
''تمہیں زندگی پسند ہے اور ہمیں موت'': 47
صلح حدیبیہ، امتِ مسلمہ کے لئے مستقل رہنمائی: 48
ہولوکوسٹ کیا ہے؟: 50
یورپ میں یہودی اور مسلمان: 52
مغربی دنیا اور سی پیک (CPEC) -A Project of the Century: 53
مسلمانوں کی نقل مکانی اور ہجرت: 55
عراق جنگ اور نام نہاد مہلک کیمیائی ہتھیار: 56
جھوٹ کا انکشاف اور ڈاکٹر کیلی کی پراسرار خودکشی: 57
عراق جنگ کے خلاف برطانوی وزیر خارجہ کا استعفیٰ: 57
امریکہ اور اُس کی جعل سازی: 60
امریکی کمانڈر جنرل ویزلی کلارک کا چشم کشا بیان: 61
برطانوی آرمی چیف کا حقیقت پر مبنی بیان: 61
''گوانٹانا موبے'' انسانیت پر بدنما داغ: 63
ابوغریب جیل، عراق میں انسانیت سوز امریکی مظالم: 64
لیبیا پر امریکی قبضہ سے پہلے اور بعد کی صورتِ حال: 65
شام میں شامِ غریباں: 66
67

ایران اور برطانیہ کی شراکت داری: 70
داعش کے مالی ذخائر 71
ایران اور امریکہ کی شراکت داری 71
روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی اور اقوام عالم کی بے حسی و بے بسی 72
سیکرٹری جنرل (António Guterres) کا بیان: 73
کنیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو (Justin Trudeau) کا مذمتی بیان 74
مغرب کا دوہرا معیار: 75
پاکستان کا نظام تعلیم اور معاشرے کی پولا رائزیشن 78

دوسرا باب

مسلم ممالک پر غیر ملکی افواج کی یلغار اور اس کے منفی نتائج

افغانستان کی تاریخ کا مختصر جائزہ: 82
افغانستان: سیکولرازم اور کمیونزم: 82
پاکستان: فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار: 83
روس کے ٹوٹنے کی وجوہات: 83
مجاہدین کی نا اتفاقی سے نقصان: 85
شر سے خیر: 86
تحریکِ طالبان افغانستان: 87
امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمہ: 87
گیس اور تیل کی کمپنیوں پر مشتمل ایک کنسورشیم CentGas 89
طالبان اور اسلام: 90
خلفاء راشدین کی حکمت: 91
برطانوی صحافی ایوان رڈلی کا اسلام قبول کرنا: 92
القاعدہ کے متعلق طالبان کی پالیسی: 92
93

سعودی عرب میں امریکی افواج کی آمد: 94
9/11 کو امریکی ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور جارج بش کا ''Crusade'' 95
پاکستان کے جید علماء کرام کی ملا عمر سے ملاقات 96
حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کا بیان: 97
9/11 کے حملے کا ذمہ دار کون: 100
القاعدہ۔ 9/11 حملہ کا ذمہ دار؟: 101
9/11 کمیشن کی رپورٹ یا "A 571-page lie"?: 102
''مکمل کنٹرول کی ڈاکٹرن'' پر مبنی امریکی خارجہ پالیسی: 104
افغانستان پر امریکی حملہ..... پھر دنیا بدل گئی 104
بش کے ''Crusade'' پر امریکی ٹیکس دہندگان کا خرچ: 105
نیٹو کے ڈپٹی کمانڈر جنرل نک کارٹر کا بیان: 106
موجودہ صورت حال اور ممکنہ حل 107

تیسرا باب

''سرحدوں کے آگے'' جہاں اور بھی ہیں 109
پاکستان۔ افغانستان جوائنٹ کمیٹی (PAJC) کے اجلاس کی صدارت: 111
PAJC کی سفارشات 112
دوطرفہ تعلقات کو مزید بہتر بنانے کے لیے اقدام 113
یونیورسٹی طلبا کے چبھتے ہوئے سوالات 113
راقم الحروف کا مندوبین سے خطاب 114
افغانستان کے CEO جناب عبداللہ عبداللہ سے ملاقات 116

چوتھا باب

پاکستان کی نظریاتی اساس 118
دوقومی نظریہ: اسلامی، سیکولر یا جمہوری 118

ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ	119
حاکم اعلیٰ (Sovereign) کون؟	123
رجب طیب اَردگان اور آیت اللہ امام خمینی: ریاست کا سیکولر تشخص	124
قائداعظم اور قراردادِ مقاصد	125
قیامِ پاکستان سے قبل قائداعظم کی نظریاتی جدوجہد	126
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے	126
آئندہ نسلوں کے لئے اسلام کی فکر	127
مسلمانوں کے لئے قرآن کے علاوہ ہر پروگرام کی نفی	127
اسلام کے پرچم پر قائد کا فخر	127
اسلام کے خادم کی طاقت	127
قرآن سے رہنمائی	127
مسلم قوم کی روح کی بقا	127
اسلامی تعلیمات اور اقلیتوں کے حقوق	128
دوقومی نظریہ	128
قرآن اور اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ رویہ	128
پاکستان: مدینہ کی طرز کی ریاست	128
پاکستان کا طرزِ حکومت قرآن کے مطابق	129
ایک اللہ، ایک پیغمبر اور ایک قوم	129
قرآن مکمل ضابطہ حیات	129
قرآن اور اسلامی دستور	130
پاکستان کا مطلب: مسلم نظریہ	130
پاکستان اور اسلامی قانون	130
قرآنی اصولوں کی پارلیمنٹ پر برتری	130
پاکستان ایک سیکولر ریاست یا مذہبی	131

تہذیب اور ثقافت ۔ پاکستان کی بنیاد 131
اسلام کے اساسی اصول 131
مقننِ اعظم ﷺ کی اتباع میں نجات 131
پاکستان ۔ اسلام کی تجربہ گاہ 132
سیدنا فاروق اعظمؓ.....قائداعظمؒ کے آئیڈیل 132
ادارہ احیائے ملتِ اسلامیہ (تشکیلِ نو) (1947-1952) 133
بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ (1949 تا 1954) کا قیام 134
دستورِ اسلامی کے لئے علماء کرام کے متفقہ بائیس نکات 134
پاکستان پر بیرونی اثر ورسوخ اور اُس کے نقصانات 136
ایرانی اثر ورسوخ 137
افغان جہاد اور نئی امریکی ڈاکٹرن 139
پاکستان میں جمہوری، قومی، فوجی یا ٹیکنو کریٹس کی حکومت؟ 140
ٹیکنو کریٹس کا ورکنگ گروپ 141
1۔انرجی.....2۔تعلیم.....3۔صحت.....4۔قومی وقار 141
مانیٹرنگ گروپ 142
مصنف کی قومی اور بین الاقوامی سرگرمیوں پر مشتمل تصویری جھلکیاں 143

پانچواں باب

جدید ترکی: اَردگانی فراست کا مظہر 199
سفر کے اہم ترین مقاصد 199
ترکی ۔ مشرق اور مغرب کا ایک انتہائی حسین امتزاج 200
استنبول کی تاریخی حیثیت 201
استنبول کا ایک پینو راما منظر: 201
انتہائی خوبصورت پینو راما مرکز (Panorama centre) 202
پاکستان میں ترکی جیسا ایک پینو راما مرکز: 202

نیلی مسجد (Blue Mosque) 202
طیب اَردگان کی فراست: 202
ناکام فوجی انقلاب ''مجھے کیوں نکالا'' 203
بلند یلدرم ایک مردِ قلندر: 203
خلافتِ عثمانیہ کے دور میں وزارت معارف کی یاد تازہ: 204
ترکی میں درس وتدریس: 205
ترکی کے انصار اور شامی مہاجرین 205
دارالیتامیٰ (Orphan City) اور پاکستانی جھنڈے 205
ترکی میں مقدس مقامات کی زیارات 206
سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار شریف پر حاضری 206
سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا ایوب علیہ السلام کے مزار پر حاضری: 207

چھٹا باب

انتہا پسندی اور دہشت گردی، حقیقت واسباب 208
مسجد کی حفاظت پر معمور غیر مسلم محافظ 209
انتہا پسندی کی نفی قرآن کے آئینے میں 210
انتہا پسندی کی نفی سیرت رسول کے آئینے میں 210
انتہا پسندی کے نقصانات 211
انتہا پسندی کی ایک بڑی وجہ 213
پاکستان میں انتہا پسندی 213
نیکٹا ایکشن پلان کے بیس (20) نکات.....انسدادِ دہشت گردی کا قومی ادارہ 215
بھارت میں انتہا پسندی: 217
انتہا پسندی پر کلام آخر: 219
دہشت گردی کی حقیقت: 220
اسلام کی ظلم کے خلاف جدوجہد: 221

دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اسلامی احکام: 223
آج کی تصویر: 225
دہشت گردی پر کلام آخر 226

ساتواں باب

مغرب کا تصورِ جہاد اور حقیقت جہاد 227
مغرب کا جہاد جیسے ''کارِ خیر'' میں حصہ 228
جہاد کی حقیقت: 230
مقصدِ جہاد 232
دورانِ جنگ عدل وانصاف پر مبنی اصول: 234
جنگ کے قواعد پر عمل کی چند عمدہ مثالیں 236
صلح کی اہمیت وفضیلت 238
اسلام میں جہاد کے اخلاقی اصول 239
جہاد کے بارے میں جذباتی رویے اور اس کے نقصانات 241
کلام آخر 242

آٹھواں باب

مسئلہ کشمیر حقائق کے تناظر میں 243
کشمیر اور اقوامِ متحدہ کی قراردادیں: 245
کشمیر حاصل کرنے کے بہترین مواقع جو ضائع ہوئے! 246
معاہدہ لاہور، جنگ کارگل اور معاہدہ واشنگٹن: 247
موجودہ حالات میں چند اہم حقائق: 249
کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ 250

نواں باب

مسئلہ فلسطین: قیام اسرائیل تک 253
عہدِ فاروقی میں بیت المقدس کی فتح 253

صلاح الدین ایوبی اور بیت المقدس 254
خلافت عثمانیہ میں بیت المقدس کا انتظام 254
خلافت عثمانیہ کا خاتمہ 255
اسلامی ریاستوں میں یہودیوں کی حالت 255
قیام اسرائیل کے وقت یہودیوں کی حالت 256
اسرائیل کی ترقی 257
آزاد اسرائیل کا قیام 258

دسواں باب

قیام اسرائیل کے بعد 260
جولائی 2000ء کے مذاکرات 260
امریکہ کا نیا روڈ میپ (Road Map) 262
حماس اور الفتح آمنے سامنے 263
اسرائیل کی تعمیر و ترقی 264
چند اہم نکات 265
مسئلے کا ممکنہ حل 266

گیارہواں باب

اسرائیل سے سلام (Shalom) 268
امریکی سیاح اور ایک لطیفہ: 268
آکسفورڈ یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر ایوی شلیم سے ملاقات: 268
اسرائیلیو! تم ہولوکوسٹ کیسے بھول سکتے ہو: 270
اسرائیلی ایک مورل فورس؟ 270
صیہونیت مخالف یہودی: 271
یہودیت اور صیہونیت: 272

ایک سرپرائز: 272
جدید ٹیکنالوجی اور اسرائیلی معیشت: 273
مسجد اقصیٰ کا تاریخی سحر: 273
ارضِ فلسطین کی وسعت سب کو سما سکتی ہے 274

بارہواں باب

اسرائیلی تلخ رویوں کا مہمان نوازی میں بدلنا 275
سینٹ جارجز کالج یروشلم القدس میں تعلیمی پروگرام: 275
دیوارِ گریہ: 276
مسجدِ اقصیٰ اور دیوارِ گریہ کا سحر: 276
عربوں کی نسل کشی اور ''بھوتوں کا شہر، یروشلم'': 277

تیرہواں باب

بین الاقوامی تعلقات: مفہوم، تقاضے 279
اسلام اور بین الاقوامی تعلقات: 279
عدل وانصاف: 280
معاہدہ کی پاسداری: 280
ایفاءِ عہد کی اہمیت: 281
غیر مسلموں سے اظہار ہمدردی کا حکم: 281
اظہار ہمدردی کی درخشندہ مثالیں: 281
بھلائی کے کاموں میں باہمی تعاون: 282
حلف الفضول اور اس کی اہمیت: 282
فتح مکہ اور صلح حدیبیہ 284
بین الاقوامی تعلقات اور مسلمان: 284
بین الاقوامی تعلقات، دورِ حاضر کے تناظر میں: 285
خطبۃ الوداع سے چند اقتباسات: 285
خطبہ حجۃ الوداع کی اہمیت: 286

مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ سلوک: 286
مسلم ممالک کے غیر مسلم باشندوں کے احکام: 287
دارالاسلام، دارالکفر، دارالامن، اور دارالحرب کی حقیقت: 288
دارالاسلام: 288
دارالکفر اور دارالامن: 289
دارالحرب: 290

چودہواں باب

موجودہ عالمی انتشار پر اسلامی نقطہ نظر 291
سیدنا امام مہدی علیہم الرضوان کا ظہور: 292
سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول: 292
دجال کا نکلنا۔ اللہ کی طرف سے سخت امتحان: 293
یاجوج ماجوج کا نکلنا: 294
استنبول (ترکی) پر یورپی قوتوں کا قبضہ: 294

پندرہواں باب

قیامِ امن کے لئے آسان حل.....مخلوق کے لئے خالق کا نظام 295
اللہ تعالیٰ کا متقیوں کے ساتھ ہو جانا: 299
تقویٰ کیا ہے 299
باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں: 299
تقویٰ کی راہ میں رکاوٹ: 300
نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ 301
شیطان و نفس سے بچاؤ کی تدابیر: 302
حاصل کلام 303
حوالہ جات 307
کتابیات 317



نورِ ہدایت.....فرمانِ الٰہی

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

(الحجرات:۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنا دیے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (نہ کہ ایک دوسرے سے تعصب یا نفرت کرو)، بے شک تم میں سے عزت و اکرام والا وہ ہے جو تم میں سے پرہیزگار ہے"

(القرآن الکریم)

سرچشمہ ہدایت.....ارشادِ رسول ﷺ

اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ

بہترین مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے (کہ اس سے معاشرے میں بدامنی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔) (الحدیث)

❀❀❀

دانش کدۂ اقبال.....کلامِ اقبال

منفعت ایک ہے اِس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی،دین بھی ،ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

علامہ اقبالؔ

جناح کا پاکستان.....فرمودۂ قائداعظم

یہ (پاکستان) ایک اسلامی ریاست ہوگی جو کہ ریاست مدینہ کی طرز پر ہوگی، جہاں انسانی حقوق، مذہبی آزادی، جمہوریت اور مکمّل تحمل اور برداشت، نیز تمام شہریوں کو بلاتفریق رنگ، عقیدہ، نسل، زبان، ضمیر کی آزادی کی امانت دی جائے گی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے عیسائیوں، یہودیوں، بت پرستوں اور دیگر انسانوں کو دی گئی تھی۔ عدل وانصاف، بھائی چارہ، آزادی، مساوات اور اتفاق واتحاد کو اوّلیت وفوقیت حاصل ہوگی۔

قائداعظم محمد علی جناح
مارچ۔1942ء

مملکت خداداد پاکستان میں آپ چاہے عبادت کے لئے گرجا گھر میں جائیں یا مسجد میں یا آپ کسی بھی عبادت گاہ میں جائیں، آپ مکمّل آزاد ہیں۔ آپ چاہے کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلّق رکھتے ہوں، برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم تہذیب وثقافت کے بنیادی اصولوں پر اس ملک کی بنیاد رکھ رہے ہیں جس میں ہر شہری کو تحفّظ حاصل ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح
11 اگست۔1947ء

مصنّف کا تعارف

طٰہٰ قریشی صاحب ملکہ برطانیہ کی طرف سے ایوارڈ یافتہ ممبر برٹش ایمپائر ہیں اور برطانوی ایوانوں و پالیسی ساز اداروں میں متاثر کن اثر ورسوخ رکھنے والے ایک صاحب علم و دانش ''برٹش پاکستانی مسلم'' کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ تعلیمی میدان میں وسیع خدمات، انتہا پسندی کے خاتمے (Deradicalisation)، بین الاقوامی تعلّقات میں بہتری، بین المذاہب ہم آہنگی اور قیام امن کے لیے اُن کی انتھک کوششوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کے تجزیات نہ صرف پاکستان کے چینلز بلکہ بی بی سی، سی این این کے علاوہ کئی اور انٹرنیشنل چینلز پر بھی نشر ہوتے ہیں۔

کتابِ ہٰذا ''قیام امن اور اقوام عالم۔ عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورتِ کے تناظر میں'' ان کی تازہ ترین تخلیق ہے جس میں انہوں نے نہ صرف بدامنی کے حوالے سے بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے وجوہات کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ کچھ حل بھی پیش کیے ہیں۔ جہاں انہوں نے مغرب کی مسلم مخالف خارجہ پالیسی اور دہرے معیار کو حقائق کی روشنی میں آشکارا کیا ہے وہاں مسلمان ممالک کی بے حسی اور بے حمیتی کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طٰہٰ قریشی صاحب جہاں دیدہ اور صاحب حال لوگوں میں سے ایک ہیں جو زوال امت کے حقیقی اسباب سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بجا طور پر دور جدید میں بین الاقوامی مسائل کے حقیقی نباض ہیں۔

مصنّف نے حقائق اور اعداد وشمار کو جس طریقے سے پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحقیقی کام کئی سال کی شب وروز محنت کا نتیجہ ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انتہا پسندی، دہشت گردی اور جہاد جیسے انتہائی نازک موضوعات کو اس احسن طریقے سے پیش کیا ہے کہ بہت ساری گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور کتاب پڑھ کے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحقیقی کام صرف گھر بیٹھ

کرنہیں کیا گیا بلکہ کئی ممالک کے اسفار کر کے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔

اس کتاب میں بڑی محنت کے ساتھ جہاں افغانستان، عراق، لیبیا اور شام میں بے جا و غیر متناسب بین الاقوامی مداخلت اور بے حساب جانی و مالی نقصانات کو حقائق کی روشنی میں قلمبند کیا ہے وہاں امت مسلمہ کی اجتماعی لغزشوں اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کو بھی زیرِ تحریر لایا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وطن عزیز پاکستان کو اندرونی اور بیرونی محاذوں پر جن چیلنجز کا سامنا ہے اور مستقبل میں ہو سکتا ہے کی نشاندہی کرنے کے علاوہ ان کا مقابلہ کرنے کی بھی تجاویز دی گئیں ہیں۔ مزید برآں وطن عزیز کے نظریاتی دفاع کیلئے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا گیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بیرونی دنیا میں پاکستان کا دفاع جس والہانہ انداز میں کیا ہے وہ اس کتاب میں بالکل مترشح ہے۔

مصنّف نے بڑی مہارت سے ملت ابراہیمی کے ساتھ منسلک مذاہب کی توجہ قیام امن اور مذاہب کے کردار جیسے اہم موضوع کی طرف بڑی خوش اسلوبی سے مبذول کرائی ہے کہ موجودہ جنگیں مذہبی نہیں بلکہ وسائل کی ہیں۔

مصنّف نے اس اہم اور نازک موضوع پر کام کرتے ہوئے اپنے اسفار کو اِن موضوعات میں بڑے خوبصورت اور دلچسپ انداز سے جوڑا کہ وہ تحریر ایک تاریخی حقیقت کے ساتھ ساتھ موجودہ صورتِ حال کو بھی بیان کرتی نظر آتی ہے۔ اس قومی دستاویز میں مصنّف کے اسلوبِ بیان کی روانی اور مدلل و مزین عبارات نے قارئین کے لئے انتہائی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ جیسا کہ:

''پہلے ظلم کے خاتمہ کے لیے یا کسی تنازعہ کے حل کے لیے جنگ لڑی جاتی تھی لیکن اب ظلم یہ ہے کہ اسلحہ کو بیچنے کے لیے پہلے جنگی ماحول پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال کے لیے کسی ایک ملک کو ٹیسٹنگ گراؤنڈ کے طور پر چنا جاتا ہے، آج کل مسلم دنیا کو مستقل طور پر ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنا دیا گیا ہے۔''

ہر باب کی موضوع کے اعتبار سے اہمیت کو سامنے رکھا جائے تو ہر باب ایک الگ الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ لیکن مصنّف نے انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

ادارہ

کتاب کا تعارف

بعض اوقات کوئی کتاب متاثر کرتی ہے لیکن صاحب کتاب اپنے طرز زندگی اور رویے سے قاری کے تاثر کو خراب کر دیتا ہے، مگر انگلستان ہی نہیں پورے مغرب کی مادیت کے سارے امکان ہاتھ میں ہونے کے باوجود جناب طٰہٰ قریشی صاحب اسلام اور پاکستان دوستی کو اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں، تو یقین ہو جاتا ہے کہ ایسی شخصیت کو ایسا عظیم کارنامہ ہی سرانجام دینا چاہیے۔

ایک صاحب علم و عمل کی کتاب کے مخاطب آٹھ ارب سے زائد سارے انسان ہیں جن کی زندگیاں سنگین بدامنی اور خشکی و تری میں پھیل جانے والے فساد نے داؤ پر لگا دی ہیں۔ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف عالم اسلام کو نرم چارہ بھی بنا دیا گیا ہے اور مجرم بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ قریشی صاحب نے اسلام اور پاکستان کے حوالے سے پورے اعتماد اور ناقابل تردید اعداد و شمار کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ مغرب نے اپنے اقتدار اور میڈیا کو استعمال کر کے عالم اسلام میں دھشت گردی اور جس انتہا پسندی کی افزائش کی وہ آگ اب بے گناہ مسلمان معاشروں کو جلانے کے بعد مغربی سماج ہی نہیں پورے عالم کے امن کیلئے خطرہ بن چکی ہے۔

''قیام امن اور اقوام عالم'' امریکہ میں نائن الیون 2001 اور لندن جولائی 2005 کے بعد ایک طرف تو مسلم دنیا میں اسلحے کے تاجروں کے انسان دشمن اھداف کو دلیل اور مستند تحقیقی معیار کے ساتھ بے نقاب کرتی ہے، دوسری طرف یہ ریسرچ ورک محض مسلمانوں کے دکھوں کا نوحہ نہیں بلکہ عالم اسلام کے بے حس مغرب زدہ حکمرانوں اور اھل دانش کے فکری مغالطوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ مصنف نے جہاں مختلف رائج الوقت نظاموں پہ تنقید کی ہے وہاں مسلم اُمہ سے یہ بھی سوال کیا ہے کہ ہم نے کس ریاست میں اسلامی معاشرے کی تنفیذ کی ہے؟ تاکہ ہم بیرونی دنیا کو مثال دے کر بتا سکیں کہ یہ ہے کامیاب، پرامن، معاشی طور پر خوشحال، غریب پرور اور عدل و انصاف سے بھرپور معاشرہ۔ بقول اقبال:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رُسولِ ہاشمی

مصنف نے جن رپورٹس، دستاویزات اور کتب و رسائل سے حوالہ جات دیے ہیں ان کو تحقیقی اعتبار سے چیلنج کرنا بہت مشکل ہے، دلائل وزنی ہیں اور اسلوب اتنا عادلانہ کہ اکیسویں صدی میں کسی بھی معاشرے یا مذھب سے تعلق رکھنے والا

انسان قریشی صاحب کے تجزیے سے اتفاق ہی کرے گا۔ مصنف نے نہ صرف علمی و تجزیاتی انداز میں بیسویں صدی کے دو نمایاں نظاموں سوشلزم اور سرمایہ داری کے تضادات کو بے نقاب کیا ہے بلکہ ان باطل نظریات نے کس طرح عالم اسلام کو ہر شعبہ زندگی میں نقصان پہنچایا ہے۔ اس کو بھی واضح کیا ہے خاص طور پر 2008 کے عالمی معاشی بحران کے پوری انسانیت کیلئے تباہ کن نقصانات کا ذمہ دار مغربی افکار اور سرمایہ دارانہ نظام کو قرار دیا ہے، ان دونوں نظاموں پر تبصرے کا انداز ٹھوس استدلال اور حقائق پر مبنی ہے۔ بقول اقبال:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

مصنف نے بجا طور پر واضح کر دیا ہے کہ عراق پر جو جنگ مسلط کی گئی اس کی بنیاد جھوٹ تھی جس کی شہادت کتاب میں برطانیہ کے چیف سائنسدان ڈاکٹر ڈیوڈ کیلے (Dr. David Kelly) کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں انہوں نے واضح طور پر بیان دیا کہ عراق کے پاس کوئی مہلک ہتھیار نہیں تھے۔ اور اسی طرح برطانوی وزیر خارجہ رابن کک Robin (Cook) کی طرف سے استعفیٰ اور اس جنگ کی مخالفت کے دستاویزی ثبوت ہیں، جو ناقابل تردید ہیں۔ مصنف نے امریکی کمانڈر جنرل ویلزی کلارک Wesley Clark کے بیان کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ انہیں شام، لبنان، لیبیا صومالیا، سوڈان اور ایران کو پانچ سالوں میں ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔

مصنف نے اسلامی ممالک پر مغرب کے حملوں کو عالم اسلام کا معاشی ہولوکاسٹ قرار دیا۔ جناب طٰہٰ قریشی نے عالم اسلام کے سلگتے مسئلے افغانستان کے دورے کر کے مختلف کانفرنسوں کی صدارت کی اور امن کی راہ کو ہموار کیا۔

مصنف نے بہت مؤثر دلائل کے ساتھ اغیار کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں ریاست پاکستان اور عوام کی قربانی اور کردار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب اہل علم اہل دانش اور بین الاقوامی امور کے طلبہ کیلئے بہت مفید ہے قاری کو دلائل و براھین سے بتایا گیا ہے کہ اب جنگیں عسکری سے زیادہ معاشی ہیں، مغربی طاقتیں اسلحے کی تجارت کرتی ہیں، معاشی اھداف کے حصول کیلئے کوئی اخلاقی ضابطہ اور معاہدہ کارگر نہیں اور اس تاجرانہ ذہنیت نے اپنے اسلحے کیلئے کشمیر فلسطین عراق شام، لیبیا اور افغانستان کو اسلحے کی تجربہ گاہ Testing Ground بنایا ہے۔

مصنف نے عالم اسلام کی قیادت اور اہل دانش کو قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ سیاسی و معاشی میدان میں قوی اہل ایمان ہی دین کا تقاضا ہیں کیونکہ:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

مصنف نے تقویٰ اور زمینی حقائق یعنی دنیوی ترقی کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ،قرنِ اول کے حوالے کے ساتھ مسلم امہ کو جگانے کی سعی کی ہے۔ نیز مصنف کے قلم کا محرک حرارت ایمان ہے وہ مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کیلئے خالق کی طرف سے بطور نعمت عطا کیے جانے والے اسلام کو امن کی واحد ضمانت قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی امید مرنے نہیں دیتے۔ یہ کتاب اسلام کے تصور جہاد کو مسلم دنیا کے ساتھ ساتھ انسانی دنیا کے سامنے بھی خیر تعمیر اور بھلائی کے ماخذ کے طور پر پیش کرتی ہے تاہم امن جس کی تمنا ہابیل کے قتل کے زمانے سے لیکر ہمارے عہد تک زندہ ہی نہیں رہی بلکہ اس کی ضرورت و اہمیت کا شعور اور پرچار پہلے سے کہیں بڑھ گیا ہے اس کتاب نے اسلام کو انسانیت کے نجات دھندے کے طور پر پیش کیا ہے جبکہ پاکستان کی پیشانی کے داغ دھو کر پاکستان کے چہرے کو روشن کیا ہے ہر سطر میں حقیقت اور ہر لفظ میں عزم اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر محب اسلام اس کتاب کی فکری اذان کا حصہ بنے۔

پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق گوندل
شیخ زید اسلامک سنٹر
یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور

حرفِ آغاز

قیامِ امن اور اقوام عالم

(عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورت حال کے تناظر میں)

میں نے اپنے مشاہدات و تجربات پر مشتمل اپنی خودنوشت سوانح عمری کتابی شکل میں 2014 کو ''میرا جہاد۔ چک نمبر ۴۴۴ سے بکنگھم پیلس تک'' کے نام سے لکھی۔

جس کو Pakistan Federal Union of Journalists (PFUJ) اور

Forum for International Relations Development (FIRD)

کے زیر اہتمام شائع کیا گیا، جس کی تقاریب رونمائی کراچی، اسلام آباد، لاہور اور ملتان کے پریس کلبوں کے زیر اہتمام کی گئیں۔ ''میرا جہاد'' میری انگریزی کی کتاب "My Journey: From Chak 444 to Buckingham Palace" کی تلخیص تھی۔ اندرون و بیرون ملک مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے اہل علم حضرات نے اس علمی کاوش کو خوب سراہا، اور ساتھ ہی مجھ سے بار بار یہ تقاضا بھی ہوا کہ جس اعلیٰ سطح پر میرا تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے، اُس کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا میں روز بروز بڑھتی ہوئی بدامنی، افراتفری، فاشزم، انتہا پسندی، دہشت گردی، قیام امن، اقوام عالم کا کردار اور عالم اسلام کی بے حسی اور بے بسی کے حوالے سے بھی کچھ تجزیات اور حقائق قلم بند ہونے چاہئیں۔ بالخصوص وطن عزیز پاکستان میں بڑھتی ہوئی بدامنی، کراچی، بلوچستان اور شمالی سرحدی علاقوں میں انتہا پسندوں کے متوازی نظام کے نقصانات سے بہت دوست پریشان مگر بے بس نظر آ رہے تھے۔ لیکن مجھے اس کا بہر حال شدت سے احساس تھا کہ:

اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

کیونکہ میں بھی بین الاقوامی صورتِ حال سے سخت نالاں اور فکر مند تھا۔ اور برطانیہ میں ہالینڈ اور جرمنی جیسے ممالک کے مختلف اداروں کے ساتھ ملکر انتہا پسندی اور دہشت گردی کو روکنے کے لئے عملی طور پر میدان میں تھا یہاں نہ صرف انتہا پسندی کو روکنے کے لئے مختلف پروگرام ڈیزائن کیے جا رہے تھے بلکہ وہ لوگ جو برطانیہ کی جیلوں میں دہشت گردی کے قانون (Terrorism Act) کے تحت گرفتار ہو کر اپنی سزائیں بھگت رہے تھے۔ اُنکو پیرول پر رہا کروا کے واپس معاشرے کے کارآمد افراد بنانے (Rehabilitation) کے بھی پروگرام ڈیزائن کر کے متعارف کروائے جا رہے تھے لہٰذا

ہمیں براہِ راست ایسے لوگوں سے مل کر اُن کی سوچ اور نفسیات کو سمجھنے کا موقع مل رہا تھا اس لیے ان موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا گیا، جوں جوں اس پر ریسرچ کی گئی تو اندازہ ہوتا چلا گیا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں بلکہ انتہائی پیچیدہ اور گھمبیر ہے۔

اِس کتاب کا ایک ورکنگ ٹائٹل ''میرا پاکستان'' کے نام سے بنایا گیا تھا تا کہ اس کام کو شروع تو کیا جائے۔ حتمی نام ابواب کے چناؤ اور تکمیل کے بعد فائنل کیا جائے گا۔ لہٰذا ابواب کا چناؤ کیا گیا پھر معلوم ہوا کہ اِس کتاب کے ابواب اسقدر اہمیت کے حامل ہیں کہ ہر باب اپنی اہمیت کے پیشِ نظر ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے مجھے کئی ممالک بشمول فلسطین، اسرائیل، ترکی، مصر، سعودی عرب، پاکستان، افغانستان، بلجیم، فرانس، ہالینڈ جرمنی، ناروے، سویڈن کے کئی اسفار کرنا پڑے۔ کئی ممالک کے متعدد سیاسی و مذہبی رہنماؤں، تجزیہ نگاروں، شعبہ تعلیم کے ساتھ منسلک دانشوروں سے ملاقاتیں کیں اور بے شمار لائبریریوں کو کھنگالا، متعدد کتب کا مطالعہ کیا۔ گویا کہ اِس طویل تعلیمی سفر میں جہاں مختلف موضوعات پر بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کو ملا وہاں مذہب اسلام کے کئی پوشیدہ حقائق کو بھی نئے سرے سے دریافت کرنے کا موقع بھی ملا کہ

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

کتاب کے مقاصد:

اِس کتاب میں میرے مخاطب پوری دنیا کے لوگ بالعموم اور ملت ابراہیمی سے تعلق رکھنے والے تینوں طبقات یہودی، عیسائی اور مسلمان بالخصوص ہیں۔ اس ابراہیمی رِشتے کے حوالے سے آپس میں کزن ہیں اور آخرت میں جزا اور سزا پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا جہاں امت مسلمہ کو موجودہ اور مستقبل میں بدامنی کے حوالے سے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرنا اور احساسِ ذمہ داری دلانا ہے وہاں مغربی اقوام کی توجہ کو بھی امن عالم کی طرف مبذول کرانے کی ایک کوشش ہے کہ ظلم کرنے والے کا انجام تو برا ہوتا ہی ہے لیکن ظالم کی طاقت کو سہارا دینے والا بھی اِس انجام کے تباہ کن اثرات سے نہیں بچ سکتا۔

اس کتاب کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

☆.....امن کی اہمیت کو اجاگر کرنا
☆.....امن کے راستے میں رکاوٹوں کی نشاندہی کرنا
☆.....بدامنی کے اسباب جاننا
☆.....قانون کی حکمرانی (Rule of Law) پر زور دینا
☆.....جنگی جنون کو روکنا
☆.....جنگوں سے جانی اور مالی نقصانات سے متعلق آگاہی دینا
☆.....وسائل کو چھیننے کے بجائے مل کر استعمال کرنے کی ترغیب دینا
☆.....اقوام عالم کی بین الاقوامی معاملات میں ناکامی پر روشنی ڈالنا

کہ اسلحہ کے سوداگروں کے لیے ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہے۔ پہلے ظلم کے خاتمہ کے لیے یا کسی تنازعہ کے حل کے لیے جنگ لڑی جاتی تھی لیکن اب ظلم یہ ہے کہ اسلحہ کو بیچنے کے لیے پہلے جنگی ماحول پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال کے لیے کسی ایک ملک کو ٹیسٹنگ گراؤنڈ کے طور پر چنا جاتا ہے، آج کل مسلم دنیا کو مستقل طور پر ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنا دیا گیا ہے۔

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس: (Might is Right)

موجودہ منظر یہ بتاتا ہے کہ امریکہ کے ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' والے فارمولے نے انسان کو امن سے کتنا دور کر دیا ہے، اور امریکہ کی اسی پالیسی کی وجہ سے روس کا بھی ردعمل جارجیہ، یوکرین، اوسیشیا، اور شام میں دیکھنے کو ملا ہے۔ اور تیسری عالمی جنگ کے خطرات نے کس طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میری رائے میں اگلی چند دہائیوں میں عالمی طاقتیں عملی طور پر ایک عالمی جنگ کا آغاز کر چکی ہوں گی۔ اگر روس اسی طرح اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا رہا اور چائنا اُس کے ساتھ کھڑا رہا تو عین ممکن ہے کہ امریکہ اپنی جنگجویانہ رویوں سے باز آ جائے۔

گویا کہ انسان کے اوپر جنگل کا قانون لاگو کیا گیا ہے۔ اور اِس دفعہ جنگل درختوں کا نہیں، کنکریٹ کا جنگل (Concrete Jungle) ہے۔ اگلے صفحات میں افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کی تباہی و بربادی اور اُس کے منفی اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ کس طرح انسانیت کو افراتفری و بدامنی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ماحول نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

راکٹ مین اور بھونکنے والا کتا۔ Rocket Man and The Sound of a barking dog

پچھلے کئی سالوں سے امریکہ اور نارتھ کوریا کی لفظی جنگ میڈیا کے ذریعے جاری تھی اور دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ لیکن نارتھ کوریا نے اپنی دفاعی ترقی جاری رکھی اور اب ہائیڈروجن بم تک کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے۔ لہٰذا 2017ء کے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے تمام اخلاقی اور سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نارتھ کوریا کے سربراہ کِم یانگ اُن (Kim Jong-UN) کو ''راکٹ مین'' (Rocket Man) کے توہین آمیز نام سے پکارا اور کہا کہ کِم یانگ اُن (Kim Jong-UN) خودکشی کے مشن پر ہے، جب کہ کِم یانگ اُن نے امریکی صدر کو پاگل اور بیوقوف (Mentally deranged) کے نام سے پکارا۔ نارتھ کوریا کے وزیرِ خارجہ ری یانگ ہو (Ri Yong Ho) نے امریکی صدر کو ایک بھونکنے والے کتے کی آواز (The Sound of a barking dog) کے نام سے موسوم کیا ہے۔(1)

ٹرمپ نے مزید دھمکی دی کہ امریکہ نارتھ کوریا کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دے گا اور اپنے جنگی جہازوں کو نارتھ کوریا کے بارڈر کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس پر نارتھ کوریا کا ردعمل بھی آیا ہے۔ اِس غیر سفارتکارانہ گفتگو کا بین الاقوامی سطح پر سختی سے نوٹس لیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ڈائیلاگ سے مسئلے کا حل نکالا جائے۔

میری رائے میں امریکہ کبھی بھی ایسی حماقت نہیں کرے گا کہ نارتھ کوریا پر حملہ کرے کیونکہ یہ جنگ اب روایتی طریقے سے نہیں لڑی جائے گی بلکہ انتہائی مہلک کیمیائی اور ایٹمی ہتھیار استعمال ہوں گے۔ اس کا متحمل کون ہو سکتا ہے؟ دوسرا اہم عنصر جو اِس قضیے میں امریکہ کو کنٹرول میں رکھنے کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہ ہے چین اور روس کی پارٹنرشِپ میں اُبھرنے والی متبادل سپر پاور۔ کیونکہ شمالی کوریا کے اتحادیوں میں چین بھی شامل ہے لہٰذا وہاں ایٹمی صلاحیتوں میں اضافہ، ہتھیاروں کی تیاری اور ''انسانی حقوق'' کی پامالی کے خلاف مغرب کا کوئی عملی ردعمل نہیں بلکہ صرف زبانی جمع خرچ

☆.....مذہبی دنیا کی بین الاقوامی سیاسی معاملات میں عدم دلچسپی کے نقصانات کی نشاندہی
☆.....مذہب کو وسائل کی جنگوں سے علیحدہ کرنا۔
☆.....پاکستان کی نظریاتی اساس اور مسائل کی وضاحت کرنا۔
☆.....انتہا پسندی، دہشت گردی اور جہاد میں فرق کو سمجھنا۔
☆.....مندرجہ بالا نکات سے متعلق چند حل پیش کرنا۔

رہنما اصول (Guiding Principles)

اِس کتاب کے مضامین کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل رہنما اصول (Guiding Principles) متعین کیے گئے ہیں۔ اِس امید سے کہ یہ اصول امن کے قیام پر کام کرنے والوں کی راہنمائی کر سکیں گے۔

اوّل: قیامِ امن، بدامنی وافراتفری کے اختتام اور عوام کو پُرسکون ماحول کی فراہمی صرف حکومت کی نہیں بلکہ سول سوسائٹی کی بھی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا حکومت کی رٹ قائم کرنے میں عوام کا حکومتی اداروں کے ساتھ تعاون انتہائی اہم ہے۔

دوم: امن دو افراد، قبائل، اقوام یا ممالک کے درمیان قائم ہوتا ہے یعنی دونوں تسلیم کریں کہ وہ حالتِ جنگ میں ہیں یا جنگ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

سوم: امن تب ہی قائم ہوسکتا ہے جب متحارب قوتیں حقیقت میں امن کی متلاشی ہوں۔

چہارم: امن کی ضمانت تب ہی مل سکتی ہے کہ متحارب گروہوں یا قوموں میں طاقت کے توازن میں زمین و آسمان کا فرق نہ ہو۔

پنجم: متحارب افراد یا گروہ سنجیدگی سے دونوں ایک دوسرے کی بقا پر عملی طور پر یقین رکھتے ہوں۔

ششم: بدامنی کی مناسبت سے اُس کا حل درکار ہے اور اُسی تناسب سے اس کے لیے وقت اور وسائل درکار ہیں۔

ہفتم: ملکی اور بین الاقوامی ادارے خود پر بھی قانون کی حکمرانی (Rule of Law) کا اطلاق یقینی بنائیں اور دوسروں کو بھی اُس کا پابند کریں۔

مندرجہ بالا نکات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت بدامنی کہاں، کس نے، کیوں اور کیسے پیدا کر رکھی ہے۔ اُس کی کئی مقامی وجوہات اور زمینی حقائق ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طاقتور ممالک اور اُن کے اتحادیوں کی نیو ورلڈ آرڈر کی پالیسی بھی کام دکھا رہی ہے۔ لہٰذا اِس مسئلے کو چند صفحات یا سادہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تو نہیں لیکن انتہائی مشکل ضرور ہے۔ اس لیے کتاب کی طوالت کو بھی کنٹرول کرتے ہوئے اور قاری کو کم وقت میں بات سمجھانے کے لئے مختلف موضوعات کو اعداد و شمار و حقائق کی روشنی میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اس وقت دنیا ایک عجیب پریشانی سے دوچار ہے۔ عالم اسلام بالخصوص اور باقی دنیا بالعموم بدامنی اور فساد کا شکار ہے یا اس کے اندیشے میں مبتلا ہے۔ بیسیوں ممالک باہمی کشمکش کی آگ میں جل رہے ہیں۔ داخلی طور پر بھی لوگ سہمے ہوئے اور بے چین ہیں۔ دنیا بھر میں ہتھیاروں کی دوڑ جاری ہے۔ ہر ملک اربوں روپے محض دفاع پر خرچ کر رہا ہے۔ اگر اس پر حملہ نہیں ہوا تو وہ اس خوف میں ضرور مبتلا ہے کہ اس پر کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا ہے۔ گویا

کی صورت میں ہی ہوگا۔

لہٰذا مسلم ممالک جو کہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں لیکن دفاعی لحاظ سے کمزور ہیں وہ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ نہ جانے کب کوئی عالمی طاقت ان پر حملہ کر کے کسی بہانے ان کے وسائل پر قبضہ کر لے۔ رہے کمزور ممالک وہ تو ویسے ہی سہمے ہوئے ہیں کہ کہیں کوئی بڑا ملک انہیں ہڑپ نہ کر لے۔

میں سمجھتا ہوں کہ رواں صدی میں عالمی طاقتیں عملی طور پر موجودہ مشرق وسطیٰ کی جنگ کو ایک عالمی ایٹمی جنگ کے دہانے پر لے جا چکی ہوں گی۔ جو کہ موجودہ ساری ترقی کو نیست و نابود کر دے گی۔ یعنی F16 جنگی جہاز ہوں گے نہ اپاچی ہیلی کاپٹر ہوں گے نہ وار شپ ہوں گے، نہ کروز میزائل اور نہ ہی ڈرونز ہوں گے۔ گویا انسان بجلی اور تیل جیسے وسائل سے پھر محروم ہو جائیگا اور واپس پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا جائے گا۔

اس خوف اور عدم تحفظ کی وجہ سے تقریباً تمام ملک اپنے دفاعی بجٹ کو بڑھانے پر مجبور ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ (Stockholm International Peace Research Institute=SIPRI) کے مطابق اسٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹیٹیوٹ (SIPRI) کے مطابق، 2022 میں عالمی فوجی بجٹ 1842 بلین امریکی ڈالر ہے جبکہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹجک اسٹڈیز (IISS) کے مطابق، 2021 میں، امریکہ اور چین نے بالترتیب 754 بلین امریکی ڈالر مختص کیے تھے۔ ڈالر اور 3. 207 بلین امریکی ڈالر نے پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سعودی عرب نے اپنے دفاعی بجٹ میں 7.63 بلین امریکی ڈالر مختص کر کے نویں پوزیشن حاصل کی اور روس، برطانوی ہندوستان، فرانس، جاپان اور جرمنی وغیرہ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پیچھے ان ممالک کی پوزیشن بالترتیب چوتھے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، آٹھویں اور نویں ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان، فرانس اور جرمنی سے زیادہ خرچ کر کے چھٹا مقام حاصل کرتا ہے اس سیکشن کو نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ آئی آئی ایس ایس کی ویب سائٹ پر درجہ بندی بدل گئی ہے(2)۔

سعودی عرب تو اسرائیل کے ساتھ اپنے خفیہ دوستانہ تعلق قائم کر چکا ہے اور خفیہ سفارت کاری بھی کر رہا ہے عین ممکن ہے جب یہ کتاب اگلے سال میں سامنے آئے تو یہ تمام باتیں سب پر آشکار ہو جائیں۔ اسرائیل کے علاوہ خطے میں سعودیہ کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔؟

مسلم سرمائے کے استعمال کا مختصر جائزہ:

اکثر مسلمان ممالک اپنے سرمائے کو اپنی عوام کی فلاح و بہبود، تعلیم اور صحت پر خرچ کرنے کی بجائے مغرب سے اربوں ڈالر کا اسلحہ خرید کر اُن کی معیشت کو مضبوط بنانے کا سبب بن رہے ہیں لیکن شومئ قسمت کے اس سب کچھ کے باوجود اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ مختلف تحقیقی اداروں اور ویب سائٹس پر اعداد و شمار مختلف ملتے ہیں لیکن ایک سٹینڈرڈ رکھنے کے لئے ہم نے SIPRI کی تحقیق کردہ اعداد و شمار لئے ہیں۔

SIPRI اور International Institute for Strategic Studies (IISS) کے ورلڈ ڈیٹا کے مطابق کچھ مسلم ممالک کا دفاعی بجٹ اور اُن کا GROSS DOMESTIC PRODUCT (GDP) مندرجہ ذیل ٹیبل میں دیا گیا ہے۔(3)

دفاعی بجٹ DEFENCE BUDGET. 2016

سعودی عرب	75 بلین امریکی ڈالر
ترکی	15 بلین امریکی ڈالر
متحدہ عرب امارات	22.8 بلین امریکی ڈالر
قطر	11.5 بلین امریکی ڈالر
ایران	5 بلین امریکی ڈالر
پاکستان	11.8 بلین امریکی ڈالر
افغانستان	278 ملین امریکی ڈالر

Gross Domestic Product.(GDP) 2016

سعودی عرب	646 بلین امریکی ڈالر
ترکی	857.7 بلین امریکی ڈالر
ایران	412.2 بلین امریکی ڈالر
متحدہ عرب امارات	348 بلین امریکی ڈالر
قطر	152 بلین امریکی ڈالر
پاکستان	283.7 ملین امریکی ڈالر

یاد رہے کہ ایران مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب کے بعد دوسری بڑی اکانومی ہے۔

اور

GDP PER CAPITA .2016

ایران	19,050 امریکی ڈالر
سعودی عرب	20,000 امریکی ڈالر
ترکی	14,071 امریکی ڈالر
متحدہ عرب امارات	37,622 امریکی ڈالر
قطر	59,322 امریکی ڈالر
پاکستان	1,468 امریکی ڈالر

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے ملک بھی آج اپنے GDP کا سب سے زیادہ حصہ دفاع پر خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔ جو کہ اس وقت بالترتیب 13.7 اور 5.7 فیصد ہے۔

آج پاکستان اور بھارت جیسے ممالک کی صورت حال یہ ہے کہ جہاں لوگوں کی بڑی اکثریت خطِ غربت سے نیچے

زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، وہاں بھی پاکستان کا ملٹری ڈیفنس بجٹ 9.9 بلین امریکی ڈالر ہے۔(2016-17) جبکہ بھارت کا 55.9 بلین امریکی ڈالر ہے۔[4] ہاں البتہ پاکستان میں ایک انتہائی اہم مثبت پیش رفت ہوئی ہے کہ ملک میں جمہوری حکومت ہے اور سابقہ حکومت (PPP) نے موجودہ حکومت (PML-N) کو پرامن طریقے سے انتقالِ اقتدار کیا لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہر منتخب وزیراعظم کو مختلف الزامات لگا کر نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ جس سے بیرونی دنیا میں پاکستان کو جگ ہسائی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ نیب کے پہلے کیسوں کا کیا بنا؟ زرداری صاحب کے کیسوں کا کیا بنا؟ بینظیر اور نواز شریف کے کیسوں کا کیا بنا؟ جنرل مشرف صاحب نے NRO کے نتیجے میں تمام حب الوطنی کا جنازہ نکال دیا۔ اور پھر یہ کہ جنرل صاحب کے خلاف نواب اکبر بگٹی، محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل کیس اور غداری کے مقدمات کا کیا بنا؟ اگر کسی نے جرم کیا ہے تو قانون کی حکمرانی کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کو سزا ملے، میں سمجھتا ہوں کرپشن کے ناسور کو ختم کرنے کے لئے قانون کی حکمرانی (Rule of Law) قائم کریں اور اداروں کو مضبوط کریں۔

دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال، یورپ اور ترکی میں دہشت گردی کی نئی لہر، یورپ اور ترکی کی طرف مہاجرین کا مسئلہ، افغانستان، عراق لیبیا اور شام میں آئے روز جنگ وجدل نے لوگوں سے سکون چھین لیا ہے۔ امریکہ جیسا ملک جس کے پاس بے پناہ وسائل ہیں اور جس کے پاس دنیا کے جدید ترین ہتھیار ہیں، وہ بھی ایک اَن دیکھے (Unseen) دشمن سے خوفزدہ ہے اور اس کے شہری بھی رات کو چین سے نہیں سوتے۔ شاید اسی وجہ سے اس کا دفاعی بجٹ ساری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

اس صورت حال میں آج دنیا کو روٹی، کپڑے اور مکان سے بھی زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ امن کا حصول اور فساد سے نجات ہے۔ دیکھے اور اَن دیکھے ہر دو طرح کے دشمنوں سے تحفظ کا احساس مطلوب ہے۔

سوشلزم۔ کمیونزم۔ کیپٹلزم۔ کیا تمام نظام ناکام ہو چکے ہیں؟

دنیا میں جو نظریہ، فلسفہ یا نظام امن اور تحفظ کی ضمانت دے، وہی اب انسانوں کے لیے سب سے بڑا نجات دہندہ قرار پائے گا۔

دنیا میں پچھلی صدی سے رائج مختلف نظریات، فلسفوں اور نظاموں کا اگر سرسری سا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کارل مارکس (Karl Marx-1818-1883) اور ولادی میر لینن (Vladimir Lenin 1870-1924) کے نظریات کا پرچار کرنے والے لوگ دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس کی بنیادی وجہ سابقہ سویت یونین کی ذِلت آمیز شکست کے ہاتھوں اشتراکیت اور کافی حد تک کمیونزم کا جنازہ نکل گیا۔ اور روسی عوام سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہو گئے اور بہت سی روسی ریاستیں سویت یونین سے الگ ہو کر آزاد ریاستیں بن گئیں۔ لہٰذا اشتراکیت کا کوئی والی وارث نہ رہا۔ ہاں البتہ چین اب تک ایک ایسا کمیونسٹ ملک ہے جو کہ ایک خاموش معاشی انقلاب برپا کرتے ہوئے سپر پاور کے طور پر اُبھر رہا ہے۔ لیکن چین بھی سرمایہ دارانہ نظام Capitalism کے عالمگیریت Globalisation نظام کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ اور اُس کمیونزم کا اطلاق نہیں کر رہا جس سے اُس نظریئے کا تاثر دیا جا سکے۔ لہٰذا صرف ایک نظام باقی ہے اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام جو کہ کئی عالمی معاشی بحرانوں سے گزرا ہے لیکن اتنے ہچکولے کھانے کے بعد بھی ابھی تک دنیا کو اِس نظام نے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے کہ پوری دنیا میں امیر مزید امیر ہو رہا ہے اور غریب مزید غریب ہو رہا ہے۔ اِس کا اندازہ ہمیں برطانیہ

اور امریکہ کی سڑکوں پر بھیک مانگنے اور بے گھر لوگوں کو فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے دیکھ کر ہوسکتا ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف امریکہ میں بے گھر افراد کی تعداد 2022ء میں 582462 تھی۔[5] BBC کے مطابق صرف انگلینڈ کے اندر 271000 افراد بے گھر ہیں۔[6] اور خطِ غربت سے نیچے کی زندگی گزار رہے ہیں۔یاد رہے کہ اگر پورے برطانیہ یعنی سکاٹ لینڈ، ویلز اور ناردرن آئرلینڈ کو شامل کیا جائے تو یہ تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی۔

سوشلزم ہو یا کمیونزم یا کیپٹلزم ہو، انسانی جان کی قدر و قیمت تو بالکل نظر نہیں آتی اگر مختصر سا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم (18-1914) میں تقریباً 20 ملین لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[7] دوسری جنگ عظیم (45-1939) میں 70 سے 85 ملین کے قریب لوگ لقمہ اجل بنے۔[8] پہلا امریکی ایٹم بم بھی اسی جنگ میں جاپان کے خلاف استعمال ہوا جس سے ہیروشیما کے ہزاروں باسی لقمہ اجل بنے جس کے اثراتِ بد ابتک اس کرۂ ارض پر موجود ہیں۔پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کئی یورپی ممالک بشمول برطانیہ امریکہ کے اتحادی تھے۔یورپ اور امریکہ کا موجودہ اتحاد اب مسلمان ممالک میں اپنے تباہ کن اسلحہ کا بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کی تباہی و بربادی دنیا کے سامنے ہے۔

روسی سول جنگ (22-1917) میں تقریباً 10 ملین لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[9] جوزف سٹالن (Joseph Stalin) کے دورِ حکومت میں (53-1924) میں تقریباً 20 ملین لوگ مارے گئے۔[10] سابقہ سویت یونین کے ڈکٹیٹر سربراہ سٹالن عیسائی تھے اور ان کی تربیت ایک انتہائی مذہبی گھرانے میں ہوئی ان کے والد پادری تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عیسائیوں کی ایک بہت بڑی شخصیت ''سینٹ جوزف'' کے نام پر رکھا اور وہ ان کو پادری بنانا چاہتے تھے۔لیکن وہ مارکسزم اور لینن ازم سے متاثر ہوئے اور لینن کے بعد حکومت میں آئے۔بینٹیو مسولینی (Bentio Mussolini) کے دور میں تقریباً 300,000 لوگ اِس دنیا سے فارغ کر دیئے گئے۔[11] یہ صاحب بھی عیسائی کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔اٹلی کی نیشنل فاسٹ پارٹی کے سربراہ تھے۔اور 1943-1922 تک وزیرِ اعظم رہے۔ماؤزے تنگ کے دورِ حکومت (Mao Zedong- 1893-1976) جو کہ چائنا کے سربراہ (1976-1949) رہے صرف چار سال میں تقریباً 45 ملین لوگ مار دیئے گئے۔یہ صاحب جرمنی سے امپورٹ کی گئی مارکسزم سے متاثر تھے۔اور انتہائی سخت گیر کمیونسٹ تھے۔[12] ان اعداد و شمار کا مقصد یہ نہیں کہ یہ لوگ مذہب یا ازم سے متاثر ہو کر لوگوں کا قتلِ عام کر رہے تھے بلکہ یہ ایک انسان تھے اور ان کی ذہنی سوچ نے ان سے ان جرائم کا ارتکاب کروایا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور مالی بحران 2008ء:

سرمایہ دارانہ نظام کے مرکز امریکہ نے 2008ء کے اندر ایک ایسا مالی بحران دیکھا جو کہ 1929ء کے بعد کسی کو دیکھنے کو نہیں ملا۔برطانیہ بھی اِس مالی بحران سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔جس کی وجہ سے اِن ممالک کو اپنے بینکنگ سسٹم کو بچانے کے لئے اپنے کھربوں ڈالرز کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے کاروبار بند ہوگئے۔لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے روزگار ہوگئے۔لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے روزگاری کی وجہ سے، اپنے مکان کی قسطیں نہ دے سکنے کی وجہ سے بے گھر ہوگئے۔اِس بحران کے منطقی اثرات کا آپ اندازہ لگائیں کہ میرل لچ (Merrill Lynch)فینی مے (Fannie Mae)، HBOS، رائل بنک آف سکاٹ لینڈ، بریڈفورڈ اینڈ بنگلے بلڈنگ سوسائٹی

اور نارڈرن راک جیسے بڑے ادارے بھی دیوالیہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جبکہ امریکہ میں کانگریس نے اپنے اداروں کو بحران سے نکالنے کے لئے 700 بلین امریکی ڈالر کا بل پاس کیا جو کہ بعد میں جارج بش نے سائن کیا۔ جارج بش کو 150 بلین امریکی ڈالر (یعنی 1000 امریکی ڈالر ہر امریکی پر بوجھ پڑا) فنانشل سیکٹر میں مدد کے طور پر ڈالنا پڑا تا کہ مارکیٹ میں کچھ استحکام آ سکے۔ امریکی فیڈرل ریزرو کو وال سٹریٹ میں اچانک بحران آنے کی وجہ سے مزید 236 ملین امریکی ڈالرز کی مدد کرنی پڑی۔[13] امریکہ کی کمپنی لیمن برادرز (Lehman Brothers) کے 25 ہزار ملازمین تھے۔[14] اس کمپنی کے اوپر 619 بلین ڈالرز کا قرض تھا۔[15] اور یہ امریکہ کا چوتھا بڑا انوسٹمنٹ بنک تھا۔ اس طرح امریکہ کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی امریکن انٹرنیشنل گروپ (American International Group-AIG) جس کے تقریباً ایک ٹریلین امریکی ڈالر کے اثاثے تھے۔ اُسکو بھی تقریباً 100 بلین امریکی ڈالر کا نقصان ہو گیا اور 85 بلین امریکی ڈالر کا پیکیج حکومت کی طرف سے دیا گیا تب وہ ڈوبتے ڈوبتے بچی۔[16] امریکہ میں محلے کے محلے بے روزگاری کی وجہ سے بے آباد ہو گئے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مالکان اپنے قرض کی اقساط نہ دینے کی وجہ سے اپنے مکانات کو بینکوں کے ہاتھوں کُرک کروا بیٹھے۔ گویا کہ کیپیٹلزم (سرمایہ دارانہ نظام) کے مراکز امریکہ، برطانیہ اور جرمنی نے اپنی اپنی قوموں کو قرض کے نیچے دبایا ہوا ہے۔ اسی طرح آئرلینڈ، سپین، پرتگال، یونان وغیرہ یورپی ممالک دیوالیہ ہونے والے تھے۔ لہٰذا G-20 ممالک نے مل کر 2.2 بلین ڈالر کا اِن ممالک کے لئے ایک پیکیج بنایا اور یورپی اکانومی کو سہارا دیا۔[17]

2016ء میں امریکی حکومت 19.6 ٹریلین امریکی ڈالر کی مقروض تھی۔ جبکہ 2017ء میں یہ قرض بڑھ کر 20.4 ٹریلین امریکی ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ یعنی 2023ء میں امریکی قومی قرض 33 ٹریلین ڈالر سے زیادہ ہے۔[18]

اسی طرح برطانیہ بھی 2017ء میں 1773 بلین برطانوی پاؤنڈ کا مقروض ہے جو کہ 2023ء میں 2537 بلین برطانوی پاؤنڈ کے قرض کے نیچے ہیں جو اُن کی GDP کا 100.50 فیصد ہے۔[19]

یعنی بقول غالب:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

امریکہ اور برطانیہ میں غربت کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دونوں ممالک میں ہزاروں Food Banks (خوراک کے سٹور) کھولے گئے ہیں جن کا ذمہ مختلف خیراتی اداروں نے اُٹھایا ہوا ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگ وہاں کھانے پینے اور روزمرہ کے استعمال کی اشیا جمع کروا دیتے ہیں تا کہ غرباء آ کر وہاں سے اپنا بچوں کا پیٹ پال سکیں اور ایسے لوگوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ایک تجزیے کے مطابق حکومتی بجٹ میں کٹوتیاں کی جا رہی ہیں کہ جنگوں کے اخراجات نے حکومتوں کو اربوں ڈالرز کا مقروض کر دیا ہے۔ لوکل کونسلوں کے بجٹ میں بھی کٹوتی ہو رہی ہے۔ روزمرہ کی اشیائے خورونوش کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ فیکٹریاں بند ہو رہی ہیں اور کام نہ ہونے کی وجہ سے لوگ مجبوری میں خیراتی اداروں کی طرف سے قائم کیے گئے تقریباً 2000، Food Bank کا رُخ کرتے ہیں۔[20] برطانوی اخبار The Guardian اور ٹرسل ٹرسٹ Trssell Trust UK کے مطابق ان کے فوڈ بنکوں میں 400 سے زائد 16-2015ء میں 554000 غریب لوگ اور تقریباً 12 لاکھ کے قریب مختلف پیکٹ غربا میں تقسیم کیے گئے۔ (21)

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر سرمایہ دارانہ نظام نہیں تو کیا اور کوئی متبادل نظام ہے؟ کیا اسلام کا معاشی نظام یہ جگہ لے سکتا ہے؟ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ عصرِ حاضر میں کیا کسی ملک میں اسلامی معاشی نظام رائج بھی ہے کہ نہیں؟

کئی ممالک کی اندرونی حالت دیکھیں تو اُن کے معاشرتی امن کو مختلف انواع کے خطرات درپیش ہیں۔ کہیں مذہب کے نام پر لوگ ایک دوسرے سے متصادم ہیں، کہیں نسلی، لسانی اور علاقائی جھگڑے ہیں، کہیں سیاسی اختلافات شدت اختیار کر کے دشمنی میں بدل گئے ہیں، کہیں حقوق کے نام پر منافرت پھیل رہی ہے، کہیں نام نہاد معاشرتی روایات کے نام پر خواتین اور کمزور طبقوں کا قتل اور استحصال جاری ہے اور کہیں سماجی برائیاں معاشرے کے امن کو برباد کر رہی ہیں۔ اس صورت حال میں ہمیں ہر شخص سہما سہما دکھائی دیتا ہے کہ چہار سو تشدد پسند رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

امریکی جنگ: دہشت گردی کے خلاف یا اسلام کے خلاف؟

امریکی صدر جارج بش کے مندرجہ ذیل بیانات سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس حملے کو ''صلیبی جنگ'' کا نام دے کر اعلان کیا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ آ جائیں یا ہمارے مخالفین میں، یعنی درمیانی کوئی راستہ نہ دیا گیا:

" This Crusade, this war on terror, is going to take a while"

ترجمہ:..... یہ صلیبی جنگ، یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ، کافی عرصہ تک لڑی جائے گی۔ (22)

" You are either with us or against us"

ترجمہ:..... یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف۔ (23)

اگر ہم یورپ کی موجودہ صورتحال پر غور کریں تو برطانیہ جیسے ایک جمہوری ملک میں بھی دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیموں کی کارروائیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اُس کا یورپ سے اخراج (BREXIT) بھی غیر ملکیوں اور مہاجرین سے نفرت کے پرچار پر ممکن ہوا۔ اور ایسے رویئے صرف برطانیہ میں ہی نہیں بلکہ پورے یورپ کو انتہاء پسند دائیں بازو کی تنظیموں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

امریکی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلی اور کونسل آف امریکن اسلامک ریلیشنز کی ایک تحقیق کے مطابق 2008 اور 2013 کے درمیان 74 اسلام مخالف امریکی گروپوں کو تقریباً 206 ملین امریکی ڈالر اس لیے دیئے گئے کہ وہ مختلف پروگراموں کے ذریعہ اسلاموفوبیا کو ہوا دے سکیں۔ (24) اور اس نفرت آمیز اور مسلمانوں کے خلاف امتیازی مہم کی اگلی قسط نو منتخب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے طریقہ کار سے جلتی پر تیل چھڑکنے کا آغاز ہوا ہے، اور اس سے کئی دیگر یورپین ممالک مثلاً ہالینڈ، جرمنی اور فرانس وغیرہ میں نفرت پھیلانے والی انتہا پسند دائیں بازو کی تنظیمیں وزارت عظمیٰ اور صدارت کے خواب دیکھ رہی ہیں۔

جرمنی میں دائیں بازو کی تنظیم Alternative for Germany۔ AFD جو کہ اسلام، مسلمانوں اور سیاسی پناہ گزینوں کے خلاف ہے اب الیکشن میں تیسرے نمبر پر آ کر چانسلر اینجلا مرکل (Angela Merkel) AFD کے ساتھ مخلوط Coalition حکومت بنا رہی ہیں۔ AFD نے 13 قومی اور 16 علاقائی پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کی ہیں۔ گویا کہ پورے یورپ میں دائیں بازو کی قوم پرست تنظیموں نے اپنی پوزیشن کافی مستحکم کر لی ہے۔ مسز مرکل کو اِس وقت دنیا کی طاقتور ترین خاتون کہا جاتا ہے۔ یہ محترمہ 2005ء سے جرمنی کی سربراہ ہیں اور انتہائی حکمت عملی اور بردباری سے معاملاتِ مملکت چلا رہی ہیں۔

فرانس میں بھی دائیں بازو کی تنظیم نے الیکشن میں ریکارڈ ووٹ لے کر تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔

پاکستان کے ہمسایہ ملک بھارت میں انتہا پسندی اس قدر زور پکڑ گئی ہے کہ BJP (بھارتیہ جنتا پارٹی) کے گجرات کے 2002ء میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی آج بھارت کے وزیر اعظم ہیں جبکہ ان کی مشہوری گجرات میں مسلم کش فسادات کی وجہ سے ہوئی اور ان کے انتہا پسند نظریات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

9/11 کا حادثہ اور امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے امریکی دھمکی کے بعد پاکستان نے جب فرنٹ لائن سٹیٹ بننے کا وعدہ کر دیا تو اسکے نتائج کا شاید پاکستان اور امریکہ کے ارباب اختیار کو اندازہ نہ تھا۔صورت حال یہ ہے کہ پاکستان پچھلے 16 سال میں تقریباً 123 بلین امریکی ڈالر کے برابر نقصان کر چکا ہے[25] اس پرائی جنگ کے پاکستانی معیشت، برآمدات، بیرونی انوسٹمنٹ، اور معاشرے پر انتہائی گہرے گھاؤ لگائے ہیں پاکستان میں کبھی خودکش دھماکے نہیں ہوتے تھے دہشت گردی سے قوم واقف نہ تھی اب تقریباً 60 ہزار کے قریب سیکورٹی کے اداروں سے منسلک لوگ اور عوام نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

میانمار میں مسلمانوں کی نسل کشی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔امریکی سربراہی میں مغربی اقوام کی جنگی پالیسیوں اور اسلام کو ایک ''دہشت گرد'' مذہب کے طور پر پیش کرنے کے بعد پوری دنیا میں دوسرے ممالک کو گویا کہ لائسنس مل گیا ہے کہ مسلمانوں کے اکثریت والے علاقوں (جیسا کہ میانمار (برما) میں روہینگی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے) میں ''دہشت گردی کے خاتمے'' کے نام پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھا دیئے جائیں تاکہ وہ لوگ نقل مکانی کر جائیں اور وہ مسلم اکثریت والا علاقہ مسلم اقلیت والا علاقہ بن جائے اور آزادی یا حق خود ارادی کی تحریکوں پر بھی دہشت گردی کا لیبل لگا کر جو ظلم چاہے روا رکھیں کوئی ادارہ یا حکومت کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔روہنگیا مسلمانوں کے حقوق کے حق میں اور برمی حکومت کے ظلم واستبداد کے خلاف صرف مالدیپ کی حکومت نے اپنا سفیر برما سے واپس بلا لیا ہے۔باقی کسی ملک کی جرأت نہیں کہ کوئی سفارتی تعلقات کو منقطع کرتا۔41 ممالک کے سعودی عرب کی سربراہی میں فوجی اتحاد کو کیا صرف قہوہ اور کھجور سے سیوہ کرنے کے لیے رکھا گیا ہے۔؟مسلمانوں کا یہ اتحاد نیٹو (Nato) کی طرز کا ہونا چاہیے تھا کہ کم از کم اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ان کو چاہیے کہ روہنگیا میں ایک امن مشن (Peace Mission) کے طور پر ہی وہاں جائیں۔کم از کم مسلمانوں کی نسل کشی کو تو روکیں۔

التحالف الاسلامی العسکری لمحاربۃ الارھاب:

(Islamic Military Counter Terrorism Coalition)

یاد رہے کہ 2015ء میں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان کے صاحبزادے اور سعودی ولی عہد اور نائب وزیر اعظم شہزادہ محمد بن سلمان بن عبدالعزیز السعود کی سربراہی میں 34 (جو کہ اب 41 ہو گئے ہیں) ممالک کا ایک فوجی اتحاد ''التحالف الاسلامی العسکری لمحاربۃ الارھاب'' بنایا گیا۔جس کو مسلم نیٹو کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔اس کا ہیڈ کوارٹر ریاض میں ہے اور 2016ء میں پاکستانی فوج کے ریٹائرڈ چیف آف آرمی سٹاف کو اس کا پہلا سربراہ مقرر کیا گیا۔[26] (کچھ لوگوں کا الزام یہ بھی ہے کہ ان کو یہ عہدہ بھی ایک NRO کے تحت دیا گیا تھا کہ نواز حکومت کو ختم نہ کیا جائے)

41 مسلم ممالک کے فوجی اتحاد اور پاکستانی فوج کے سابقہ سربراہ جنرل (ریٹائرڈ) راحیل شریف کو اس فوج کا

سربراہ بنانا اور اس اتحاد میں ایران سمیت شیعہ اکثریت کے ممالک کا شامل نہ ہونا، ایک نئے بلاک اور خطرناک جنگ کی غمازی کرتا ہے۔ اس صورت حال نے پاکستان کی شیعہ کمیونٹی میں بھی ایک عجیب ہیجانی کیفیت پیدا کردی ہے جس کے پاکستان پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ میری نظر میں اس اتحاد کو قائم رکھنا سعودی عرب کے لئے انتہائی مشکل ہوگا کیونکہ سعودی عرب ایک مشکلات کے گرداب میں پھنس چکا ہوگا۔

انتہا پسندانہ نظریے کے مقابلے کیلئے گلوبل سنٹر کا قیام:

(Global Centre for Combating Extremist Ideology= GCCEI)

ہماری نظر میں موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال میں عالم اسلام سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے دفاعی اخراجات میں اضافہ اور قطر کے ساتھ نیا تنازعہ اور اس پر طرہ یہ کہ سعودی عرب کا امریکہ کے ساتھ 350 بلین ڈالر کے جنگی ساز وسامان خریدنے کے معاہدات اور سمجھوتے اِس بات کا ثبوت ہیں کہ سعودی عرب خود کو کس قدر غیر محفوظ تصور کر رہا ہے۔(27) اب سوال یہ ہے کہ سعودی عرب کو کس سے خطرہ لاحق ہے جس سے دفاع کے لیے اتنے زیادہ دفاعی بجٹ کی ضرورت پیش آئی ہے، یا یہ اسلحہ اقدامی جنگ کے لیے استعمال ہونا ہے، تو اس کا ہدف کون ہوگا؟ صدر ٹرمپ کے حالیہ دورے کے دوران امریکہ اور سعودیہ کے اشتراک سے ایک سینٹر قائم کیا گیا۔ جس کا نام گلوبل سنٹر برائے مقابلہ انتہا پسندانہ نظریہ (Global Centre for Combating Extremist Ideology= GCCEI) جس کا کام وہابی/سلفی انتہا پسندانہ نظریات کو نئے سرے سے متعین کرنا ہے کیونکہ یہ دہشت گردی کو ہوا دیتے ہیں۔ اس سنٹر کے تحت سعودیہ کی تیار کردہ انتہا پسندی سے متعلق کروڑوں کتابیں واپس لے لی جائیں گی۔ یاد رہے کہ ایسی انتہا پسندانہ کتب کو افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کیلئے امریکہ کے تعاون سے تیار کیا گیا تھا جو کہ اب تک چھاپی جارہی ہیں جس کا پورے یورپ میں احتساب کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اس بات کی شدت کا اندازہ اِس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو صدر ٹرمپ کی کابینہ کے نئے سیکرٹری آف سٹیٹ سنیٹر ریکس ٹلرسن (Senator Rex Tillerson) نے سینٹ کی کمیٹی میں سنیٹر سکاٹ پیری (Scott Perry Senator) کے سوال کے جواب میں دیا۔(28)

Question by Senator Scot Perry:

Finally, in the last question, Mr. Chairman in your indulgence. The deal with Saudi Arabia, I could not get an answer on specifically how we were monitoring their continued support of the exportation of Wahabism, Salafism and the terror that goes along with that fundamentalist view of Islam around the globe. Do you know of any metrics that the department is following to support their claim that they are working on that? How are we gauging that? How are we going to determine whether they are following along with that portion of the agreement?

Answer by Secretary of State Senator Rex Tillerson:

One of the outcomes of President's summit in Riyadh was the creation of the centre to counter Extreme Muslim messaging with Saudi Arabia. This centre now exists. It was inaugurated while we were there. The centre has a number of elements to attack extremism around the world.

One of the elements that we are visiting with them about, and they have already taken steps (The Saudis) is to publish new textbooks that go into the schools that are in the mosques around the world. These textbooks are to replace textbooks that are out there today that do advocate extreme Wahabism viewpoints around the justification for violence. We have asked that they not just publish the new text books; we have asked that they retrieve the existing textbooks so we get those back. That is just one example.

This centre is going to have a very broad range from social media to broadcast to how young imams are trained in the theological centres, and we are working with them today to establish the new center, what are the measures we will hold ourselves accountable to. That is the one charge the state department is working with Saudi and others as we bring this up to an operating level."

This centre is going to have a very broad range from social media to broadcast to how young imams are trained in the theological centres."

we are working with them today to establish the new center, what are the measures we will hold ourselves accountable to. That is the one charge the state department is working with Saudi and others as we bring this up to an operating level."

ترجمہ:.....''سینٹر سکاٹ پیری کا سوال:

مسٹر چیئرمین! آپ کی خوشی سے آخری سوال۔سعودی عرب کے ساتھ جو ڈیل ہوئی ہے مجھے خصوصی طور پر اس کا جواب نہیں ملا کہ ان کی وہابیت، سلفیت اور اِس بنیاد پرستی کے ساتھ پوری دنیا میں جو دہشت پھیلتی ہے کہ اُس کو ہم کس طرح مانیٹر کرتے تھے۔کیا آپ کے پاس کوئی ایسا جانچنے کا معیار ہے کہ ہمارا ڈیپارٹمنٹ اس کو چیک کر رہا ہو جس کام کا وہ (سعودی) دعویٰ کر رہے ہیں۔اُس کو کیسے ماپا جا رہا ہے کہ ہم کس طرح اس کی یقین دہانی کریں گے کہ وہ (سعودی) اپنے معاہدے کے اس حصے کو صحیح طور پر نبھائیں گے۔؟

سنیٹر ریکس ٹلرسن کا جواب:

صدر (ٹرمپ) کی ریاض میں کانفرنس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ سعودی عرب کے ساتھ مسلمانوں کے انتہا پسندانہ پیغام کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مرکز کا قیام، یہ مرکز اب موجود ہے۔جب ہم وہاں تھے تو اس کا افتتاح کیا گیا۔اس مرکز میں دنیا کے اندر انتہا پسندی پر حملہ کرنے کے لئے بہت ساری چیزیں موجود ہیں۔ایک چیز جو کہ ہم سعودیوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں اور اُس پر کچھ اقدام اُٹھا بھی لئے ہیں کہ نئی ٹیکسٹ بکس چھاپی جائیں جو پوری دنیا کے سکولوں اور مساجد میں جاتی ہیں۔یہ کتابیں پرانی کتابوں کی جگہ لیں گی جو کہ اس وقت باہر موجود ہیں اور تشدد کی وہابیت کے انتہا پسندانہ نقطہ نظر کے تحت وکالت کرتی ہیں۔مثال کے طور پر ہم نے (سعودیوں کو کہہ دیا ہے) کہ نئی کتابیں چھاپیں اور پرانی کتابیں مارکیٹ سے اُٹھالیں۔تاکہ ہم اُنکو واپس لے سکیں۔

سنٹر بہت سے کام کرے گا، سوشل میڈیا سے براڈ کاسٹ اور نئے نوجوان اماموں کی تربیت تک رینج رکھے گا۔ہم اُن (سعودیوں) کے ساتھ نیا سنٹر قائم کرنے کے لئے کر رہے ہیں کہ یہ طے کیا جا سکے ہم کس چیز کے جوابدہ ہوں گے۔''

یہ آخری فقرہ بہت سارے سوالات اٹھا رہا ہے کہ امریکی انتظامیہ سینٹ کے سامنے کس چیز کی جوابدہ ہوگی۔؟ جس

طرح پاکستان میں ٹیکسٹ بکس کو ظاہری طور پر اور چوری چھپے تبدیل کیا جا رہا ہے، جس طرح مدارس کے نظام پر قدغن لگائی جا رہی ہے۔ اس طرح اب سعودیہ میں یہ کام شروع ہو گیا ہے۔

انتہا پسندی کی آڑ میں سعودی کلچر پر پہلی قدغن یہ لگائی گئی ہے کہ خواتین اب ڈرائیو کر سکیں گی۔ (اگرچہ میں اس عمل کے قطعاً خلاف نہیں ہوں) لیکن ٹرمپ کے دورے کے فوراً بعد اس کا اعلان معنی خیز ہے۔

مومنین تو سب بھائی ہیں:

آٹھ سال ایران عراق جنگ اور پھر عراق، کویت جنگ نے مسلمانوں کی کمر توڑ کے رکھ دی کسی اسلامی تنظیم یا اسلامی ملک کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ سورۂ حجرات میں اللہ کے فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے اُس کی صلح کرواتے۔ اُلٹا یہ پارٹی بن کر ان ممالک کی تباہی کا سامان پیدا کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔

ترجمہ:.....مومنین تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔ (29)

"The believers are but a single brotherhood. So make peace and reconciliation between your two contending brothers. Fear Allah that you may receive mercy." (49:10)

پھر اس کے بعد خلیجی جنگ (عراق پر امریکی قبضہ) کے بعد افغانستان اور پاکستان اس تشدد پسندی کے رجحان کے خاص طور پر نشانہ بنے ہیں۔ اگر پاکستان کو دیکھا جائے تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس معاشرے میں امن کی سب سے بڑی علامت مسجد تک محفوظ نہیں رہی۔ حالانکہ اسے سلامتی کا گھر کہا گیا ہے۔ دہشت گردی کے عنصر نے سکول و کالج و یونیورسٹی، مزار و مدرسہ و امام بارگاہ گلی اور بازار کے علاوہ فوج و پولیس کے حساس اداروں کے مراکز تک سب کو غیر محفوظ بنا دیا گیا ہے اور لوگ گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خوف زدہ رہتے ہیں۔ گویا ہر طرف خوف کا راج ہے۔ کہیں ذاتی دشمن کا خوف ہے، کہیں دہشت گردی کا خوف ہے اور کہیں سرحد پار سے حملے کا خوف ہے۔ وطن عزیز میں رہنے والی اقلیتیں بھی اسی بے چینی اور ہیجان سے دوچار ہیں۔ مسلمان پاکستانیوں کی طرح ان کے عبادت خانے، ہسپتال، سکول، املاک اور زندگیاں بڑھتے ہوئے حملوں کی زد میں ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلم اقوام کے درمیان دوریاں بڑھ رہی ہیں۔

اس انتہائی خطرناک صورت حال کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ وطن عزیز میں ان سلگتے مسائل کی وجوہات کا ادراک خوف ناک حد تک نہ صرف کم ہے بلکہ گمراہ کن ہے۔ اسی لیے پاکستان میں نکلنے والے کسی بھی جلوس اور ان میں سیاسی زعماء کی تقریروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں جذباتیت کا ایک گہرا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جس سے نفرتوں کو مزید ہوا ملنے کا اندیشہ ہے۔ کہیں لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کی بات ہوتی ہے تو کہیں قوم کو پچھلے ساٹھ برسوں سے صرف اور صرف یہود و ہنود اور نصاریٰ کی سازشوں کے افسانے سنائے جا رہے ہیں۔ اب تو بات اس حد تک پہنچی ہے کہ اگر کسی ملک میں کوئی مسئلہ بنتا ہے تو اس کے ڈانڈے آئی ایم ایف، امریکہ اور مغربی ممالک سے ملانے کے جتن ہوتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، ہم مسلمان ہی کیوں ہمیشہ غیروں کی سازشوں کا شکار ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے حصے کی کوتاہیوں، بے عملیوں اور بداعمالیوں کو دوسروں کے گلے میں ڈال رہے ہیں۔ اس سوچ کی طرف حیرت

انگیز طور پر کوئی غور ہی نہیں کرتا کہ اپنی ناکامیوں کے لیے دوسروں کو کلی طور مورد الزام ٹھہرا کر کیا ہم اپنے وجود کی نفی نہیں کر رہے ہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گزرنے والا دن ہماری حالت میں کوئی قابل ذکر بہتری لانے کے بجائے ہمیں مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل رہا ہے۔ کیونکہ ہم اپنی بے حمیتی اور بدعملی کو دوسروں کے کھاتے میں ڈال کر اپنی خود احتسابی اور قومی ذمہ داریوں سے نظر چرا رہے ہیں تو پھر ہمیں یہ جان لینا چاہیے:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

چنانچہ ہمارے خیال میں وقت کی اصل ضرورت یہ ہے کہ:

ان بنیادی مسائل کی نہ صرف نشان دہی کی جائے جس کی وجہ سے ہم ان حالات کا شکار ہیں بلکہ وجوہات کو بیان کیا جائے تاکہ مؤثر حل تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی جاسکے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔''(30)

اِس آیت مبارکہ میں تغیر حالات سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم خالق کی بیش بہا نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے نافرمانی پر اُتر آئے اور غیر اخلاقی اور بدعملی والی زندگی شروع کر دے تو اس تغیر یعنی برائی والی زندگی گزارنے کی ذمہ داری خود اُس قوم پر عائد ہوتی ہے لہٰذا اللہ اُس قوم پر سے برکتوں اور رحمتوں کا انعام اُٹھا لیتے ہیں۔ اُس قوم پر باری تعالیٰ کے انعامات کا اجراء تبھی شروع ہوگا جب وہ واپس اچھائی کی طرف لوٹے گی۔ اگرچہ اِس آیت کا مفہوم بعض اوقات درج ذیل شعر کی شکل میں دیا جاتا ہے لیکن آیت مبارکہ کا اصل مقصد خیر سے شر کے تغیر کے حوالے سے ہے۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لیکن بہر حال یہ بات اپنے طور پر بھی درست ہے کہ جب کوئی انسان یا قوم اپنے حالات کی درستگی کی طرف توجہ نہیں دے گی۔ اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرے گی تو اللہ کیونکر اُس کے لئے ہدایت و نصرت و مدد کے دروازے کھولیں گے۔

جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ:..... ''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا''.....

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھا دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے۔(31)

اقوامِ عالم کا تضاد:

ہمارے خیال میں واقعاتی طور پر امت مسلمہ کے اہم مسائل میں سے ''مسئلہ فلسطین و کشمیر، مسئلہ مسلمانانِ اراکان (برما) مسئلہ افغانستان، اور خلیج و مشرق وسطیٰ کی بڑھتی ہوئی غیر یقینی صورتحال ہیں۔ ان مسائل کا مستقل اور موزوں حل

نکالنے کے لیے ہمیں انتہا پسندی و دہشت گرد۔

مغربی سفارت کار یا وزراء کی حقیقت و اسباب، حقیقتِ جہاد، اور قیامِ امن کی ضرورت و اہمیت کا صحیح ادراک کرنا ہوگا پاکستان کا دورہ کریں تو انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کرتے ہیں جبکہ بھارت میں کشمیریوں، سکھوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں جیسی اقلیتوں پر ظلم و ستم کے معاملے میں اُن کی زبان گنگ ہوجاتی ہے۔

آج کا مسلمان اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ عالمی طاقتوں نے پچھلی چھ دہائیوں سے فلسطین اور کشمیر کا مسئلہ تو دن بدن پیچیدہ کر دیا ہے لیکن اقوامِ عالم نے مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کے معاملات کو چابکدستی سے حل کر کے دو علیحدہ ریاستیں بنادی ہیں، تو کیا یہ اقوامِ عالم کا مسلمانوں کے بارے میں واضح تضاد نہیں ہے؟؟ عراق اور لیبیا جیسی آزاد اور خود مختار ریاستوں کو جس طرح تباہ و برباد کر کے ان کے سربراہان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا گیا اور پھر اس کے بعد شام کے اندر افراتفری پھیلا کر اس کے سربراہ کو ہٹانے کی ناکام کوشش کی گئی، اور جبکہ اس کے برعکس شمالی کوریا کا سربراہ امریکہ اور یورپ کو آنکھیں دکھاتا ہے اپنی ایٹمی اور میزائل ٹیکنالوجی کو دن بدن بڑھا رہا ہے تو اس کے خلاف عالمی طاقتیں کوئی ایکشن نہیں لیتیں تو عام مسلمان پھر یہ پوچھنے پر مجبور ہے کہ اقوامِ عالم کا یہ تضاد کیوں ؟؟؟

سیاسی اور سوشل نیٹ ورکس:

90ء کی دہائی میں برطانیہ میں قیام کے دوران وہاں کی بڑی سیاسی جماعتوں، مختلف مذاہب کی تنظیموں سوشل نیٹ ورکس، تعلیمی اداروں، پاک فوج اور برطانوی فوج کے سربراہوں کے ساتھ براہ راست گفت و شنید رہی۔ بیشتر اوقات ملکی و غیر ملکی صورتِ حال زیر بحث آتی رہیں۔ بالخصوص پاکستان، افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کی صورت حال اور معاملات تو بڑی شدت سے زیر بحث رہے۔ امریکہ کی سرپرستی میں اسلامی ممالک میں مداخلت کی ناکام حکمت عملی اور اس کے تباہ کن نتائج اور اثرات بھی بحث کا موضوع رہے۔ اور اینٹی وار موومنٹ برطانیہ کے زیر اہتمام کئی ریلیوں میں بابائے جمہوریت ٹونی بین (Tony Ben) اور جارج گیلوے (George Galloway MP) یا ٹام واٹسن (Tom Watson MP) جرمی کوربن (Jeremy Corbyn MP)، ایڈ ملی بینڈ (Ed. Milliband MP)، راجر گاڈ سیف (Roger Godsiff MP)، جیرالڈ کاف مین (Gerald Kaufman MP)، ڈیوڈ اینڈرسن (David Ahderson MP)، موجودہ میئر لندن صادق خان، لارڈ نذیر احمد، لارڈ قربان حسین، یاسمین قریشی MP، خالد محمود MP، مشتاق لاشاری CBE، چودھری شوکت جیسے اراکین پارلیمنٹ اور کمیونٹی رہنماؤں کے ساتھ تقاریر کرنے کا موقع بھی ملا۔ ایسے دوستوں کی کاوشوں سے ڈیوڈ کیمرون کی حکومت اگست 2013 میں شام کے خلاف قرارداد پارلیمنٹ سے پاس نہ کرا سکی، لہٰذا امریکی سربراہی میں شام پر حملہ ممکن نہ ہوسکا۔ حالانکہ امریکہ اور برطانیہ، کچھ دوسرے یورپین اور عرب ممالک کے ساتھ مل کر شام پر حملے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ یہ قرارداد صرف ایک کاغذی کارروائی کے طور پر ڈالی گئی تھی۔ کیونکہ اوبامہ اور کیمرون کو یہ توقع نہیں تھی کہ شام کے خلاف قرارداد ناکام ہوجائے گی۔

اعلیٰ سطح پر میری ہونے والی مختلف میٹنگوں میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا کہ سیاسی اور معاشی طور پر ایک مضبوط پاکستان عالمی امن کی ضمانت ہے کیونکہ یہ خطہ اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے چین، روس اور امریکا کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ خود بھی ایٹمی طاقت ہے اور ایک ایٹمی قوت بھارت کا ہمسایہ ہے جس کے ساتھ اس کے تعلقات اول

روز سے ہی ٹھیک نہیں ۔ پاکستان کی نظریاتی اساس بھی وقتاً فوقتاً زیر بحث آتی رہتی ہے، اس لیے اسے بھی ہم نے اس کتاب کا حصہ بنایا ہے اور ایک مبسوط باب اس کی نذر کیا ہے۔ چنانچہ اگلے صفحات میں ہماری کوشش ہوگی کہ:

درج بالا موضوعات کو ان کے تاریخی تناظر میں پیش کیا جائے، اس حوالے سے موجودہ حالات و واقعات کا جائزہ لے کر اس کے حل کے لیے ممکنہ تجاویز پیش کی جائیں۔

جہاد اور دہشت گردی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ان پوشیدہ حقیقتوں کے فہم کو عام کیا جائے جس سے یہ یقین بڑھے کہ مذہب انسانوں میں ہمیشہ محبت اور رواداری کی علامت رہا ہے اور دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اصل مذہب کسی جنگ کا باعث بنا ہو۔ بالخصوص مذہب اسلام کا تو مادہ ہی امن وسلامتی ہے یہ بے امنی کا سبب کیسے بن سکتا ہے؟۔ یہ تاریخ میں بعض لوگوں کے ذاتی مقاصد تھے، جس کے لیے مذہب کو استعمال کیا گیا، ورنہ مذہب اصلاً قیامِ امن کا پیامبر ہے۔ جس طرح تورات کے ماننے والوں نے مختلف ادوار میں نصاریٰ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور نصاریٰ نے یہود کو تاخت وتاراج کیا تو یہ ان کے مذہب اور تورات وانجیل کی تعلیمات ہرگز نہ تھیں۔

مذہب سے بیزار مغربی اقوام:

بہت سارے لوگ یہ سوال بھی اُٹھاتے ہیں کہ کیا یہ نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف'' جنگ یہود ونصاریٰ کی اسلام مخالف جنگ ہے؟ یا یہ جنگ مغرب کے بے دین اور سیکولر ارباب اختیار واقتدار اور مسلمان ممالک کے درمیان ہے۔ یا یہ جنگ مغرب کے مسلمان ممالک کے وسائل اور ذخائر وغیرہ پر قبضہ کرنے کے لئے ہے۔؟

ایک بات تو میں انتہائی وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغربی اقوام کی اکثریت جو کہ عیسائی ہے مذہب سے بیزار نظر آتی ہے۔ جس میں چرچ کی غلط حکمت عملی یعنی سیاست اور مذہب کو ''ظاہری'' طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا ہے۔ لہٰذا مذہب سے بیزار لوگوں کے اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد عیسائیت کی بحیثیت ایک مذہب کے بالخصوص اور دوسرے مذاہب کی بالعموم ہمیشہ تضحیک کی گئی پھر برطانیہ میں اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی اخبار انڈیپنڈنٹ کے مطابق 2016ء کے سروے میں اٹھارہ سے چوبیس سالہ برطانوی نوجوانوں کی 71% تعداد اپنے آپ کا کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ (32) 2017ء میں برطانوی معاشرتی رویوں (British Social Attitudes) پر ایک سروے کے مطابق برطانوی عوام کا 53% طبقہ یہ کہتا ہے کہ اُن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ (33)

اِس کتاب میں جگہ جگہ کئی ممکنہ اقدامات کا ذکر کیا جائے گا جس سے امید کی کرن نظر آسکے اور جن سے مایوسیوں کے اندھیرے چھٹ سکیں۔ اور ان حقائق کا ادراک ہو سکے جس سے پاکستان میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم امن و سلامتی کی راہ ہموار ہو سکے۔

طٰہٰ بشیر ذوالقرنین قریشی ممبر برٹش ایمپائر
چیئرمین فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ، لندن
چیئرمین سٹاک ویل گرین کمیونٹی سروسز، لندن۔
سی ای او سکول آف اکنامکس اینڈ لاء یو کے

پہلا باب:

مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہولوکوسٹ

یہ لندن کی ایک معروف درسگاہ کا خوبصورت ہال تھا۔ حاضرین سے اگرچہ بھرا ہوا تھا لیکن بھیڑ کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ انتہائی منظم اور اپنے مہمان کا منتظر۔

فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ (FIRD) کے زیر اہتمام ''امن، اقوامِ متحدہ اور عالم اسلام'' کے موضوع پر ایک لیکچر کا انتظام کیا گیا تھا۔ سامعین میں طلبہ و طالبات کے علاوہ اساتذہ بھی تھے۔ دوران لیکچر سامعین کا انہماک میرا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ لیکچر کا اختتام ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اب سوال و جواب کا سیشن تھا۔ پہلا سوال پوچھنے ایک ایسا طالب علم کھڑا ہوا جس کا چہرہ کھلی کتاب تھا۔ بس پڑھنے والی نظر چاہیے تھی۔ دوران لیکچر بھی میری نظریں اس کا احاطہ کرتی رہیں۔

تعلیمی اداروں میں آپ کو ایسے متعدد چہرے ملیں گے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ ایسے نوجوانوں کے سوالات عام طور پر تشنۂ جواب رہتے ہیں۔ وہ اب بولا تو میں ہمہ تن گوش تھا:

''سر آپ کی باتیں دل کو لگتی ہیں، آپ کے دلائل وزنی اور متاثر کن ہیں لیکن ذرا اس الجھن کی سلجھن بھی عنایت کریں کہ آخر مسلمانوں ہی کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بے عزتی بھی ان کے مذہب کی ہو اور تعصب، انتہا پسندی اور دہشت گردی کی پھبتی بھی انہی کی مذہبی تعلیمات پر کسی جائے، نشانہ بھی انہی کی تہذیب اور علمی روایت کو بنایا جاتا ہے، اظہارِ رائے کی آزادی کی آڑ میں انہی کے پیغمبر کو ناپسندیدہ قرار دے کر توہین و تضحیک کا رویہ اپنایا جاتا ہے۔۔۔ وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر بولا: اور جب کوئی مسلمان ردعمل کا شکار ہو کر حد سے متجاوز ہوتا ہے، قانون کو ہاتھ میں لے لیتا ہے تو انہی کے پیغمبر کو'' دہشت گرد'' قرار دے دیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم نفرت کا الاؤ سینے میں جلائے گولیوں سے بے گناہوں کو بھون ڈالتا ہے تو اسے ''نفسیاتی مریض'' کہا جاتا ہے، سو طرح کے فلسفے گھڑ کر اسے ہمدردی کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔۔ سوال یہ ہے کہ اس کی دہشت گردی کو اس کے مذہب کا شاخسانہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ کیا اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؟ اور یہ کہ مغرب نے افغانستان، عراق، شام اور لیبیا میں یکطرفہ جنگی کارروائیاں کر کے جس بربریت سے مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہولوکاسٹ جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ تو نوجوانوں میں دہشت گردی کے لئے راہ ہموار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کیا اقوامِ متحدہ یا عالم اسلام کی عالمی تنظیمیں اس کے سدباب کے لئے کچھ کر رہی ہیں؟''

اس کا سوال اگرچہ طویل ہو گیا تھا لیکن سوال کے پہلے حصے میں چھپی کاٹ قابلِ توجہ تھی۔ میں نے اس کا جو جواب دیا تھا اس سے وہ مطمئن ہوا یا نہیں، لیکن جب وہ یہ سوال کر رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک اور منظر گھوم رہا تھا۔ یعنی ناروے کے ایک شہری کی دہشت گردی، برطانوی وزیر خارجہ رابن کک کا عراق کے متعلق غلط برطانوی پالیسی پر اصولی استعفیٰ اور امریکی جنرل ویزلی کلارک کا عراق اور لیبیا سمیت 7 اسلامی ممالک پر امریکی حملے کے فیصلے پر حیران کن بیان میرے سامنے تھے۔ لیکن مجھے جلتی پر تیل نہیں ڈالنا تھا۔ مزید دو نوجوانوں نے بھی اس سے ملتے جلتے سوالات کیے تھے۔

غیر مسلموں کی دہشت گردی۔ایک سوچا سمجھا منصوبہ:

یہ 22 جولائی 2011 کے حملے میں جاں بحق ہونے والوں کی اندوہناک تصویریں تھیں۔ساری دنیا کے میڈیا نے خبر دی تھی کہ 21 سالہ ناروے کے نوجوان انڈرس بحرنگ بریوک (Anders Behring Breivik) جو کہ ایک دائیں بازو کی انتہاء پسند تنظیم کے ساتھ منسلک تھا، اس نے لیبر پارٹی کے نوجوانوں کے جلسہ میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ 93 افراد کو قتل اور 213 کو زخمی کر دیا ہے۔(1) اس کا اندازہ اس باب سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنا 1500 صفحات پر مشتمل باقاعدہ ایک منشور بنا رکھا تھا۔جس کا نام 2083۔یورپ کی آزادی کا اعلان (2083-A European Declaration of Independence) Times میگزین نے اس کو Template of Terrorism کہا۔اس دہشت گرد کے خیال میں اسلام یورپ کو اپنی ''کالونی'' بنا رہا تھا۔لہٰذا وہ یورپ کو اسلام اور مسلمانوں سے پاک کرنا چاہتا تھا۔

اس حادثے کو جنگ عظیم دوم کے بعد ناروے میں سب سے زیادہ دہشت گردی کا خونی واقعہ کہا گیا۔اس دہشت گرد کا بھی ایک مذہب اور ایک نظریہ (Ideology) تھا۔اس کے 7000 فیس بک کے دوست تھے۔پھر تحقیق ہوئی، مقدمہ چلا اور آخر کار اس سفاک قاتل کو نفسیاتی مریض قرار دے دیا گیا۔اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی اور ساتھ یہ کہا گیا کہ وہ نارسسٹک (Narcissitic Personality Disorder) نامی بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔مسلمانوں سے علی الاعلان نفرت کا اظہار کرنے والے اور بے گناہ لوگوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے قتل کر کے خوشی منانے والے اس دہشت گرد کے ساتھ یہ معنیٰ خیز رویہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔

قارئین آج جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ایک 64 سالہ امریکی سٹیفن پیڈاک (Stephan Paddock) نے لاس ویگس (Las Vegas) کے علاقے مینڈالے بے (Mandalay Bay) میں تقریباً 22000 بے گناہ لوگوں کی ایک موسیقی کی محفل میں فائرنگ کر کے 59 لوگوں کو مار دیا اور تقریباً 500 کے قریب لوگ زخمی کر دیئے۔اس ریٹائرڈ کروڑ پتی اکاؤنٹنٹ کے قبضے سے 47 کے قریب مشین گنیں اور دیگر اسلحہ ملا۔ہزاروں کی تعداد میں گولیاں اور دیگر تباہ کن مواد ملا۔جبکہ اِس واردات کے بعد اس سفاک قاتل نے اُسی ہوٹل کے کمرے میں اپنے آپ کو مار لیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔(2)

اس کے لیے ایک دفعہ بھی ''دہشت گرد'' کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔جبکہ کوئی مسلمان اگر چاقو کے ساتھ پکڑا جائے تو اُس کے مسلمان نام کی وجہ سے میڈیا فوراً ''دہشت گرد'' کا لیبل لگا کر اُس کے علاقے کی مسجد اور امام کی تصویریں دکھانا شروع کر دیتا ہے چاہے وہ مسلمان کبھی مسجد گیا بھی نہ ہو۔جیسے 2016ء میں عمر متین جو کہ ہم جنس پرست تھا، نے فلوریڈا کے ایک ہم جنس پرستوں کے ایک نائٹ کلب میں فائرنگ کر کے 49 لوگ مار دیئے اور 53 کے قریب لوگ زخمی کر دیئے۔لیکن کیونکہ یہ بندہ مسلمان تھا لہٰذا اُس کا تعلق فوراً داعش اور دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا۔(3)

یاد رہے کہ گن کنٹرول کے قوانین کو مزید مضبوط کرنے کے لیے عوام اور بہت سارے سینیٹرز بشمول صدر اوبامہ کے کوشش کرتے رہے ہیں لیکن اسلحہ کے سوداگروں کی لابی اتنی مضبوط ہے کہ وہ کسی کو اپنے خلاف برداشت ہی نہیں

کرتے۔ یہ پیسے خرچ کر کے تمام بڑے لوگوں کی ہمدردیاں خرید لیتے ہیں۔CNN کی ایک ریسرچ کے مطابق امریکہ میں 2001 سے 2014 تک تقریباً440095 لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔(4)

صرف ایک سال یعنی 2015 میں 372 ایسے واقعات ہوئے جن میں 33635 لوگ گولیوں کی نذر ہوگئے۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق 2015 میں 15694 قتل ہوئے۔جن میں سے تین چوتھائی (11772) وارداتوں میں قاتلوں نے گن استعمال کی۔(5)

برطانوی اخبار ''گارڈین'' کے مطابق برطانیہ کے اندر دو ممالک انگلینڈ اور ویلز (اس میں سکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ شامل نہیں ہے) میں 5864 ایسے واقعات ہوئے جہاں ہینڈ گن کا استعمال ہوا۔(6)

BBC کے مطابق صرف لندن کے اندر 17-2016ء میں 2544 گن کرائم واقع ہوئے۔(7)

امریکہ میں 2016ء کے اندر گن سے متعلقہ تقریباً 58804 وارداتیں ہوئیں۔جن کی وجہ سے 15085 افراد موت کا نشانہ بنے اور 30615 افراد زخمی ہوئے۔اس کے علاوہ 326 پولیس افسران بھی مارے گئے۔(8)

اب اگر اس کا موازنہ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والے اِکا دُکا واقعات سے کیا جائے تو یہ نام نہاد ''دہشت گردی'' آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ہم کسی بھی قسم کے ایسے واقعہ جس میں انسانی جان ضائع ہو، چاہے وجہ کوئی بھی ہو اُس کی مذمت کرتے ہیں۔کہ انسانی جان لینا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔لیکن نوجوانوں کے مسائل سامنے رکھیں اور حقیقت کو دیکھیں تو نوجوانوں کی پریشانی کی وجہ نظر آتی ہے۔مغرب میں قوانین بنانے والے ادارے بھی عجیب ہیں۔ امریکہ میں اسلحہ کی بھرمار ہے اور ایک امریکی غیر مسلم دہشت گردی کے لئے 47 آٹومیٹک/سیمی آٹومیٹک گنیں اور مشین گنوں کے علاوہ دھماکہ خیز مواد خرید لیتا ہے جو کہ اسلحہ کنٹرول کرنے والے اداروں کے پاس باقاعدہ ریکارڈ کا حصہ ہے لیکن کیونکہ وہ مسلمان نہیں لہٰذا نہ میڈیا اور نہ ہی سیاستدانوں نے اُس کو دہشت گرد کہا اور نہ ہی اُسکے اس مکروہ عمل کو دہشت گردی کہا گیا۔اُس کے مذہب کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ بجائے اسلحہ کی خرید و فروخت کو ایک سخت نظام کے تحت کنٹرول کیا جائے یعنی ایک بندہ صرف ایک گن رکھ سکتا ہو اور وہ بھی آٹومیٹک نہیں ہونی چاہیے۔اُلٹا گن کی خرید و فروخت کو مزید عام کیا جاتا ہے۔اس طرح پہلے شراب خانے رات ہوتے ہی بند ہو جاتے تھے اور لوگ گھر جا کر پینے پلانے کا کام کرتے تھے تاکہ گلیوں میں شور شرابہ اور لڑائی جھگڑا نہ ہو۔اب رات کے 3 بجے تک شراب خانے اور کلب کھلے ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے عورتوں کی عزت لوٹنے کے واقعات اور تشدد پسند رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں پولیس اور ہسپتالوں پر بوجھ بڑھ رہا ہے۔لیکن بجائے اس کے کہ شراب خانوں کے کھلنے کے اوقات میں کمی کی جائے یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔اس طرح منشیات کے استعمال کو بھی قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔پھر کہا جاتا ہے کہ دماغی امراض بڑھتے جا رہے ہیں۔کیا مغرب کو دوسرے ممالک میں مداخلت کی بجائے اپنے اندرونی حالات کو درست کرنے کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے؟ یہ ہے وہ سوال جو اکثر نوجوان مجھ سے کرتے ہیں۔

''تمہیں زندگی پسند ہے اور ہمیں موت'':

مندرجہ بالا پس منظر میں اس نوجوان کا سوال واقعی کانٹے دار تھا۔میں نے مضطرب چہرے والے اس نوجوان سے کہا تھا: ''آپ اپنے اس تاثر کی حمایت میں کئی مزید مثالیں بھی دے سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میں اس حوالے سے آپ

سے اتفاق کروں کہ یہ واقعی دوہرا معیار ہے، لیکن میرے خیال میں اس طرح کے واقعات کے پس منظر میں یہ رویہ درست نہیں۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ جب کوئی مسلمان دہشت گردی کا حملہ کرنے سے پہلے اللہ اکبر کا نعرہ لگائے گا تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ مسلمان اپنی مذہبی حیثیت میں معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے یا اگر کوئی ایسا بیان دے جیسا کہ اس برطانوی مسلمان ٹیچر محمد صدیق خاں نے دیا تھا: ''تمہیں زندگی پسند ہے اور ہمیں موت'' جو کہ 7 جولائی 2005 کے لندن حملوں کا ماسٹر مائنڈ تھا، اس کی ویڈیو دیکھ کر عام لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ اس شخص کا مذہب ہی ہے جو اسے معصوم انسانوں کو مارنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ صدیق خاں کی تقریر کی اس ویڈیو کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی نصرانی یا یہودی سازش نہیں تھی بلکہ یہ ایک برطانوی مسلمان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ محمد صدیق خان نے اپنی ویڈیو ریکاڈنگ میں کہا کہ:

"Your democratically elected governments continuously perpetuate atrocities against my people all over the world and your support of them makes you directly responsible, just as I am directly responsible for protecting and avenging my Muslim brothers and sisters.
Until we feel security, you will be our targets and until you stop the bombing, gassing, imprisonment and torture of my people we will not stop this fight.
We are at war and I am a soldier. Now you too will taste the reality of this situation."

ترجمہ: ''.....تمہاری جمہوری طریقے سے منتخب کردہ حکومتیں لگاتار پوری دنیا میں ہمارے لوگوں کے خلاف قتل و غارت گری پھیلا رہی ہیں۔ کیونکہ آپ اُن کی سپورٹ کرتے ہیں لہٰذا آپ اس کے براہِ راست ذمہ دار ہیں۔ جیسا کہ میں اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی حفاظت اور بدلہ لینے کا ذمہ دار ہوں۔ جب تک ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ نہیں لیتے آپ ہمارا ٹارگٹ رہیں گے۔ جب تک کہ آپ ہمارے لوگوں پر بمباری، جیلوں کی سزائیں واذیتیں اور گیس سے مارنا بند نہیں کرتے ہم یہ لڑائی بند نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں۔ اور میں ایک سپاہی ہوں اب اس صورتِ حال کی حقیقت کا مزہ آپ خود بھی چکھیں گے۔.....''(9)

اِس حملے میں 52 لوگ مارے گئے تھے اور تقریباً 700 کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ صدیق خان جو کہ برطانیہ کی یونیورسٹی سے گریجویٹ تھا اس کا دوسرا ساتھی مسٹر شہزاد تنویر جو کہ برطانوی یونیورسٹی سے ڈگری لے چکا تھا اور برطانوی مسلمان تھا۔ اُس کا ویڈیو بیان بھی صدیق خان سے ملتا جلتا تھا کہ برطانوی عوام ووٹ دے کر حکمرانوں کو لاتی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور یہ کہ ''تمہیں زندگی پسند ہے اور ہمیں موت''۔ صدیق خان کے ساتھ تیسرا کردار جرمین لنڈزے (Germaine Lindsay) کا تھا جو کہ نومسلم برٹش شہری تھا۔ اُس کی بیوی سمانتھا لیوتھ وائٹ (Smantha Lewthwaite) بھی اُس کے ساتھ شامل تھی۔ یہ بھی برٹش نیشنل تھی۔ اور دونوں میاں بیوی گورنمنٹ کے سکول میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اسی طرح چوتھا ساتھی برطانوی مسلمان حبیب حسین تھا اُس نے بھی برطانیہ کے گورنمنٹ سکول و کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یعنی اِن میں سے کوئی بھی کسی مدرسے یا اسلامی سکول سے پڑھا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اِن میں سے کوئی مولوی تھا۔ اِن نوجوانوں کو سرکاری سکولوں نے یا برطانوی معاشرے نے کیا دیا کہ وہ دہشت گرد بن گئے۔ جبکہ اِن کے بڑے یا والدین جو کہ پاکستان یا دوسرے ممالک سے آئے تھے یا برطانیہ میں پیدا

ہوئے تھے، وہ تو مذہب کے زیادہ قریب تھے لیکن نہ وہ انتہا پسند بنے نہ دہشت گرد؟

یہ ایک نظریہ ہے جس کی نشاندہی کر کے اس کا حل پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ دوسروں کو الزام دے کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کریں۔ دراصل ہم مسلمان غیروں کی ناانصافی کا رونا رو کر اپنے غلط رویوں کو درست قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے بجائے ہمیں ایسی حکمتِ عملی کی طرف بڑھنا ہے جس میں ہم انتہائی نامساعد حالات سے نکل کر ترقی کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں، لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ردِعمل کی نفسیات کا شکار ہو کر ابھی تک ترقی کی طرف اپنے سفر کا آغاز ہی نہیں کر سکے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ مسلمان اس دہشت گردی کے پرابلم کا حصہ بنے رہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے سمیت دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ٹریننگ کریں کہ وہ دہشت گردی کے پرابلم کے حل اور اس مجوزہ حل کے اطلاق کرنے والوں کا حصہ بنیں۔

میرے اس جواب سے لگتا یہی تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوا، ایسے موقعوں پر میں تاریخ کا سہارا لیتا ہوں، اس لیے میں نے کہا:

حکمت سے خالی ردِعمل تو ترقی یافتہ معاشروں کی منزل کھوٹی کر دیتا ہے، اور یہ جملہ میرا نہیں، دورِ جدید کے فلسفہ تاریخ کے بانی ابن خلدون نے بھی یہی بات کہی ہے۔ آپ کو اب بھی شک ہے تو آیئے آپ کے سامنے ایک تاریخی شہادت پیش کرتا ہوں:

صلح حدیبیہ، امتِ مسلمہ کے لئے مستقل رہنمائی:

6 ہجری یعنی مارچ 628ء میں قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح حدیبیہ ہوئی، بظاہر اس کی ساری شرائط مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ اس واقعے کی مختصر تفصیل یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرے کا ارادہ کیا اور اپنے جان نثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ہمراہ قربانی کے جانوروں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن قریش نے حدیبیہ کے مقام پر انھیں روک لیا۔ ان کا یہ اقدام عرب روایات کے بالکل خلاف تھا۔ قریش کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مسلمانوں کا ارادہ سوائے عمرہ اور قربانی کے اور کچھ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایماء پر حضرت عثمانؓ سرداران قریش کے ساتھ مذاکرات کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے مگر مقررہ وقت پر ان کی جب واپسی نہ ہوئی تو یہ خبر پھیل گئی کہ قریش نے انھیں شہید کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہمراہ 1400 صحابہؓ سے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا انتقام لینے کے لیے جنگ کی بیعت لی، جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ خبر ایک افواہ ثابت ہوئی اور حضرت عثمانؓ تشریف لے آئے تو بات چیت دوبارہ شروع ہوئی۔ آخر وہ تاریخی معاہدہ ہوا، جسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی سب سے پہلی شق ہی مسلمانوں کے لیے انتہائی ناگوار تھی وہ یہ کہ:

☆ اس برس وہ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں گے اور اگلے برس آئیں گے۔

☆ ایک دوسری شرط جسے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے بھی مسلمانوں کے وقار کے منافی سمجھا وہ یہ تھی کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ پلٹ جائے گا

تو وہ اسے واپس نہیں کریں گے۔

اسی طرح جب معاہدے کی دستاویز لکھی گئی تو اس پر بھی ایک انتہائی نازک موقع آیا۔ فریقین میں جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہوا تو اس میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ ''رسول اللہ'' کے الفاظ لکھے گئے، جس پر مشرکین نے شرط عائد کی اس کو مٹا کر صرف محمد بن عبداللہ لکھا جائے، ورنہ معاہدہ ختم سمجھا جائے، اس پر بھی صحابہؓ سخت غضب ناک ہوئے اور حضرت علیؓ نے یہ الفاظ مٹانے سے صاف انکار کر دیا، تب خود حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ سے یہ الفاظ مٹائے اور یہ معاہدہ تکمیل کو پہنچا۔ اس معاہدے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں دونوں فریقوں کے درمیان دس برسوں تک جنگ نہ ہونے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ یوں اصل میں مسلمانوں نے ہر چیز کی قربانی دے کر امن حاصل کیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حالت امن میں تقریباً سارا جزیرہ نما عرب مسلمان ہو گیا۔ اسی لیے جب مسلمان اس معاہدے کو شکست سمجھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے ''فتح مبین'' قرار دیا۔ (سورہ فتح:1) صلح حدیبیہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ نظریے کی فتح کے لیے سر نہیں دل فتح کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے زمانہ امن کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ربانی حکمت اور دانائی انھی لیڈروں کو ملتی ہے جو ماضی میں الجھنے کے بجائے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی قوم کی ترقی کے لیے بروقت اور درست فیصلے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور وہ قوموں کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور صبر و تحمل کو اختیار کر کے تاریخ کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ انسانی جان کے ضیاع کو روکنے کے لیے نبی اکرم ﷺ صبر اور برداشت کی آخری حد تک گئے۔ ظاہری طور پر اس میں مسلمانوں کی سبکی تھی لیکن آنے والی نسلوں کو ایک واضح پیغام دیا کہ مسائل کو جنگ و جدل کے بجائے باہمی گفت و شنید سے حل کر کے انسانی جان کا تحفظ کیا جائے۔ اس پر کوئی دو آرا نہیں ہیں کہ مشرکین مکہ ظالم تھے اور اُن کے مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں کو اپنے آبائی وطن مکہ سے مدینہ ہجرت کرنی پڑی لیکن اس کے باوجود جنگ کا راستہ اپنانے کی بجائے ڈائیلاگ کے ذریعے امن کی تلاش کا راستہ اپنایا گیا اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ بہت بڑے غیور ہیں اور غیرت مندوں کو پسند کرتے ہیں حضور ﷺ اور صحابہؓ سے بڑھ کر غیرت کا مظاہرہ کون کر سکتا ہے؟ لیکن عملی اقدامات اور فیصلے زمینی حقائق، معروضی حالات کو سامنے رکھ کر کیے گئے۔ گویا انسانی خون کی حرمت کو سامنے رکھا گیا۔ (10)

تاریخ شاہد ہے صلح حدیبیہ کی جن شرائط کو بعض صحابہ کرام y اپنی شکست سمجھ رہے تھے دراصل انہی شرائط میں فتح مبین پنہاں تھی۔

معلوم نہیں وہ طالب علم مطمئن ہوا یا نہیں لیکن سامعین کی تالیوں کی گونج بتا رہی تھی دلیل میں وزن تھا۔

دراصل یہ سوال صرف اس ایک جوان کا نہیں تھا۔ آج مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد یہی سوچ رکھتی ہے کہ ترقی یافتہ قومیں جی بھر کر مسلمانوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ چند گمراہ لوگوں کے غلط اقدام کی آڑ میں مذہب اسلام کو ایک خطرے کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مسلمان دیکھتے ہیں کہ مغرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو شعائر اسلام کی بے حرمتی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور مغربی ممالک اسلام کا مذاق اڑانے والوں کو اعزازات سے نوازتے ہیں، ان کو ہیرو قرار دے کر آزادی رائے کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ یہ تاثر چند واقعات پر مبنی نہیں بلکہ اس کے پیچھے تقریباً نصف صدی کی تلخ یادیں ہیں۔ اور شکایت صرف اسی ایک نوجوان کی نہیں بلکہ اس طرح کے ہزاروں لوگوں

بالخصوص مذہبی طبقہ میں یہ چنگاری لگی ہوئی ہے۔

جنگ عظیم دوم کے اتحادیوں نے عالمی برادری کی بے حسی، فلسطینیوں کی غلط حکمت عملی، عرب ممالک کی آپس کی چپقلش اور ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف عرب قوم پرستی کا فائدہ اُٹھا کر بالفور معاہدے (The Balfour Decleration) کے تحت اسرائیل قائم کیا اور پھر اس اسرائیل نے مغربی ممالک کی تائید اور عرب ممالک کی مجرمانہ غفلت سے پچھلے پچاس برسوں میں ہزاروں فلسطینیوں کو شہید کر ڈالا۔ افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد سے اب تک لاکھوں سے زائد افغان شہید ہو چکے ہیں۔ عراق میں امریکی مداخلت کے بعد وہاں مقتولین کی تعداد ایک سروے کے مطابق 6 لاکھ سے بڑھ چکی ہے۔ چیچنیا میں روسی افواج کے ہاتھوں 2 لاکھ سے زیادہ مسلمان جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ بوسنیا میں سربیائی افواج نے مسلم نسل کشی (Ethnic Cleansing) کے نتیجے میں چھ لاکھ کے قریب مسلمانوں کو منظم طریقے سے شہید کیا اور کشمیر میں 2 لاکھ سے زیادہ کشمیری آزادی کی خاطر جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں پچھلی کئی دہائیوں سے ایک منظم طریقہ کار اپنایا گیا ہے، جو کہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے نازیوں نے یہودیوں کا ہولوکاسٹ کیا۔ اب چاہے مشرقی یورپ ہو یا مشرق وسطیٰ ہو یا برصغیر مسلمانوں کا ہولوکوسٹ ہو رہا ہے۔ اور بین الاقوامی تنظیمیں اپنی کم ہمتی اور دوہرے معیار کی وجہ سے مسلمانوں کو کوئی خاطر خواہ تحفظ فراہم نہیں کر سکیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ہولوکوسٹ کیا ہے اور یہ مکروہ اور سفاکانہ فعل کس نے کس کے ساتھ اور کیوں کیا؟

ہولوکوسٹ کیا ہے؟:

ہولوکوسٹ Holocaust دراصل یونانی لفظ Holokauste سے لیا گیا جس کا مطلب قربانی کے لئے پیش کی گئی چیز کا مکمل طور پر جل جانا۔ انگلش میں اس لفظ کا استعمال کسی چیز کی مکمل تباہی اور بربادی ہے۔ لیکن عرفِ عام میں یہ اصطلاح جنگ عظیم دوئم میں جرمنی کے نازیوں کی طرف سے یہودیوں کے ساتھ انتہائی ناروا و غیر انسانی سلوک اور بہیمانہ قتل و غارت گری کے لیے مخصوص ہے۔ یہودی اعداد و شمار کے اداروں کے مطابق تقریباً 60 لاکھ یہودی جرمنی کے چانسلر (وزیر اعظم کی طرح ریاستی سربراہ) ایڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) کے حکم سے مار دیئے گئے، جلا دیئے گئے یا گیس کے چیمبرز میں پگھلا کر مار دیئے گئے۔ لیکن کئی مغربی اہم علم و دانش کو اس تعداد سے اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ 50 لاکھ غیر یہودی بھی مارے گئے جن کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔[11] ہٹلر کی نازی پارٹی نے جرمنی میں 1932ء کے الیکشن اپنے یہودی مخالف نظریات کا پرچار کر کے جیتے تھے۔ اور 1933ء سے 1945ء تک جرمنی کے حکمران رہے۔ وہ یہودی قوم سے سخت نفرت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہودی اپنے مال و دولت اور دوسرے ہتھکنڈوں سے یورپ میں بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر چکے تھے اور وہ جرمنی کو یہودیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے، اُن کے بقول یہودی قوم ''انسانوں کی نسلی ٹی بی (Race Tuberculosis of the peoples) کی بیماری ہے۔ وہ کہتے تھے کہ:

" Ultimate goal most definitely be removal of the Jews altogether"

ترجمہ:..... ہماری آخری منزل یہودیوں کا مکمل خاتمہ ہے۔ (12)

بہر حال یہودیوں کے ساتھ یورپ میں انسانیت سوز سلوک ہوا، ظلم ہوا، قتل و غارت گری ہوئی، عورتوں کی عصمت دری ہوئی۔ اور اس پورے عمل میں جرمنی کے چرچ کے علاوہ سرکاری محکمے بھی شامل تھے۔ کہ چرچ سے افراد کا بنیادی

ریکارڈ حاصل کیا جاتا اور پوسٹ آفس وغیرہ سے ہر قسم کی ڈاک کو چیک کر کے یہودیوں کے کوائف (Data) مکمل کر کے حکومتی سطح پر اس قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا جاتا۔ ہٹلر کا چونکہ عیسائی خاندان سے تعلق تھا اس لئے کئی عیسائی ممالک بلکہ پورا یورپ اِس ظلم پر شرمندہ ہے اور یہودیوں کی دادرسی کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن جب یورپ میں بلقان کی ریاستوں (بوسنیا، کوسوا وغیرہ) میں مسلمانوں پر اسی طرح کا ظلم شروع ہوا تو اِس کو بھی کئی حلقوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ہولوکوسٹ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ بہرحال ہولوکوسٹ اگرچہ یورپ میں یہودیوں کے قتل عام سے موسوم ہے لیکن یہ انتہائی ظلم اور قتل عام اور کسی قوم کی نسل کشی کے لئے بھی انتہا پسندی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ نے بھی پوری دنیا کے خلاف ہو کر جرمنی کا عالمی جنگ میں ساتھ دیا تھا جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں اور یہودی لابی جنگ عظیم کے بعد مزید طاقتور ہو کر دنیا میں آئی اور اُس کے نتیجے میں صیہونی طاقتوں نے مغرب کے ساتھ مل کر اسرائیل کے نام سے نئی ریاست بنائی۔ برطانیہ اور امریکہ میں اُس وقت تک کوئی وزیراعظم یا صدر نہیں بن سکتا جب تک وہ باقاعدہ میڈیا پر آ کر بار بار اِس بات کا اعادہ نہ کرے کہ وہ یہودی مخالف نہیں ہے اور وہ اسرائیل کی ریاست کی حفاظت کا نہ صرف حامی ہے بلکہ عملی طور پر کوئی اہم کردار ادا کرے گا/گی۔

یورپ میں یہودی اور مسلمان:

بہرحال کچھ مؤرخین جن میں یہودی بھی شامل ہیں کا یہ کہنا ہے کہ جب مسلمانوں نے 750 سال سے زیادہ سپین پر حکومت کی تو اُس وقت یہودیوں کو بڑے امن اور سکون سے زندگی گزارنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا۔ جس کا کئی یہودی برملا اظہار کر چکے ہیں۔ (اسی لیے کئی یہودی فلسطینیوں سے متعلق اسرائیلی رویوں کے خلاف ہیں) ایک تحقیقاتی ادارے PEW Research Centre کے مطابق جنگ عظیم تک پوری دنیا میں یہودیوں کی تعداد تقریباً 16.6 ملین تھی۔ (جو کہ کراچی کی آبادی کے برابر ہے) اور یورپ میں تقریباً 9.5 ملین یہودی رہ رہے تھے۔ 6 ملین تو نازیوں نے مار دیئے۔ اب 2015ء کے اعداد وشمار کے مطابق یورپ میں یہودیوں کی آبادی صرف 14 لاکھ ہے۔ یعنی ایک ملین سے کچھ زیادہ۔(13)

کچھ مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودی اللہ کی لاڈلی قوم تھے یعنی بنی اسرائیل کو کھانا پکا پکایا ملتا تھا لیکن وہ زیادہ نخریلے ہو گئے اور کھانے کے بجائے کھانے کے سامان کا تقاضا شروع کر دیا۔ اور اُن کے مظالم کی کہانیاں عیسائیوں کے خلاف بھی بہت مشہور ہیں۔ اور فلسطین کے عیسائی اور مسلمان عربوں پر ظلم کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور اسرائیل کی صیہونی لابی صرف امریکہ میں نہیں بلکہ یورپ میں اتنا اثر ورسوخ رکھتی ہے کہ کوئی سربراہ مملکت اسرائیل کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔

ایک تحقیقاتی ادارے PEW Research Centre کی 2016ء میں کی گئی تحقیق کے اعداد وشمار کے مطابق یورپ کے 28 ممالک بشمول ناروے اور سویٹزرلینڈ میں مسلمانوں کی تعداد (ترکی کے علاوہ) 25 ملین کے قریب ہے۔ جبکہ فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اٹلی میں بالترتیب 57، 49، 41، 28 لاکھ کے قریب مسلمان بستے ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق 2010ء میں یہ تعداد 19.5 ملین تھی جو کہ اب بڑھ کر 25.8 ملین ہو گئی ہے۔ اور توقع کی جا رہی ہے کہ 2050ء تک یہ تعداد 50 ملین تک پہنچ جائے گی۔ (جبکہ ترکی کی آبادی جو کہ تقریباً 80 ملین ہے اور 98% مسلمان بستے ہیں۔ یہ اس کے

علاوہ ہے۔اور ترکی کے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ بھی اسی رفتار سے ہوا تو یہ 80 ملین سے بڑھ کر 150 ملین کے قریب پہنچ جائے گی۔) مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمانوں کے خلاف جذبات اُبھارنے کے لئے بڑی محنت ہو رہی ہے۔اور دائیں بازو کی قوم پرست اور انتہا پسند تنظیمیں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تنظیمیں ملکی انتخابات میں دوسری یا تیسری پوزیشن میں آتی ہیں۔ (14)

یورپ عورت اور مرد کو برابر کے حقوق دینے کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم جنس پرستی کی حمایت میں قوانین بنا چکا ہے۔اب مرد کے ساتھ مرد اور عورت کے ساتھ عورت سے باقاعدہ چرچ میں جا کر شادی کر سکتے ہیں۔اور تو اور چرچ میں نکاح پڑھانے والا پادری بھی بعض اوقات ہم جنس پرست ہوتا ہے۔لہٰذا جب ہم جنس ایک دوسرے سے شادی کریں گے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔جب کہ کیتھولک اور دوسرے عیسائی، یہودی اور مسلمان ہم جنس پرستی کے حق میں قوانین بنانے کے خلاف تھے لیکن نام نہاد انسانی حقوق کے حوالے سے شادی کے ایک مسلمہ نظام کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔نتیجتاً دائیں بازو کی انتہا پسند اور نازی تنظیموں میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ مسلمان دن بدن یورپ میں بڑھتے جا رہے ہیں اس کے مقابلے کے لئے کچھ مذہبی عیسائی تنظیموں کا خیال ہے کہ ہم جنس پرستی کو روکنے کے لئے کوئی اقدام کرنا ہوں گے۔مگر ''آزادی'' کے نام پر بہت سے کام۔ایسے ہوتے ہیں جہاں مذہبی طبقات مجبور ہیں۔

مجھے تو یہ سمجھ آ رہی ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کو امریکی صدر کے طور پر لانا بھی اسلام مخالف قوتوں کی ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔مسٹر ٹرمپ ایک بزنس مین ہیں اور کوئی سیاسی تجربہ نہیں رکھتے۔یعنی کونسلر تک نہیں رہے جن سات ممالک کا اگلے صفحات میں جنرل ویزلی کلارک نے پینٹا گون کے حوالے سے ذکر کیا ہے کیا ''حسن اتفاق'' ہے کہ صدر ٹرمپ کے آتے ہی ان میں سے چھ ممالک کے خلاف امریکہ میں داخلے پر پابندی کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ایران کے علاوہ باقی تمام ممالک (عراق، شام، لیبیا، صومالیہ، سوڈان اور یمن) کا جو حال نام نہاد ''انسانی حقوق'' کے نام پر انہوں نے مل کر کر دیا ہے، کیا اس گناہ عظیم سے ہم مسلمان اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔جواب ''نہیں'' میں ہی آئے گا۔اگلے چند سالوں میں بدقسمتی سے ہم مسلمان ایران کے خلاف ان طاغوتی قوتوں کا آلہ کار بن رہے ہوں گے۔اس کا ذکر اکتالیس ممالک کے اتحاد کے قیام سے کر دیا گیا ہے۔

صدر ٹرمپ الیکشن مہم کے دوران کہتے نظر آئے کہ الیکشن جیتنے کے بعد بیرونِ ملک جنگیں روک دی جائیں گی۔افغانستان سے فوجیں واپس بلائی جائیں گی لیکن جب انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا تو اب افغانستان سے فوجیں واپس بلانے کی بجائے تین ہزار نئے فوجی بھیجے جا رہے ہیں اور یہی صورت حال عراق سے متعلق بھی ہے۔مزید یہ کہ ٹرمپ کی طرف سے ناکامی کو چھپانے کے لئے پاکستان کو دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔

ٹرمپ پاکستان کا احسان عظیم بھول گئے ہیں کہ پاکستانی عوام اور پاکستانی فوج نے مل کر امریکہ کو سرد جنگ سے چھٹکارا دلایا اور آج وہ اسی پاکستان کو دھمکیاں دے رہے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ افغانستان کی صورت حال کو ٹھیک کرو اور دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہوں کو ختم کرو۔افغانستان کی صورت حال کو قابو میں نہ دیکھ کر غصہ پاکستان پر نکالتے ہوئے ٹرمپ کہتے ہیں کہ:

Pakistan to ''Demonstrate its commitment to civilisation, order and peace.''

ترجمہ: پاکستان کو ''تہذیبی، نظم اور امن کے اپنے عزم کا (عملی طور پر) اظہار کرنا ہوگا۔''(15)

کیا امریکی صدر پاکستانی قربانیوں کو بھول گئے؟ کیا وہ نہیں جانتے، کہ افغان جنگ نے پاکستان کے کتنے سکیورٹی اداروں کے افراد کی جان لی اور سویلین افراد کی جان لی۔ اربوں ڈالر کا مالی نقصان اٹھایا اور وہ نقصان اس کے علاوہ ہے جو افغان جنگ کی وجہ سے ادارے ملکی ترقی کی طرف توجہ نہ دے سکنے کی وجہ سے کر بیٹھے ہیں اور پاکستان میں امن و امان کی صورت حال مخدوش ہونے کی وجہ سے عوام کا اداروں سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ امریکہ کیا یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے ادارے یہ نہیں جانتے کہ امریکہ، بھارت اور اسرائیل کو پاکستان کا پرامن ایٹمی پروگرام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے سکیورٹی ادارے چاک و چوبند کھڑے ہیں اور علاقائی جیوپولیٹیکل صورت حال پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کوئی صومالیہ نہیں ہے۔ پاکستان کی غیور عوام، سیاسی ادارے، فوج، عدلیہ، وکلا، اساتذہ، طلبا وغیرہ سب پاکستان کے دفاع کے لئے ایک ہی موقف رکھتے ہیں۔

مغربی دنیا اور سی پیک (CPEC)-A Project of the Century :

امریکہ سمیت مغرب کو پاکستان سے متعلق اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی ہوگی، دھمکیوں کی بجائے ڈائیلاگ کا راستہ اختیار کرنا ہوگا کیونکہ ''چین، پاکستان اقتصادی رہ گزر'' China-Pakistan Economic Corridor (CPEC) کا معاہدہ ہونے کی وجہ سے علاقے کی صورت حال تیزی سے بدل رہی ہے۔ تجزیہ نگار اس پروجیکٹ کو اس صدی کا سب سے بڑا منصوبہ قرار دیتے ہیں۔ چائنا کا پہلی دفعہ اپنی فوج کا ملک سے باہر پاکستان کے قومی دن (23 مارچ) کو منانے کے لئے پریڈ میں شامل ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان اور چائنا ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ مزید یہ کہ روس کا پاکستان کے گرم پانیوں میں آ کر ایک ساتھ بحری مشقیں کرنا اس چیز کی دلیل ہے کہ امریکہ پاکستان سے اپنے تعلقات بگاڑ چکا ہے۔ یہ امریکہ کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

CPEC کا منصوبہ پوری مغربی دنیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا اور اُس کے لئے کئی جتن کئے جا رہے ہیں کہ کسی طرح اِس منصوبے کو ناکام کیا جائے تاکہ چائنا ایک سپر پاور کے طور پر سامنے نہ آ جائے۔ چائنا کے خلاف امریکہ اور بھارت کا گٹھ جوڑ اور اِن ممالک کے سربراہوں کے ایک دوسرے کے ممالک کے اسفار اور ملاقاتیں اِسی مقصد کی ایک کڑی ہیں۔ CPEC چائنا کے ایک بڑے منصوبے (OBOR) One Belt, One Road یعنی ایک پٹی اور ایک سڑک۔ کا حصہ ہے جس کے تحت چائنا، جنوبی ایشیا، مغربی ایشیا، وسطی ایشیا، روس، مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور یورپ کی 65 قومیں بری اور بحری راستوں سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائیں گے کہ اِس سے وقت کی بہت زیادہ بچت ہوگی جو کہ نقل و حرکت کے وسائل پر کم بوجھ ڈالنے کا سبب بنے گا۔(16) جس کی وجہ سے اشیا کی قیمت بہت کم ہو جائے گی جس سے چائنا اور اس کے پراجیکٹ کے پارٹنر بہت زیادہ مالی فائدہ اُٹھائیں گے۔ دنیا کی ایک بہت بڑی کمپنی ڈیلائیٹ (Deloitte) کے مطابق اس پراجیکٹ کی کل کاسٹ 75 بلین امریکی ڈالر ہے جبکہ 2020ء تک 45 بلین امریکی ڈالر خرچ کر کے اِس کو آپریشنل کر دیا جائے گا۔(17)

پاکستان کے اندر چائنا سڑکوں کا جال بچھا دے گا اور پرانی شاہراہِ ریشم (Silk Road) کو نیا بنا کر اِس روٹ کو بھی بہتر اور آسان بنا دیا جائے گا۔ جو کہ کاشغر سے گوادر تک تقریباً 3000 کلومیٹر کا سفر بنے گا۔ یہ روٹ کاشغر سے خنجراب

، پشاور، ڈیرہ اسمٰعیل خان، کوئٹہ اور پنجگور سے ہوتا ہوا گوادر، اس کے لنکس اسلام آباد، لاہور، ساہیوال، سکھر، حیدر آباد اور کراچی سے بنائے جائیں گے۔ پھر دنیا کی سب سے گہری اور صاف پورٹ پاکستان کے سمندری حصے گوادر بحیرہ عرب میں بنے گی۔ اس پراجیکٹ کی کاسٹ تقریباً 55 بلین امریکی ڈالر ہوگی 21 پاور پلانٹس پر 35 بلین امریکی ڈالر خرچ ہوگا جو کہ پاکستان کی 6GW بجلی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد دیں گے۔ جس سے چائنا اور دوسرے ممالک عملی طور پر ٹریڈ اور انویسٹمنٹ کا فائدہ اُٹھائیں گے۔ چائنا اور پاکستان روس کے ساتھ مل کر افغانستان میں امن کی کوششوں کو تیز کر چکے ہیں۔ اُس کی بہترین مثال روس میں سہ فریقی (چائنا، افغانستان اور پاکستان) کانفرنس ہے۔ پاکستان یہ بھی چاہتا ہے کہ بھارت کے ساتھ بھی امن قائم ہو اور کشمیر کے مسئلے کو چائنا کے ذریعے مفاہمت سے حل کر کے خطے میں پائیدار امن قائم کیا جائے۔ لیکن ایک سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آج کے مادی اور خود غرضی کے دور میں وسائل پر قبضہ کرنے کیلئے جنگوں کے بعد کیا امریکہ اور یورپی ممالک بھارت کو کسی ایسی مثبت پیش رفت کی طرف بڑھنے دیں گے؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ برطانیہ کے مفاد میں ہے کہ وہ اس میں آگے بڑھ کر امن کے لئے راستہ ہموار کرے۔ اور آئندہ آنے والے وقتوں میں وسائل سے مالا مال ممالک سے کاروبار کے ذریعے بھرپور فائدہ اُٹھا سکے۔

چائنا اور پاکستان خطے میں امن کے لئے اتنے سنجیدہ ہیں کہ پاکستان نے اپنے بارڈرز پر اور ملک کے اندر انتہا پسندوں کی کمر توڑ دی اور دہشت گردوں کے تمام ٹھکانے تباہ و برباد کر دیئے ہیں۔ لہٰذا افغانستان کو بھی چاہیے کہ تحریک طالبان پاکستان (TTP) کو ختم کرے کہ دونوں ممالک میں امن، سیاسی اور معاشی استحکام کی ضمانت ہے۔ اسی طرح پاکستان کو چاہیے کہ افغانستان کے تحریک طالبان افغانستان سے متعلق تحفظات کو خلوص اور خوش دلی سے دور کرے۔ چائنا، پاکستان اور افغانستان کو اس زمینی حقیقت پر بھی غور کرنا ہوگا کہ طالبان بھی افغان شہری ہیں لہٰذا ان کو ایک اہم سٹیک ہولڈر کا رُتبہ دے کر حکومت کا حصہ بنائیں۔

لہٰذا میری رائے میں امریکہ کو اپنی جارحانہ حکمت عملی کو نئے سرے سے دیکھ کر پاکستان جیسے دوستوں کو مخالفین کے کیمپ جانے کی وجوہات پر غور کرنا ہوگا وگرنہ امریکہ افغانستان میں جنگ ہار چکا ہے۔ جس کا اظہار امریکی اور برطانوی جنرل بھی کر چکے ہیں ایک لاکھ فوج بھیج کر بھی مٹھی بھر طالبان سے ملک کا کنٹرول نہیں چھین سکے۔ تو اب مزید چار ہزار فوجی بھیج کر اپنی ٹوٹل 16 ہزار فوج سے طالبان سے کیسے جنگ جیت سکتے ہیں؟ امریکہ کے لئے یہ بھی ایک لمحہ فکریہ ہے کہ آئی ایس آئی اب امریکہ کی مدد کیوں نہیں کر رہی؟ کیا اس کی وجہ امریکہ، بھارت، اسرائیل گٹھ جوڑ تو نہیں؟

مسلمانوں کی نقل مکانی اور ہجرت:

امریکی تھنک ٹینک بروکنگز انسٹیٹیوٹ (Brookings Institute) نے 13 مارچ 2015ء کو آرٹیکل شائع کیا جس کے مطابق اس جدید دور میں عرب دنیا سب سے بڑی انسانی نقل مکانی کا شکار ہے۔ تقریباً 15 ملین عرب مہاجرین جن میں عراقی، شامی اور لبنانی باشندے شامل ہیں۔ ایک کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تقریباً 8 لاکھ لیبیائی باشندے اس وقت تیونس میں مہاجرین کی شکل میں رہ رہے ہیں۔ (18)

انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں کا ضمیر کب جاگے گا۔ 15 ملین بندہ جب پناہ گزین ہو جاتا ہے تو وہ صرف اپنا گھر بار ہی نہیں چھوڑتا بلکہ اس کی عزت نفس بھی بری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ ان کی خواتین کی عزت بھی غیر محفوظ تصور

ہوتی ہے (کئی ہزار کیس ریپ (Rape) کی شکل میں سامنے آچکے ہیں)۔ بچوں کی تعلیم رک جاتی ہے۔ غذائی اجناس کی قلت کی وجہ سے بچوں اور بوڑھوں کی صحت خراب ہوجاتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا انسان کے اوپر خطرناک حد تک نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور انسان کی سوچنے کی صلاحیت محدود ہوجاتی ہے۔ اور ان میں انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے..... پھر مغرب مسلمانوں سے کہتا ہے کہ انتہا پسندی کو روکو۔

میری مغربی ارباب اختیار واقتدار سے گزارش ہے کہ اپنی انتہا پسندی کی وجوہات جاننے کی کوشش کریں۔ اندازہ لگائیں کہ یہ بیماری کیا کھانے سے لگی۔ لہٰذا اس چیز کو کھانا چھوڑ دیں تو بیماری خود بخود رک جائے گی۔ آپ نے عراق پر حملہ جھوٹ کی بنیاد پر کیا۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی بڑھی لیکن کوئی سبق حاصل نہ ہوا۔

پھر لیبیا پر حملہ بھی جھوٹ کی بنیاد پر کیا۔ یورپ نے انتہا پسندی اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی یا انتقام کو بہت قریب سے دیکھا..... لیکن سبق حاصل نہ کیا۔ پھر شام پر حملے کئے گئے وہ بھی جھوٹ کی بنیاد پر۔ اب فرانس، جرمنی، بیلجیئم اور برطانیہ متواتر دہشت گرد حملوں کی لپیٹ میں ہیں۔ صرف برطانیہ میں مارچ 2017ء سے ستمبر 2017ء تک چھ حملے ہو چکے اور ہزاروں افراد زخمی اور بیسیوں موت کی نیند سو چکے ہیں۔ برطانیہ میں اس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ انتہا پسند ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف گورے اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف مسلمان انتہا پسند حلقوں میں گھر چکے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور یہ ایک نہ تھمنے والا طوفان ہے۔

عراق جنگ اور نام نہاد مہلک کیمیائی ہتھیار:

عراق کے خلاف نام نہاد مہلک کیمیائی ہتھیاروں کا معاملہ بھی بہت عجیب ہے کہ جب اس وقت کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور اس کے ایڈوائیزر ایلسٹر کیمپبل (Alastair Campbell) نے برطانیہ کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو ایسی رپورٹ تیار کرنے کو کہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ عراق کے پاس ایسے مہلک ہتھیار ہیں کہ 45 منٹ کے اندر وہ برطانیہ پر حملہ کرسکتا ہے اگرچہ ایجنسیوں نے اس پر اعتراض کیا کیوں کہ وہ ایسی کسی قسم کی اطلاع نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا وہ ٹونی بلیئر کی مرضی کی رپورٹ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے بہرحال امریکی صدر جارج بش کے دباؤ کی وجہ سے ٹونی بلیئر نے پوری برطانوی پارلیمنٹ کو ایک ایسی غلط رپورٹ تیار کروا کے پیش کر دی جو کہ بعد میں جھوٹ کا پلندا (DODGY DOSSIER) کے نام سے جانی گئی برطانوی میڈیا اور سیاستدانوں نے اس رپورٹ کو SEXD UP REPORT (یعنی بڑھا چڑھا کر اور مصالحے لگا کر تیار کی گئی رپورٹ کے نام سے پکارا۔ اور ٹونی بلیئر کو جھوٹا کہا اور لاکھوں لوگوں نے عراق جنگ اور بش اور بلیئر کے خلاف مظاہرے کیے اور ٹونی بلیئر کو بش کا پالتو کتا (POODLE) کہا گیا اور بلیئر (BLAIR) کی بجائے بلائر (BLIAR) یعنی جھوٹا کے طور پر مختلف کتبوں کو اوپر اٹھا کر مظاہرین مظاہروں میں آئے تھے۔((19

جھوٹ کا انکشاف اور ڈاکٹر کیلی کی پراسرار خودکشی:

اس جھوٹ کا انکشاف سب سے پہلے BBC کے ایک منجھے ہوئے نمائندے اینڈریو گلیگن (ANDREW GILIGAN) نے اپنی رپورٹ میں کیا جس نے نہ صرف برطانیہ بلکہ پوری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا بعد میں حکومت نے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے BBC اور اسکے نمائندے پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا کہ اپنے ذرائع کا نام بتاؤ جس کے حوالے

سے آپ نے یہ رپورٹ تیار کی ہے۔کئی طاقت ور حلقوں سے BBC کے حکومتی فنڈ کو کم کرنیکی کی باتیں ہونے لگیں۔BBC کو ڈرانے دھمکانے کے علاوہ قانونی چارہ جوئی کی بھی دھمکی دی گئی اس دباؤ کے نتیجے میں BBC نے حکومت کو اشاروں کنائیوں میں بتادیا کہ BBC کو یہ سب کچھ ڈاکٹر ڈیوڈ کیلی (DAVID KELLY) نے بتایا تھا۔ڈاکٹر ڈیوڈ کیلی برطانیہ کے چیف سائنسدان تھے اور اقوام متحدہ کی جانب سے اسلحہ کے انسپکٹر مقرر تھے۔انہوں نے ہی عراق کے اسلحے کی انسپکشن کی تھی۔اور عراق کے اسلحہ اور اس کو مزید تیار کرنے کی صلاحیت کو تباہ کروایا تھا۔اور وہ اس بات پر مصر تھے کہ عراق کے پاس مہلک ہتھیار (WMDs) نہیں ہیں۔اور ٹونی بلیئر کی طرف سے پیش کی گئی رپورٹ غلط ہے۔کیوں کہ وہ سرکاری ملازم بھی تھے ان پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا گیا ڈرایا اور دھمکایا گیا۔ان کی پارلیمنٹ کے اندر انکوائری ہوئی اور ان کی نیک نامی کو مشکوک بنادیا گیا اور ٹونی بلیئر کے لوگوں نے اس کو غدار وطن کے طور پر پیش کیا۔حالانکہ وہ سچ بول کر ملک کو ایک غلط جنگ میں جھونکنے سے بچانا چاہ رہے تھے۔پھر 17 / جولائی 2003ء کو خبر آ گئی کہ ڈاکٹر کیلی نے خودکشی کرلی ہے۔بہت سارے لوگوں اور میڈیا سمیت کئی سیاست دانوں نے اس موت کو مشکوک قرار دیا اور ایجنسیوں کی کارروائی قرار دیا۔جس طرح شہزادی ڈیانا اور وزیر خارجہ رابن کک کی اموات کو بھی مشکوک قرار دیا گیا تھا۔ڈاکٹر ڈیوڈ کیلی ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے جس میں وہ ثبوت کے ساتھ اپنے دلائل پیش کرنا چاہ رہے تھے کہ عراق کے پاس مہلک ہتھیار نہیں ہیں اور انہوں نے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے ساتھ اس سلسلے میں کئی میٹنگیں بھی کی تھیں لیکن یہ راز ایک راز ہی رہ گیا کہ ان کی موت کے بعد پولیس ان کا کمپیوٹر اٹھا کر لے گئی۔اینڈریو گلیگن نے بڑی عرق ریزی سے ''ڈاکٹر ڈیوڈ کیلی کے ساتھ غداری کے دس سال بعد'' کے نام سے اپنے اخبار میں ایک آرٹیکل 21 جولائی 2003 کو برطانوی اخبار ٹیلیگراف میں لکھا جو کہ واقعی چشم کشا ہے۔اس کے کچھ حقائق قارئین کے سامنے رکھوں گا کہ کس طرح بڑی طاقتوں نے مل کر سازش کی اور عراق کے خلاف جھوٹ کی بنیاد پر ایک جنگ کرنے اور دنیا کو بدامنی کی طرف دھکیلنے کی بنیاد رکھ دی۔ اینڈریو گلیگن لکھتے ہیں:

In July 2003, literally as David Kelly was outed, MI6 secretly withdrew the 45-minute intelligence as unreliable and badly-sourced.

ترجمہ:.....عین اُس وقت جب جولائی 2003ء میں ڈاکٹر ڈیوڈ کیلی کو نکالا جارہا تھا۔برطانوی ایجنسی MI6 نے رازدارانہ طریقے سے 45 منٹ والی انٹیلی جنس کو ناقابل اعتماد اور غلط ذرائع سے حاصل کی گئی رپورٹ سمجھ کر اصل رپورٹ سے نکال لیا تھا۔

وہ مزید رقم طراز ہیں کہ:

2. According to Major General Michael Laurie, the head of the Defence Intelligence Staff at the time of the dossier, "we could find no evidence of planes, missiles or equipment that related to weapons of mass destruction (WMD). It was clear to me that pressure was being applied to the Joint Intelligence Committee and its drafters. Every fact was managed to make the dossier as strong as possible. The final statements in the dossier reached beyond the conclusions intelligence assessments would normally draw from such facts."

ترجمہ:.....رپورٹ کی تیاری کے وقت ڈیفنس انٹیلی جنس سٹاف کے سربراہ میجر جنرل مائیکل لوری(Michael Laurie) کہتے ہیں کہ ''مہلک ہتھیاروں (WMD) کے متعلق کوئی آلات، میزائل یا جہازوں کا کوئی بھی ثبوت ہمیں نہ مل سکا۔ میرے اوپر یہ بات بالکل واضح تھی کہ جوائنٹ انٹیلی جنس کمیٹی اور عراق سے متعلق رپورٹ کے لکھنے والوں پر دباؤ ڈالا جارہا تھا (حکومت کی طرف سے) ہر چیز پر نظر رکھی جارہی تھی کہ رپورٹ کو جتنا ممکن ہوسکے (حقائق کے برعکس) مضبوط بنایا جائے۔ رپورٹ کے آخری بیان نے ایسے (غلط) نتائج نکالے جو کہ عام حالات میں ایسی معلومات پر انٹیلی جنس والے نہیں نکالتے۔

3. What we now know is that, according to an MI6 officer working on the dossier, the 45-minute claim was "based in part on wishful thinking" and was not "fully validated". Another MI6 officer said that "there were from the outset concerns" in the intelligence services about "the extent to which the intelligence could support some of the judgments that were being made".

ترجمہ:.....برطانوی انٹیلی جنس کے ادارے MI6 کے ایک افسر جو کہ اس رپورٹ پر کام کر رہے تھے، کے مطابق 45 منٹ میں عراق سے برطانیہ پر 45 منٹ میں حملہ کا دعویٰ (خواہش کی بنیاد پر مبنی تھا) ایک خوش کن خواب تھا اور اس کی غیر جانب دارانہ طریقے سے مکمل تصدیق نہیں کی گئی تھی۔ اس پر آغاز سے ہی تحفظات کا اظہار کیا گیا تھا۔'' یعنی 45 منٹ میں حملوں کے حکومتی دعوے جیسے کہ انٹیلی جنس کے ادارے سپورٹ میں کر سکتے تھے۔

ٹونی بلیئر نے جب اپنی کتاب لکھی تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہا:

4. "politicians are obliged from time to time to conceal the full truth, to bend it and even distort it, where the interests of the bigger strategic goal demand that it be done".

ترجمہ:.....وقتاً فوقتاً بڑے مقاصد اور منازل کو حاصل کرنے کے لئے سیاستدانوں کو یہ کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ سچ کو چھپائیں یا اس کو توڑ موڑ کر یا اس کی شکل ہی بدل دیں۔''

میرے خیال میں اس بیان کے بعد عراق جنگ کا معمہ حل ہو جانا چاہیے۔

اینڈریو گلیگن کہتے ہیں کہ:

5. " My own views on Sir Richard Dearlove, Sir John Scarlett and the other distinguished [civil servants].....failed catastrophically in their duty, bringing their professions, their services - and their country - into deep, possibly permanent, disrepute"

ترجمہ:.....میرے خیال میں سر رچرڈ ڈیرلو (Sir Richard Dearlove) (جو کہ MI6 کی رپورٹ کے ذمہ دار تھے)، سر جان سکارلیٹ (Sir John Scarlett) (جو کہ اس رپورٹ کی تیاری کے وقت جوائنٹ انٹیلیجنس کمیٹی (JIC) کے چیئرمین تھے) اور دوسرے ''معززین'' جو کہ (ٹونی بلیئر) کی پارٹی نیو لیبر (New Labour) کے بہت نزدیک ہو گئے تھے۔ اپنی ذمہ داری نبھانے میں انتہائی برے طریقے سے ناکام ہو گئے تھے۔ (ان لوگوں نے) اپنے پیشے، اپنے اداروں اور اپنے ملک کو انتہائی طور پر بلکہ ممکنہ حد تک مستقل بنیادوں پر رسوا کر دیا۔''(20)

عراق جنگ کے خلاف برطانوی وزیرِ خارجہ کا استعفیٰ:

قارئین کی یادِ دہانی کے لیے لکھنا چاہوں گا کہ جب ٹونی بلیئر برطانوی وزیرِاعظم تھے تو اُس وقت رابن کک (Robin Cook) وزیرِ خارجہ تھے۔ انہوں نے عراق جنگ کے خلاف حکومت کی ناقص پالیسیوں کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جب وہ فوت ہوئے تو اُن کی وصیت کے مطابق اُن کی قبر پر ایک کتبہ لکھا گیا جو کہ درج ذیل ہے۔

"I may not have succeeded in halting the war, but I did secure the right of Parliament to decide on war"

ترجمہ:..... ''میں (عراق کے خلاف) جنگ کو روکنے میں تو کامیاب نہ ہو سکا لیکن میں نے جنگ (کرنے یا نہ کرنے) کے فیصلے کا حق پارلیمنٹ کو دلوا دیا'' (21)

میں سمجھتا ہوں کہ رابن کک کی کوششوں سے ایسی قرارداد کو پارلیمنٹ میں زیرِ بحث لانے کا فیصلہ ایک ایسا مستحسن اقدام تھا کہ بجائے اس کے کہ جنگ کا فیصلہ صرف وزیرِاعظم یا اُس کی کابینہ کرے، یعنی پوری پارلیمنٹ میں بحث کے بعد فیصلہ ہو۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ 2013ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں شام کے خلاف پیش کی گئی قرارداد ناکام ہو گئی۔

(اگرچہ 2003ء عراق کے خلاف جنگ میں ٹونی بلیئر نے جھوٹ بول کر اپنے حق میں فیصلہ لے لیا تھا)۔

لہٰذا 2003ء میں اسی بنا پر رابن کک نے اپنے استعفیٰ کے بیان میں کہا کہ:

"I can't accept collective responsibility for the decision to commit Britain now to military action in Iraq without international agreement or domestic support."

ترجمہ:..... ''میں اس فیصلے کی اجتماعی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا کہ برطانیہ کو عراق (کے خلاف) جنگ میں بغیر کسی داخلی سپورٹ اور بین الاقوامی معاہدے کے ملٹری ایکشن کے لیے دھکیل دیا جائے۔'' (22)

وہ ہمیشہ یک طرفہ (Unilateral) کے بجائے اجتماعی Multilateral سپورٹ کے ساتھ فیصلہ کرنے کے حامی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ:

"In principle I believe it is wrong to embark on military action without broad international support. In practice I believe it is against Britain's interests to create a precedent for unilateral military action.

ترجمہ:..... ''میرا اصولی مؤقف ہے کہ بغیر کسی وسیع بین الاقوامی سپورٹ کے ملٹری ایکشن کرنا غلط ہوگا۔ یہ برطانیہ کے مفاد کے خلاف ہے کہ یکطرفہ ملٹری ایکشن کی مثال قائم کر دی جائے،، (23)

اِس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانوی وزیرِ خارجہ عراق کے خلاف ایکشن کو یکطرفہ سمجھتے تھے اس لئے رابن کک ہمیشہ عراق کے خلاف جنگ سے متعلق اقوامِ متحدہ سے ایک دوسری قرارداد پاس کروانے پر زور دیتے رہے۔ لیکن ٹونی بلیئر نے اپنے وزیرِ خارجہ کی ایک نہ سنی اور آج اُس جنگ کے منفی نتائج کا خمیازہ پوری دنیا بالعموم اور عالمِ اسلام بالخصوص بھگت رہا ہے۔ رابن کک اتنے منجھے ہوئے سیاست دان تھے کہ عراق پر حملہ کرنے سے متعلق انہوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ آج 100% درست ثابت ہو رہے ہیں۔

امریکہ اور اُس کی جعل سازی:

امریکی حکومت کی طرف سے عراق کی صورتِ حال پر عوام کو دھوکہ دینے سے متعلق نئی تحقیق سامنے آئی ہے بیورو آف انوسٹیگیٹو جرنلزم (Bureau of Investigative Journalism) کی 2016ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی پینٹا گون نے برطانیہ کی پبلک ریلیشن کی کمپنی (Bell Potinger) بیل پوٹینجر کو 2011-2007 تک دہشت گردوں کی جعلی پراپیگنڈا فلمیں بنانے کے لیے 540 ملین امریکی ڈالر دیئے۔ یعنی امریکی عوام کی محنت سے کمائی گئی رقم پر جو حکومت کو ٹیکس ادا کیا گیا۔ امریکہ کے جاسوسی اور فوجی دفاعی اداروں Pentagon, National Security Council, CIA نے القاعدہ طرز کی جعلی فلمیں بنوا کر انٹرنیٹ پر ڈال دیں۔ جس سے نہ صرف امریکی حکومت اپنے غلط ہتھکنڈوں اور پالیسیوں کا دفاع کر سکی بلکہ امریکی عوام کی رائے عامہ کو انتہائی بھونڈے طریقے سے مسلمانوں کے خلاف کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن میری رائے میں اِس سے سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا کہ نوجوان اِن فلموں کو دیکھ کر انتہا پسندی کی طرف مزید راغب ہوئے اور آج انتہا پسندی اور دہشت گردی کی جس لہر نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اُس میں اِن جھوٹی فلموں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ کوئی ہے جو اِن کے ذمہ داروں کو سزا دے گا۔ جبکہ امریکی حکومت اپنی خفت چھپانے کے لئے یہ مؤقف دیتی ہے کہ انہوں نے جہادی ذہن رکھنے والے لوگوں کو پکڑنے کے لئے یہ ویڈیوز انٹرنیٹ پر ڈالی تھیں۔ غیر ذمہ داری کی کوئی حد ہوتی ہے۔ امریکہ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ القاعدہ طرز پر مجاہدین کے نام کا غلط استعمال کرتے ہوئے دہشت گردوں کو ہیرو کے طور پر پیش کریں اور نوجوانوں کو اِس نہ کھلنے والے جال میں پھنسائیں۔ (24)

یہی بیل پوٹینجر کمپنی عراقی میڈیا پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی رہی۔ ظلم کی حد یہ ہے کہ اِن فلموں کے ایڈیٹر مارٹن ویلز (Martin Wells) کے مطابق امریکی فوجی عراق میں جب گھروں پر چھاپے مارتے تھے وہاں یہ فلمیں خود ہی پھینک کر برآمد کرتے تھے (اور پھر شہادت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔) قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ Bell Potinger کو جنوبی افریقہ میں نسلی منافرت اور فسادات کو ہوا دینے کے جرم میں پبلک ریلیشنز اور کمیونیکیشن ایسوسی ایشن (Public Relations and Communication Association- PRCA) سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے چیف ایگزیکٹو جیمز ہینڈرسن (James Henderson) کو استعفیٰ دینا پڑ گیا ہے۔

امریکی کمانڈر جنرل ویزلی کلارک کا چشم کشا بیان:

جنرل کلارک (GENERAL WESLEY CLARK) نے امریکی خبر رساں ادارے CBS NEWS کو انٹرویو دیتے ہوئے عراق پر جنگ مسلط کرنے سے متعلق ایک چشم کشا بیان دیا۔ (25) یاد رہے کہ جنرل کلارک کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔ ایک فور سٹار والے امریکی ریٹائرڈ جنرل ہیں اور امریکہ کے 2004 والے صدارتی انتخابات میں بھی امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے نامزدگی کے لئے بڑے پُر امید تھے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن جارج ڈبلیو بش جونیئر، جان کیری کو ہرا کر دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ پھر 2009ء میں بارک حسین اوبامہ امریکی صدر بنے تو جان کیری اُس کی ٹیم کا حصہ بنے۔ جنرل کلارک کا بیان درج ذیل ہے:

CBS News

AMY GOODMAN: Do you see a replay in what happened in the lead-up to the war with Iraq - the allegations of the weapons of mass destruction, the media leaping onto the bandwagon?

GEN. WESLEY CLARK: Well, in a way. But, you know, history doesn't repeat itself exactly twice. What I did warn about when I testified in front of Congress in 2002, I said if you want to worry about a state, it shouldn't be Iraq, it should be Iran. But this government, our administration, wanted to worry about Iraq, not Iran.

I knew why, because I had been through the Pentagon right after 9/11. About ten days after 9/11, I went through the Pentagon and I saw Secretary Rumsfeld and Deputy Secretary Wolfowitz. I went downstairs just to say hello to some of the people on the Joint Staff who used to work for me, and one of the generals called me in. He said, "Sir, you've got to come in and talk to me a second." I said, "Well, you're too busy." He said, "No, no." He says, "We've made the decision we're going to war with Iraq." This was on or about the 20th of September. I said, "We're going to war with Iraq? Why?" He said, "I don't know." He said, "I guess they don't know what else to do." So I said, "Well, did they find some information connecting Saddam to al-Qaeda?" He said, "No, no." He says, "There's nothing new that way. They just made the decision to go to war with Iraq." He said, "I guess it's like we don't know what to do about terrorists, but we've got a good military and we can take down governments." And he said, "I guess if the only tool you have is a hammer, every problem has to look like a nail."

So I came back to see him a few weeks later, and by that time we were bombing in Afghanistan. I said, "Are we still going to war with Iraq?" And he said, "Oh, it's worse than that." He reached over on his desk. He picked up a piece of paper. And he said, "I just got this down from upstairs" - meaning the Secretary of Defense's office - "today." And he said, "This is a memo that describes how we're going to take out seven countries in five years, starting with Iraq, and then Syria, Lebanon, Libya, Somalia, Sudan and, finishing off, Iran." I said, "Is it classified?" He said, "Yes, sir."

ترجمہ:.....ایمی گڈمین کا سوال:۔کیا آپ ری پلے دیکھتے ہیں کہ عراق جنگ شروع ہونے سے پہلے جو کچھ ہوا؟(یعنی عراق پر) تباہ کن ہتھیاروں کے الزامات، میڈیا کا بھی اِس کھیل میں شامل ہوجانا، وغیرہ۔

جنرل کا جواب:.....ٹھیک ہے کسی حد تک۔لیکن آپ کو پتا ہے کہ تاریخ حقیقتاً اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔میں نے 2002ء میں کانگریس کے سامنے اپنی گواہی دی تھی اور خبردار کیا تھا کہ جس ریاست کے متعلق آپ کو پریشانی ہونی چاہیے وہ عراق میں ہونی چاہیے یا ایران میں ہونی چاہیے لیکن ہماری حکومت، ہماری انتظامیہ عراق کے متعلق پریشان تھی نا کہ ایران کے متعلق۔ مجھے پتا تھا کہ کیوں؟ کیونکہ میں 9/11 کے حادثے کے بعد پینٹاگون گیا تھا۔ 9/11 کے دس دن بعد

میں پینٹا گون گیا تھا اور سیکرٹری (دفاع) ڈونالڈ رمزفیلڈ Donald Rumsfeld اور ڈپٹی سیکرٹری (دفاع) پال وولفورٹز (Paul Wolfowitz) سے ملا تھا۔ (اس کے بعد) میں نیچے جائنٹ سٹاف کے لوگوں سے ملنے گیا جو میرے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک جنرل نے کہا کہ ''سر آپ کو یہاں آ کر میرے ساتھ کچھ لمحات کے لئے بات کرنا ہوگی۔'' میں نے کہا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ اُس نے کہا ''نہیں'' اُس نے مزید کہا ''ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم عراق کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں۔'' یہ بات 20 ستمبر 2001 کے قریب کی ہے۔ میں نے (سوالیہ انداز میں) کہا آپ عراق کے ساتھ جنگ کرنے جا رہے ہیں؟ کیوں؟ اُس نے کہا ''میں نہیں جانتا'' اُس نے مزید (کہا) ''میرا اندازہ ہے کہ وہ (پینٹا گون) نہیں جانتے کہ اور کیا کریں'' پھر میں نے کہا کہ اچھا ان کو کوئی ایسی اطلاع ملی ہے کہ صدام کو القاعدہ کے ساتھ جوڑ سکیں۔ اُس نے کہا ''نہیں نہیں'' اِس طرح کی تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انہوں نے (ویسے ہی) بس عراق کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ہم نہیں جانتے دہشت گردوں کے ساتھ کیسے نپٹیں گے لیکن ہمارے پاس ایک اچھی ملٹری ہے اور حکومتوں کو گرا سکتے ہیں۔'' ''میرا اندازہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ایک ہی اوزار ہو اور وہ ہتھوڑا ہو تو پھر مسئلے کو کیل کی طرح نظر آنا چاہیے'' پھر میں اُسے کئی ہفتے کے بعد ملنے آیا۔ اُس وقت تک ہم نے افغانستان پر بمباری شروع کر دی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا آپ اب بھی عراق پر حملے کرنے جا رہے ہیں؟ تو اُس کا جواب تھا کہ ''یہ (یعنی اب جو ہونے جا رہا ہے وہ) اُس سے بھی بُرا ہے'' پھر وہ اپنے ڈیسک پر گیا۔ اُس نے ایک کاغذ اُٹھایا اور کہا ''میں یہ (پیپر) آج اوپر (سیکرٹری دفاع کے دفتر) سے لے کر آیا ہوں''۔ یہ ایک میمو ہے جو کہ بتاتا ہے کہ ہم پانچ سالوں میں 7 ممالک کو ختم کریں گے۔ عراق سے شروع کریں گے، پھر شام، لبنان، لیبیا، صومالیہ، سوڈان اور ایران پر ختم کریں گے۔'' میں نے کہا کہ کیا یہ کلاسیفائڈ (Classified) (یعنی سیکرٹ ہے)۔ اُس نے کہا ''ہاں جناب'' (26)

برطانوی آرمی چیف کا حقیقت پر مبنی بیان:

برطانوی آرمی کے سربراہ چیف آف دی جنرل سٹاف جنرل سر رچرڈ ڈینیٹ General Sir Richard Dannatt نے برطانوی اخبار ڈیلی میل (Daily Mail) کو بتایا کہ برطانوی فوجیوں کو عراق سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہماری فوجوں کی موجودگی ملکی سیکیورٹی کے مسئلے کو مزید خراب کر رہی ہے۔

دراصل جارج بش نے ٹونی بلیئر کو جھوٹ کی بنیاد پر اپنے پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کے لئے بغیر کسی Exit Staetegy کے اِس جنگ میں دھکیل دیا۔ جس کا برطانوی وزیر خارجہ اور برطانوی جنرلوں کو احساس تھا لیکن برطانوی جنرل پاکستانی جنرلوں کی طرح نہیں۔ وہ اپنے سیاسی آقاؤں کے حکم کو مانتے ہیں۔ جنرل سر رچرڈ ڈینیٹ کے بیانات حسب ذیل ہیں:

General Sir Richard Dannatt's statement

"History will show that a vacuum was created and into the vacuum malign elements moved. The hope that we might have been able to get out of Iraq in 12, 18, 24 months after the initial start in 2003, has proved fallacious."

ترجمہ:..... ''تاریخ یہ بتائے گی کہ (عراق جنگ کی وجہ سے) ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اور اس خلا کی وجہ سے نقصان دہ عناصر داخل ہو گئے۔ ہماری یہ امید کہ ہم جنگ کی ابتدا سے 12، 18 یا 24 مہینے کے اندر عراق سے نکل جائیں گے۔ غلط

ثابت ہوئی۔''

"I don't say that the difficulties we are experiencing around the world are caused by our presence in Iraq, but undoubtedly our presence in Iraq exacerbates them."

ترجمہ:.....''میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں ہم جن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں وہ عراق میں ہماری موجودگی کی وجہ سے ہیں۔لیکن بلاشبہ عراق میں ہماری موجودگی اِن مشکلات میں اضافہ کر رہی ہے۔''(27)

تاریخ گواہ ہے کہ جب برطانیہ نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو اِس قبضے کے خلاف کئی تحریکیں اُٹھیں۔اِن آزادی کی تحریکوں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے پُرزور طریقے سے شمولیت اختیار کی۔انگریز نے چونکہ مسلمان بادشاہوں سے حکومت چھینی تھی۔اس لئے اُس کو ہمیشہ مسلمانوں سے ہی خطرہ رہا کہ یہ قوم جذبہ جہاد سے سرشار ہے اس لئے کبھی بھی اِس جذبے کے تحت مسلمان اُٹھ سکتا ہے۔لہٰذا 1857ء میں جنگ آزادی ہوئی لیکن وہ ناکام ہوگئی۔اِس ناکامی کے بعد مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کے بڑے جید علما کو مالٹا کے اندر جیل میں بند کر دیا۔گویا قیدِ تنہائی میں کوئی بھی اپنا نہیں، حتیٰ کہ زمین بھی اپنی نہیں۔اسی طرح آج بھی جنگی قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے اور برطانیہ کے شروع کیے ہوئے مظالم امریکہ کی گوانٹانا موبے (Guantanamo Bay) جیل میں اُسی کا تسلسل ہیں۔

''گوانٹانا موبے'' انسانیت پر بدنما داغ:

لہٰذا افغانستان اور عراق کی جنگ اور قبضے کے بعد امریکہ نے سیکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کو کیوبا کے اندر گوانٹانا موبے (Guantanamo Bay) کے قید خانوں اور پنجروں کے اندر پابند سلاسل کر دیا۔یہ جگہ امریکہ نے کیوبا سے کرائے پر لی ہوئی ہے اور یہاں امریکی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔بس فوج کے ذریعے زبردستی تشدد کے تحت بیانات اُگلوائے جاتے ہیں۔اور پھر ثبوت نہ ہونے کی بنا پر اِن بے قصور لوگوں کو اُن کے ممالک میں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔یاد رہے کہ اِن جنگوں کے دوران جتنے لوگ گرفتار ہوئے اِن کو جنگی قیدیوں کا سٹیٹس نہیں دیا گیا تھا۔نہ انسانی حقوق کی نام نہاد تنظیموں کو اس غیر اخلاقی و غیر قانونی کام پر اثر ہوتا ہے اور نہ ہی اقوام متحدہ کے کان پر جوں رینگتی ہے۔جب اعلیٰ سطح پر قانون کی حکمرانی (Rule of Law) نہیں ہوگا تو نچلی سطح پر اس کے عملدرآمد کی توقع کرنا ایک خام خیالی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔یعنی جس کا جو جی چاہے وہ کرتا رہے.....''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' والا جنگل کا قانون جاری وساری ہے۔

لاقانونیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہیومن رائٹس فرسٹ (Human Rights First) نامی تنظیم کی 23 مارچ 2017 کی لسٹ کے مطابق 780 قیدیوں میں سے صرف ایک قیدی کو امریکہ کے اندر کیس چلانے کے لئے منتقل کیا گیا۔باقی قیدیوں میں صدر بش کے دور میں 500 اور اوبامہ کے دور میں 242 قیدیوں کو بغیر چارج کئے چھوڑ دیا گیا اور اُن کو 59 مختلف ممالک میں واپس آنے کی اجازت دے دی۔جس میں برطانیہ، سعودی عرب اور پاکستان بھی شامل ہیں۔یاد رہے کہ صدر اوبامہ نے اپنی الیکشن مہم کے دوران وعدہ کیا تھا کہ وہ اس جیل کو بند کر دیں گے لیکن وہ صدر ہوتے ہوئے بھی CIA اور پینٹاگون کے ہاتھوں مجبور رہے اور الیکشن میں کیا گیا وعدہ پورا نہ کر سکے۔گوانٹانا موبے میں ایک قیدی کو رکھنے کے لئے تقریباً سالانہ 10 ملین ڈالر خرچ ہوتا ہے جبکہ امریکہ کے اندر اِس قیدی کو رکھنے کے لئے

صرف سالانہ 7800 روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اِس جیل کا سالانہ خرچ 445 ملین امریکی ڈالر ہے۔ اب اِس جیل میں تقریباً 41 کے قریب قیدی موجود ہیں۔ اتنا خرچ کرنے کے بعد کیا دنیا محفوظ ہوئی یا مزید غیر محفوظ۔؟(28)

ابوغریب جیل، عراق میں انسانیت سوز امریکی مظالم:

2003ء میں طاقت کے نشے میں چُور امریکہ نے عراق کے لوگوں کو صدام کے نام نہاد ''مظالم'' سے نجات دلانے اور عوام کو جمہوریت کا میٹھا پھل کھلانے کے لئے جب عراق پر قبضہ کیا تو ہزاروں بے قصور لوگوں کو صرف شک کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا اور یہ سلسلہ 2006ء تک جاری رہا۔ اُن کو گرفتار کر کے بغداد کے قریب تقریباً 1280 ایکڑ پر پھیلی ہوئی ابوغریب جیل میں ٹھونس دیا اور اُن پر امریکی افسران اور جونیئر سٹاف تعینات کر دیئے گئے۔(29)

ریکارڈ کے مطابق یہ قیدی تقریباً 4000 تھے۔ جبکہ گنجائش صرف 1500 کی تھی۔ لیکن مبصرین اور عراقی قیدیوں کا خیال ہے کہ آف دی ریکارڈ قیدی بہت زیادہ تھے۔ جن میں سے کئی مار دیئے گئے یا ان کو تشدد کے بعد ویران جگہ پر چھوڑ دیا گیا۔ جیل کے اندر مردوں کو ننگا کر کے ایک دوسرے کے اوپر پھینک دیا جاتا تھا پھر ان کے اوپر امریکی فوجی کودتے تھے، پھر اِن قیدیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ غیر انسانی فعل کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اوپر کتے کاٹنے کے لئے چھوڑے جاتے تھے۔ اُن قیدیوں کے گلوں میں کتے کا پٹا باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ پھر ظلم یہ کہ امریکی فوجی اُن کے ساتھ اپنے مختلف پوز بنوا کر تصویریں کھنچواتے تھے۔ قیدی خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ بجلی کی تاروں کے ساتھ جھٹکے لگائے جاتے اور تصویریں بنوائی جاتیں۔ اِن مظالم کی کئی تصاویر لیک ہوگئیں اور اِس انسانیت سوز امریکی فوج کے رویوں پر مغربی میڈیا چیخ اُٹھا۔ پہلے تو امریکی حکومت کے عہدیداروں نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن جب دباؤ بڑھا تو معاملہ امریکی سینٹ تک پہنچا تو پھر بیسیوں امریکی فوجی افسران بریگیڈیئر اور لیفٹیننٹ کرنل لیول تک کے لوگوں کی انکوائری ہوئی اور کچھ کو سزائیں بھی ہوئیں۔ اس انسانیت سوز واقعہ کی بازگشت امریکی سینٹ میں بھی سنی گئی اور میجر جنرل اینٹونیو تگوبا کے ذمے اس پورے واقعے کی تفتیش کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان کی رپورٹ مندرجہ ذیل ہے۔

April 30, 2004 - Maj. Gen. Antonio Taguba's report detailing his investigation of the 800th Military Police Brigade is released.

Taguba's report stated that the following abuses happened in this incident:

- Punching, slapping, and kicking detainees; jumping on their naked feet.
- Videotaping and photographing naked male and female detainees.
- Forcibly arranging detainees in various sexually explicit positions for photographing.
- Forcing detainees to remove their clothing and keeping them naked for several days at a time.
- Forcing naked male detainees to wear women's underwear.
- Forcing groups of male detainees to masturbate themselves while being photographed and videotaped.
- Arranging naked male detainees in a pile and then jumping on them.
- Positioning a naked detainee on a box, with a sandbag on his head, and attaching wires to his fingers, toes, and penis to simulate electric torture.

- Writing "I am a Rapist (sic)" on the leg of a detainee accused of rape, and then photographing him naked.

- Placing a dog chain or strap around a naked detainee's neck and having a female soldier pose for a picture.

- A male MP guard having sex with a female detainee.

- Using military working dogs (without muzzles) to intimidate and frighten detainees, and in at least one case biting and severely injuring a detainee.

- Taking photographs of dead Iraqi detainees.

لیبیا پر امریکی قبضہ سے پہلے اور بعد کی صورتِ حال:

لیبیا: افریقہ میں پانچ ممالک ایسے ہیں جو کہ بہت بڑی مقدار میں تیل پیدا کر رہے تھے۔ جن میں نائجیریا، انگولا، الجیریا، مصر اور لیبیا شامل ہیں۔ 2010ء میں صرف لیبیا 1650000 لاکھ بیرل تیل پیدا کر رہا تھا۔ 2014ء میں لیبیا کے باشندوں کو نام نہاد امریکہ کی ''انسانی حقوق'' دلانے کے لئے جنگ کی وجہ سے یہ پیداوار کم ہو کر ایک تہائی سے کم یعنی صرف 470000 بیرل رہ گئی۔ جبکہ 2015ء میں یہ پیداوار کم ہو کر 404000 بیرل سالانہ رہ گئی۔ لیبیا کے تیل کے ذخائر 48 بلین بیرل ہیں جو کہ افریقہ میں سب سے بڑے ہیں اور دنیا میں نویں نمبر پر ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستان میں تیل کی پیداوار 2015ء میں تقریباً 90,000 بیرل یومیہ رہی۔ جبکہ بین الاقوامی اداروں کے ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں 9 بلین بیرل پیٹرولیم تیل اور 105 ٹریلین مربع فٹ گیس کے ذخیرے موجود ہیں۔ سعودی عرب کے پاس 260 بلین بیرل تیل کے ذخائر ہیں اور وینزویلا کے بعد سعودی عرب اس لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔(30)

2004 میں قذافی کی کوششوں سے یورپین یونین کے طرز کی 53 افریقی ممالک پر مشتمل پین افریقن پارلیمنٹ تشکیل دی۔ 2009ء میں صدر قذافی نے اِن ممالک کو امریکہ کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے ایک منصوبہ دیا اور اُس کے لئے خطیر رقم بھی دی کہ افریقی ممالک کو اکٹھا کیا جائے جن کی کرنسی سونے کا دینار ہوگی۔ 2023 تک (EURO) یورو کی طرح کا افریقی سونے کا سکہ متعارف کروا دیا جائیگا۔ یاد رہے لیبیا کے پاس 143 ٹن سونا تھا وہ امریکی حملے کے بعد کہاں گیا؟(31)

فرانس کے صدر نکولس سرکوزی (Nicolas Sarkozy) نے بھی لیبیا میں قذافی حکومت کے بارے میں بیان دیا:

Libya (is) a Threat to the Financial Security of mankind.

ترجمہ: ''لیبیا بنی نوع انسان کے مالی تحفظ کے لئے خطرہ ہے۔''(32)

فرانس کے صدر کے بیان کو امریکہ اور یورپ نے انتہائی منفی طور پر لیا تھا کہ اس سے مغرب کا منصوبہ ظاہر ہو گیا کہ یہ اپنی مالی برتری کا جھگڑا ہے نہ کہ لیبیا کے باشندوں کیلئے نام نہاد انسانی حقوق کی جنگ ہے۔

صدر قذافی نے امریکی حملوں سے پہلے سونے کا دینار جاری کر دیا تھا۔ افریقی ممالک کی منزل یہ تھی کہ افریقی تیل خریدنے کے لئے صرف اور صرف افریقی سونے کی کرنسی ہی استعمال ہوگی۔ ظاہر ہے کہ گلوبلائزیشن کے ٹھیکیداروں، استعماریت کے معماروں اور سرمایہ داری نظام کے موجدوں کو کسی خطے کی آزادی کس طرح قبول ہوتی۔

اس سے پہلے عرب ممالک کے اتحاد اور تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے رویئے پر سعودی فرمانروا شاہ فیصل کے ساتھ کیا سلوک ہوا یعنی اپنے ہی بھتیجے سے مروا دیا۔ اور 1970ء میں امریکہ نے اپنی مرضی سے تیل خریدنے کی کرنسی Petrodollar رکھ دی۔ جس سے امریکی ڈالر کی اہمیت بڑھی اور قیمت میں اضافہ ہوا اور تیل پیدا کرنے والے ذخیروں کے مالک امریکہ کے محتاج ہو گئے۔ مسلمان ممالک بشمول لیبیا تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ہیں۔ دنیا کا دو تہائی تیل صرف مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہے۔ ناقدین کے مطابق لیبیا کو تباہ کرنے کا اصل محرک اُس میں تیل کے ذخائر ہیں۔ وگرنہ لیبیا کے لوگ امن اور سکون سے رہ رہے تھے۔ کوئی دہشت گرد گروپ وہاں موجود نہیں تھا۔ برطانوی اخبار ''گارڈین'' کے مطابق مغربی ممالک کے حملوں کے بعد لیبیا میں 40% نوجوان بے روزگار ہیں اور تقریباً ساڑھے تین لاکھ نوجوان انتہا پسندوں کے ساتھ ہیں۔ امریکی قبضے کے بعد اب 30 سے زیادہ گروپ دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ مانچسٹر میں ایک موسیقی کی محفل میں دھماکہ کرنے والا سلیمان عبیدی بھی لیبیا کا ایک مہاجر نوجوان تھا اور اس حادثہ سے تین ہفتے قبل لیبیا میں اپنے والدین کے پاس رہ کر واپس آیا تھا۔ اس کے والدین قذافی مخالف قوتوں کے ساتھ تھے اور برطانیہ میں پناہ گزین کے طور پر رہے۔ قذافی حکومت کے خاتمے کے بعد وہ لیبیا واپس چلے گئے ان کو یہ اندازہ قطعاً نہیں تھا کہ قذافی حکومت کے خاتمے کی آڑ میں ان کے ملک کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا لہٰذا کئی لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ سلیمان عبیدی نے دھماکہ کر کے دہشت گردی کی یا اپنے ملک کی بربادی کا انتقام لیا۔ (64) جبکہ لیبیا میں نہ جمہوری نہ سیاسی اور نہ کوئی معاشی نظام ہے۔ عرب اور مسلم ممالک کے ساتھ اقوامِ متحدہ جیسا ادارہ بھی آگ لگے ہوئے ملک کا باہر کھڑے تماشہ دیکھ رہا ہے۔

لیبیا میں مغربی ممالک کی انسانی بنیادوں پر مداخلت (Humanitarian Intervention) کا خمیازہ آج پوری دنیا دہشت گردی کی ایک نئی لہر کی شکل میں بھگت رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے لیبیا کو اسلحہ پہنچانے پر پابندی تھی۔ لیکن امریکہ نے وہاں باغیوں کو اسلحہ پہنچایا۔ نیٹو کے سابقہ امریکی کمانڈر جنرل ویزلی کلارک (Wesley Clark) کا CBS News کی ایمی گڈمین (Amy Goodman) کو پینٹا گون (Pentagon) کے حوالے سے انٹرویو اقوامِ متحدہ کو گہری نیند سے اُٹھانے کے لئے کافی ہونا چاہیے تھا مگر ہائے افسوس۔

شام میں شامِ غریباں:

اقوامِ متحدہ اور اُمت مسلم کی زبوں حالی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا ابھی افغانستان، عراق اور لیبیا میں قتلِ عام، تباہی و بربادی، وسائل و ذخائر پر بیرونی کنٹرول کے صدمے سے دوچار تھی اور سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کہ امریکہ بہادر نے ایک نئی جنگ کا آغاز شام میں کر دیا اور بدقسمتی یہ ہے کہ عالم اسلام میں اس کو سنی، شیعہ قضیے کی نظر سے دیکھا گیا جبکہ کچھ اقوام تو اپنے مقاصد اور منازل جو کہ پہلے سے طے ہیں، حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اِس کا آغاز مارچ 2011ء میں اُس وقت ہوا جب شام کے ایک شہر ''درعا'' میں کچھ نوجوانوں نے دیواروں پر سیاسی آزادی کے لیے کچھ نعرے لکھے۔ جس کا بشار الاسد کی حکومت نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ لیکن ساتھ اپنے اس منصوبے کا اعلان کیا کہ اسد حکومت آہستہ آہستہ ملک سے ایمرجنسی ختم کر دے گی اور نئی سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دے گی۔ اس کے بعد اپریل 2011ء میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ''پُرامن'' مظاہروں کی اجازت دی گئی۔ گویا کہ صورتِ حال

بہتری کی طرف بڑھنے کی توقع نظر آنے لگی۔لیکن امریکہ نے فوراً مئی 2011ء میں اسد اور اُن کے چھ ساتھیوں کے خلاف پابندیاں لگا دیں۔امریکی محکمہ خزانہ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا:.....(33)

"As a result of this action, any property in the United States or in the possession or control of US persons in which the individuals listed in the Annex have an interest is blocked, and US persons are generally prohibited from engaging in transactions with them."

ترجمہ:.....''اس ایکشن کے نتیجے میں امریکہ میں ہر وہ جائیداد جو کہ امریکی افراد یا کوئی اور افراد جو کہ لسٹ (جو امریکی محکمہ خزانہ نے تیار کی ہے) میں موجود ہیں کا قبضہ ہو یا کنٹرول ہو تو اُس پر پابندی لگا دی گئی ہے اور عام طور پر امریکی افراد کو (ایسے افراد سے) لین دین کرنے پر (بھی) پابندی ہے۔''(34)

پھر اگست 2011ء میں امریکہ نے شام پر معاشی پابندیاں عائد کر دیں۔یعنی امریکہ کے اندر شام کے اثاثے منجمد کر دیئے اور دیگر پابندیوں کے علاوہ تیل کی خرید و فروخت پر بھی پابندی عائد کر دی۔پھر امریکہ بہادر کے ''ہم زلف'' یورپین یونین نے بھی تیل کی درآمد پر پابندی لگا دی۔گویا کہ ایک ماحول پیدا کیا جا رہا تھا اور اقوام متحدہ نے عراق اور لیبیا کی جنگوں سے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور خوابِ خرگوش میں محو رہی اور ایک آزاد ملک کے معاملات میں مداخلت ہوتی رہی تا کہ وہاں کے حالات میں ایک انارکی پیدا کی جائے۔(35)

پھر اکتوبر 2011ء میں ایک گروپ شام کی قومی کونسل (Syrian Nantional Council) سے بنوایا گیا کہ شام میں جمہوری حکومت لائی جائے گی۔(یعنی عراق، لیبیا، مصر اور گلف میں جمہوری حکومتیں قائم ہو چکی تھیں گویا اب بیچاری شامی عوام ہی جمہوریت کے ''خوشبودار'' پھل سے محروم تھی) یہ ہے آغاز اِس پوری تحریک کا۔اکتوبر 2011ء اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں اسد کے خلاف پیش کردہ قرارداد کو چائنا اور روس نے ویٹو کیا لیکن اِس کے باوجود یہ غاصبانہ عمل کا تسلسل رُک نہ سکا۔پھر عرب لیگ کو نومبر 2011ء میں سامنے لایا گیا اور شام کی رکنیت کو معطل کر دیا گیا پھر عرب وزرائے خارجہ اور ترکی بھی شام کے خلاف جنگ میں شریک ہو گئے۔ترکی کو اس جنگ میں دھکیل کر کثیر المقاصد پلان کو آگے بڑھایا گیا جس میں ترکی کے اندر مہاجرین اور مہاجرین کی شکل میں دہشت گردوں کا داخلہ ہے۔جس کا خمیازہ ترکی کی آنے والی نسلیں بھگتیں گی۔

یہاں ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہوں گا کہ ترکی کی سرحدوں پر شام کے مہاجرین کی تعداد 25 لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے جبکہ ترکی میں مہاجرین کے کیمپ صرف دو لاکھ کے قریب لوگوں کو سہولت مہیا کر سکتے ہیں۔سخت سردی کے موسم میں بے یار و مددگار لوگ نفسیاتی مریض بن رہے ہیں۔خطرہ یہ ہے کہ جس طرح پاکستان نے ہمدردی کر کے اپنے افغان بہن بھائیوں کی تیس لاکھ کے قریب تعداد کو اپنے ملک میں پناہ دی تھی جس کی وجہ سے ملک میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوا اس طرح ایک بین الاقوامی سازش کے تحت ترکی کو بھی پریشان کیا جائے گا اور اندر ہی اندر مختلف سازشوں کے ذریعے حکومت اور ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ شامی مہاجرین کی بیرون ملک کل تعداد 50 لاکھ ہے۔اس کے علاوہ شام کے اندر کیمپوں میں رہنے والوں کی تعداد تقریباً 65 لاکھ کے قریب ہے۔یہ دونوں اعداد ملا کر 13.5 ملین لوگ بنتے ہیں جبکہ شام کی کل آبادی (22 ملین) کا نصف اس وقت مہاجرین کی زندگی گزار رہا ہے۔ذمہ دار کون ہے۔؟ کیا اقوامِ متحدہ کوئی ایکشن لے گی؟(36)

فروری 2012ء میں اسد حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق نئی سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دینے کیلئے آئینی ترامیم پر ریفرنڈم کروایا۔ نومبر 2012ء میں جب دیکھا گیا کہ اسد حکومت عوام کو ریلیف دینا شروع ہوگئی ہے تو قومی کونسل شام کو ایک نئی جہت دی گئی اور اُس کو نیا نام National Council for Syrian Revolution and Opposition Forces) ''شام کی انقلابی اور اپوزیشن افواج کی قومی کونسل'' رکھا گیا۔(37)

یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں داعش (ISIS) کی بنیاد رکھ دی۔ انہی لوگوں کو امریکہ اور برطانیہ نے حربی ٹریننگ دی جو کہ ریکارڈ کا حصہ ہے۔ یعنی صدر اوبامہ نے اپنے بیان میں کہا کہ:

"We are speeding up training of ISIL forces."

ترجمہ:.....ہم داعش افواج کی تربیت کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔(38)

امریکی سینیٹر رینڈ پال نے کہا کہ:

"Most of these people do not have the sophistication to make arms so they get the arms from other folks.....We have been allies with ISIS in Syria."

ترجمہ:.....''امریکی سینیٹر رینڈ پال نے کہا کہ ''اِن (داعش) کے زیادہ لوگ اتنی مہارت نہیں رکھتے کہ (اس طرح کا اسلحہ جو وہ استعمال کر رہے ہیں) اسلحہ بنا سکیں۔ لہٰذا وہ دوسرے لوگوں (یعنی ہم) سے لیتے ہیں .....ہم شام میں داعش کے پارٹنر ہیں۔''

اور سینیٹر پال مزید کہتے ہیں کہ:

And "U.S. intervention in Libya strengthened ISIL"

ترجمہ: اور یہ کہ ''امریکہ کی لیبیا کے اندر (ناجائز) مداخلت نے داعش کو مضبوط کیا ہے۔''(39)

اس طرح کے بیانات امریکی صدر رونالڈ ریگن بھی روس کے خلاف افغان جہاد کے وقت مجاہدین سے ملاقات کے وقت دے چکے ہیں۔ ''مجاہدین آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لئے خصوصی اعزاز کی بات ہے کہ ہم آج اُن کے (مجاہدین) لیڈروں کے درمیان موجود ہیں..... یہ ہمارے آباؤاجداد کے برابر کے لوگ ہیں۔ یہ آزادی کی جنگ لڑنے والے ہمارے بھائی ہیں اور یہ اُن کا حق ہے کہ ہم اُن کی مدد کریں۔'' اگرچہ بعد میں ان بیانات سے انحراف کرلیا گیا۔ کیونکہ لفظ ''جہاد'' کو ''دہشت گردی'' سے تبدیل کرلیا گیا۔

اس موقع پر ہمیں رابن کک سابق برطانوی وزیر خارجہ کی قبر کا کتبہ یاد پڑتا ہے۔

پھر 2013ء میں وہی فلم چلائی گئی جو کہ عراق کے خلاف 2003ء میں چلائی گئی تھی کہ اسد حکومت نے کیمیکل ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ یہ سب حربے صرف شام پر حملے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ لیکن ''واللہ خیر الماکرین'' کے مصداق برطانوی حکومت کی طرف سے پارلیمنٹ کے اندر شام پر حملے کے حق میں پیش کی گئی قرارداد پاس نہ ہوسکی۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے کسی غیر یورپی ملک سے متعلق خارجہ پالیسی پر پیش کردہ قرارداد ناکام ہوگئی۔ اور پھر اسد حکومت کی قسمت بدل گئی اور اُس نے روس کی حمایت سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بیرونی طاقتوں کی سرپرستی سے دہشت گردوں نے ہماری عوام کے خلاف غیر انسانی، غیر قانونی اور بیہیمانہ کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں لہٰذا ہماری جوابی کارروائی دہشت گردی کے خلاف جنگ War on Terror جاری رہے گی۔ گویا کہ شام کے بشارالاسد

نے امریکی دوا امریکیوں کو ہی بیچنی شروع کر دی۔ 15-2014ء میں روس کافی حد تک سامنے آ کر شام کی فوجی حمایت میں لگ گیا۔ پھر روس ہی کی مدد سے 2016ء میں ایلیپو (Aleppo) جیسے شہر کو مزاحمت کاروں کے چار سالہ قبضے سے آزاد کروایا گیا۔ اب 2017ء میں تقریباً پورا شام بشار الاسد کی حکومت کے کنٹرول میں ہے۔

2017ء میں خان شیخون میں ایک اور کیمیکل گیس سے اموات ہونے کا حادثہ ہوتا ہے۔ جس کے متعلق روسی وزارتِ دفاع کا کہنا تھا کہ کیمیکل اسلحہ باغیوں کے پاس تھا مگر ان پر ہماری بمباری ہوئی تو یہ پھٹا اور یہ حادثہ رونما ہوا۔ گویا کہ انہوں نے اسد حکومت کو بے قصور قرار دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان باغیوں کو کیمیکل ہتھیار کس نے فراہم کیے؟ اس کے بعد اپریل 2017ء میں امریکہ بغیر اقوامِ متحدہ کی کسی قرارداد کے صرف ڈونالڈ ٹرمپ کے حکم پر شام پر 59 ٹاما ہاک کروز میزائل (Tomahawk Cruise Missile) پھینکتا ہے۔ کوئی بین الاقوامی ادارہ پوچھنے والا نہیں کہ ایسا کیسے اور کیوں ہوا۔؟ ایسی حرکات سے امریکہ کی اخلاقی قدر و قیمت بیرونی دنیا میں کم ہو رہی ہے لہٰذا عوام اور خواص کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایران اور برطانیہ کی شراکت داری:

آیئے اب ایک نظر مشرقِ وسطیٰ میں ایران اور سعودی عرب کے آمنے سامنے کی تازہ ترین صورت حال پر ڈالتے ہیں اور آنے والے حالات کی ایک ممکنہ منظر کشی کی کوشش کرتے ہیں جو میں نے چند سال قبل ایک انٹرویو میں پیش کی تھی۔

دنیائے سیاست میں کچھ بھی مستقل نہیں ہوتا خاص کر جب بات بین الاقوامی سیاست کی ہو، صدیوں کے پرانے دوست پل بھر میں دشمن اور پل بھر میں دوست بن جاتے ہیں، ایسا ہی کچھ معاملہ حالیہ دنوں میں ایران سعودی عریبہ اور مغربی قوتوں کے مابین پیش آیا۔ جب برطانیہ نے تیس سال کے طویل وقفے کے بعد ایران کے لئے اپنا سفارتخانہ دوبارہ کھولنے کا اعلان کیا۔ سابق برطانوی وزیر خارجہ ولیم ہیگ William Hague کے مطابق یہ ایسے اقدام کا نہایت موزوں وقت تھا، مزید برآں سابق برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون (David Cameron) کے مطابق عراق میں بڑھتا ہوا فساد برطانیہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ جس کے پیش نظر کٹھن اور دشوار فیصلے لینا پڑ سکتے ہیں۔ برطانیہ کا یہ اعلان بہت سے لوگوں کے لئے حیرانی کا باعث تو بنا لیکن وہ لوگ جو بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے ایسا فیصلہ حیرانی کا موجب نہیں ہے، اس تبدیلی کے اثرات اس وقت جنم لینا شروع ہوئے جب خلیجی ممالک بالخصوص سعودی عرب نے مغربی قوتوں کے ساتھ ملکر شام میں اسد مخالف تنظیموں کو اسلحہ اور مالی وسائل فراہم کرنا شروع کیے۔ اب جبکہ یہی گروپ اور تنظیمیں عراق میں اسی پیسے کی مدد سے اپنے پاؤں جمانے میں مصروف ہیں، جبکہ مغربی میڈیا اور سیاست دان اسے اسلامی فساد کا رنگ دے رہے ہیں۔ میڈیا اور مغرب دنیا کو یہ باور کرانے سے قاصر ہیں کہ یہی داعش (ISIS) جو کہ اس فساد کا باعث بنا، ایک اقلیتی گروپ ہے جس میں اکثریت سلفی نظریات کے حامیوں کی ہے نہ کہ سنی (فقہ حنفی، مالکیہ، شوافع) مکتبہ فکر کے لوگوں کی ہے۔ اور یہ وہی گروپ ہے جسے مغرب نے میڈیا اور مالی وسائل کے ذریعے پروان چڑھا کر کئی برس تک شام کی اسد مخالف انقلابی قوت کے طور پر پیش کیا۔ اس تمام معاملے میں غور طلب بات یہ ہے کہ آخر کب اور کیوں ایران جسے مغرب بدی کا مرکز (axis of evil) مانتا ہے ایک دوست یا ساتھی کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس سوال کا جواب نہایت سادہ اور آسان ہے۔ ایران کا ایک شیعہ ریاست ہونا جو کہ سعودی عرب اور اس کی مخصوص

مذہبی سوچ کا سب سے بڑا مخالف ہے، اس دوستی یا مغربی سوچ میں تبدیلی کا باعث بنا۔ یہی وجہ تھی کہ ایران اس سلفی مخالف جنگ کا قدرتی ساتھی ثابت ہوا۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر داعش (ISIS) کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے، ISIS (Islamic State of Iraq and Syria) کا مخفف ہے، جو کہ ایک مخصوص نظریات کی حامل تنظیم ہے اور مشرق وسطیٰ میں اپنے نظریات کی حامل ریاست کے قیام کے مقصد سے شام میں معرض وجود میں آئی۔ آئی سس اسلامک سٹیٹ اینڈ لیونت (ISIL) کے نام سے بھی جانی جاتی رہی ہے جہاں لیونت سے مراد لبنان، اسرائیل، اردن، ترکی، شام اور قبرص ہیں۔ آئی سس کی ابتدائی فنڈنگ یورپ۔ امریکہ، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک سے کی گئی جس کا اولین مقصد شام میں بشارالاسد کی شیعہ علوی حکومت گرانا تھا، لیکن شاید مغرب کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے یہ فنڈز ان کے اپنے مفادات کے برعکس استعمال ہوں گے۔ اور یہ تنظیم آگے جا کر عراق میں ان کے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دے گی، جو کہ اب ایسا ہو چکا ہے۔

داعش کے مالی ذخائر

کچھ باخبر حلقے یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ امریکہ نے جان بوجھ کر شیعہ اثر ورسوخ کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے کچھ عرب ممالک کے تعاون سے القاعدہ کی طرح داعش کو پروان چڑھایا تا کہ اسلامی دہشت گردی کا خوف پھیلا کر اپنی پسندیدہ حکومتوں کے ذریعے پٹرولیم وسائل اور ذخائر پر قبضہ کیا جائے۔ بی بی سی (BBC) کے مطابق ISIS کے مالی ذخائر 2 ارب امریکی ڈالر کے قریب ہیں۔ داعش سے تیل کون خرید رہا ہے۔(40)

ایران اور امریکہ کی شراکت داری

موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ایران نے حال ہی میں مغرب کو ISIS کے خلاف لڑنے میں مدد فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ مغربی قوتوں نے اس پیشکش کو کھلے دل سے قبول کر لیا ہے، اور برطانیہ کا ایران میں طویل عرصہ بعد اپنا سفارتخانہ دوبارہ کھولنا شاید اسی جانب ایک قدم ہے، لیکن یہاں پر ایران کو نہایت سوچ سمجھ کر اس معاملے میں آگے بڑھنا ہوگا، اور اس کی بڑی وجہ امریکہ کا ماضی ہے۔ کیونکہ امریکہ نے ماضی میں جب بھی کسی مسلمان ملک کے ساتھ جنگی مقاصد کی غرض سے شراکت داری کی اس ملک کو سوائے تباہی کے کچھ نصیب نہ ہوا۔ اور شاید اب کی باری ایران کی ہے جس کے ساتھ امریکہ استعمال کرو اور پھینک دو (USE AND DISPOSE) والا معاملہ برتے گا۔

یہاں پر ایران کو یہ بات ملحوظ خاطر رکھنا ہوگی کہ جب بھی امریکہ اور برطانیہ نے گذشتہ دہائیوں میں کئی ممالک میں امن کے قیام کی غرض سے چڑھائی کی، ان ممالک کے عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور ان کے نصیب میں بے چارگی، افلاس اور بدامنی کے علاوہ کچھ نہیں آیا، کیونکہ امریکہ نے جنگ کے بعد عوامی مسائل کے حل کے لیے کوئی حکمت عملی ترتیب نہیں دی۔ حالیہ عراق میں ہونے والی شدت پسندی اس بات کی عکاس ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان اور لیبیا کی مثالیں ہم سب کے سامنے ہیں۔ اور اگر اس مرتبہ ایران بھی عراق کی طرح دلدل میں پھنس گیا تو اس کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچے گا اور شاید اس کا حال بھی عراق اور لیبیا سے مختلف نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ ایران کا عراق میں براہ راست کردار سعودی عرب اپنے اوپر ایک حملہ تصور کرے گا، جس کے خطے اور بالخصوص ایران کے لیے منفی اثرات سامنے آ سکتے

ہیں۔اس لیے ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ امت مسلمہ کی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ فلسطین اور مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہوجائے۔لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اس امن کی قیمت ادا کر کے اسے خرید لیں۔

روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی اور اقوام عالم کی بے حسی و بے بسی

ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً 13 لاکھ کے قریب روہنگیا مسلمان میانمار (برما) کے علاقے راخائن میں صدیوں سے نسل در نسل رہ رہے ہیں۔ جب برطانوی راج کا سورج غروب ہونا شروع ہوا تو برما کی آزادی کے وقت راخائن کی ریاست کو بھی برما کے حوالے کر دیا گیا۔حالانکہ برطانوی راج نے جب برصغیر پر قبضہ کیا تھا تو راخائن ایک آزاد مسلمان ریاست تھی۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت بنگالی زبان بولتے ہیں اور بنگالیوں ہی کی شکل وصورت والے ہیں۔آزادی کے بعد برما کے بدھسٹوں نے اِن مسلمانوں کو دِل سے قبول نہ کیا اور متعدد بین الاقوامی اور آزاد اداروں کی رپورٹ کے مطابق روہنگی مسلمانوں کے خلاف متعصّبانہ رویہ رکھا۔اُن کے لئے شہریت حاصل کرنا ناممکن بنا دیا گیا۔نوکری اور کاروبار کے دروازے تنگ کر دیئے گئے۔اُن کی آزادانہ نقل وحرکت پر بھی پابندی ہے۔ہسپتال اور سکول جیسی بنیادی سہولتوں پر بھی پابندی ہے۔پچھلی کچھ دہائیوں سے آرمی نے اُن کی ایک منظم طریقے سے نسل کشی شروع کی ہوئی ہے۔

اگر شام کی عوام پر بشارالاسد کا ظلم امریکہ کو نظر آتا ہے اور اس وجہ سے بمباری کی گئی تو میانمار میں آنگ سن سوشی کی زیرِ حکومت ہزاروں مسلمان مرتے نظر نہیں آتے۔؟ کیا سعودی عرب کی قیادت میں 41 ممالک کا فوجی اتحاد یا عرب لیگ یا اسلامی تعاون کی تنظیم (OIC) اس پر کوئی ایکشن نہیں لے سکتی تھی؟ جس طرح لیبیا، عراق اور شام میں ''انسانی حقوق کے تحفظ'' کے نام پر یکطرفہ کارروائی کی گئی۔کیا مسلمان حضور ﷺ کی جسدِ واحد والی حدیث مبارکہ بھول چکے تھے۔اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ۔وحدت والا اسلامی کا تصور کہاں گیا؟

نوبل انعام یافتہ آنگ سن سوشی (Aung San Suu Kyi)2011ء میں برما کی فوجی حکومت کی قید سے آزاد ہوکر ملک کی سربراہ بنی۔اِن کو نوبیل پرائز کے علاوہ بھی آٹھ اور انعامات یا اعزازات مل چکے ہیں۔جو کہ اُن کو انسانی حقوق کے حوالے سے برما کی فوجی ڈکٹیٹر حکومت کے خلاف ڈٹ جانے کی وجہ سے ملے جس میں امریکہ کے دو ایوارڈ ہیومن رائٹس پر ملے تھے۔اور یوپین پارلیمنٹ کی جانب سے بھی سوچ کی آزادی (Freedom of Thought) پر انعام ملا۔لیکن مس سوشی کی حکومت بننے کے فوراً بعد 2012ء میں مسلمانوں کے خلاف نسل کشی کی کارروائیوں میں اضافہ ہوگیا۔لہٰذا تقریباً چار لاکھ روہنگیا مسلمانوں کی نقل مکانی وہجرت ان کے بچوں کو مار کر، عورتوں اور جوانوں کو مار کر نسل کشی اور بستیوں کی بستیوں کو جلانے پر (جب کوئی بستی جلائی جاتی ہے تو ہندوؤں کے گھر محفوظ رہتے ہیں صرف مسلمانوں کے گھر جلتے ہیں) مس سوشی کی معنیٰ خیز خاموشی نے پوری دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔اور ان کے خلاف ایک منظم تحریک چل رہی ہے کہ انہیں نوبیل پرائز، یورپین ایوارڈ وغیرہ انسانی حقوق کے حوالے سے اعزازات واپس لے کر دنیا کو پیغام دیا جائے کہ اِن انعامات واعزازات کی واقعی کوئی وقعت ہے۔

بین الاقوامی برادری نے پوری دنیا میں مظاہرے کیے ہیں اور مقتدر اداروں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے لہٰذا برطانوی پارلیمنٹ، یورپین پارلیمنٹ کے علاوہ کئی پارلیمان میں بھی باقاعدہ آوازیں اُٹھائی گئیں کہ اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل کو اِس پر نا صرف سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرنا چاہیے بلکہ روہنگیا مسلمانوں کی واپس میانمار میں آبادکاری کا بھی

ایک مستقل اور منظم لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔لہٰذا اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انٹونیو گٹیریس (Antonio Guterres) نے برمی حکومت کو خبردار کیا کہ ملٹری آپریشن ختم کیا جائے اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو امدادی سامان پہنچانے دیا جائے (یادرہے کہ راخائن پر اقوام متحدہ کی ایک ایڈوائزری کمیٹی کوفی عنان کی سربراہی میں بنی ہوئی ہے)سیکرٹری جنرل کے بیان کا کچھ حصہ نیچے دیا گیا ہے۔اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے 13 ستمبر کو اپنے اجلاس میں روہنگیا مسلمانوں کے خلاف تشدد کی مذمت کی ہے اور برمی حکومت کے اس وحشت ناک عمل کو نسل کشی کے مترادف قرار دیا۔

روہنگیا مہاجرین سڑکوں، دریاؤں اور جنگلوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں کہ واپس میانمار آتے ہیں تو جان خطرے میں ہے آگے بنگلا دیش وغیرہ ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اقوام متحدہ کی امداد کو جان بوجھ کر برمی حکومت سڑکوں پر روک رہی ہے۔نہ ہی بھارت کی حکومت انسانی بنیادوں پر روہنگیا کے بے یارومددگار لوگوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔(UNITED NATIONS HIGH COMMISSIONER FOR REFUGEES UNHCR)ملیشیا میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین کے مطابق اگست کے اواخر تک ایک لاکھ انچاس ہزار میانمار کے مہاجرین نے خود کو ان کے ساتھ رجسٹرڈ کیا ہے۔

UNHCR کے مطابق 2015ء تک پوری دنیا میں بدامنی کے بحران کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں کی تعداد تقریباً 65 ملین تھی۔جن میں سے 21 ملین مہاجرین تھے اور 40 ملین ملک کے اندر ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر ادھر ادھر بس گئے اور (IDPS(INTERNALLY DISPLACED PEOPLE کہلائے تقریباً 32 ملین لوگ سیاسی پناہ لینے پر مجبور ہوئے،صرف شام میں امریکی مداخلت کی وجہ سے تقریباً 5 ملین لوگ پناہ گزین بن گئے۔

سیکرٹری جنرل (António Guterres) کا بیان:

The secretary-general called on Burma's authorities "to suspend military action, end the violence, uphold the rule of law, and recognise the right of return of all those who had to leave the country."

ترجمہ:.....ملٹری آپریشن کو روکا جائے تشدد ختم کیا جائے،قانون کی حکمرانی قائم کی جائے اور جن لوگوں کو ملک چھوڑ کر جانا پڑا اُن کی (برما) واپسی کے حق کو تسلیم کیا جائے۔

سیکورٹی کونسل کے ممبران نے اپنے بیان میں کہا:

Council members in the statement "expressed concern about reports of excessive violence during the security operations and called for immediate steps to end the violence in Rakhine, de-escalate the situation, re-establish law and order, ensure the protection of civilians, restore normal socio-economic conditions, and resolve the refugee problem."

ترجمہ:(اپنے بیان میں) سیکورٹی آپریشنز کے دوران ضرورت سے زیادہ تشدد کے استعمال پر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔اور راخائن میں تشدد کے خاتمے کے لئے فوراً اقدمات اُٹھانے کا کہا۔(مزید یہ کہ) صورتِ حال کو واپس لایا جائے۔قانون کی حکمرانی کو دوبارہ قائم کیا جائے۔معاشی،معاشرتی صورت حال کو معمول پر لایا جائے اور پناہ گزینوں کے مسئلے کو حل کیا جائے۔''

The Security Council also urged the government to implement the recommendations of a commission led by former UN secretary-general Kofi Annan calling for economic development and social justice to counter deadly violence between Buddhists and Muslims in Rakhine state.

ترجمہ:.....سیکورٹی کونسل نے برما کی حکومت پر زور دیا کہ کوفی عنان کی سربراہی میں بنائے گئے کمیشن کی سفارشات پر عمل کیا جائے۔(یعنی) راخائن کی ریاست میں مسلمانوں اور بدھ متوں کے درمیان مار دینے والی شدت پسندی کا مقابلہ کرنے کے لئے معاشی ترقی اور معاشرتی انصاف قائم کیا جائے۔''

برما کی حکومتی سربراہ مس سوشی نے شرمندگی اور خفگی کی وجہ سے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں جانا ملتوی کر دیا۔کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بین الاقوامی برادری کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ نہیں بلکہ روہنگیا کے لوگوں کے ساتھ ہیں۔اِس بات کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کونسل کے تمام ممبران بشمول چائنا اِس بات پر متفق ہوئے کہ برما کی حکومت اور آرمی کو بالکل واضح پیغام بھیجا جانا چاہیے۔برطانیہ نے برما کے خلاف سیکورٹی کونسل کا بیان لکھنے کی ذمہ داری نبھائی۔اس کے علاوہ برطانوی وزیراعظم ٹرسیامے(Theresa may) نے کہا اُن کی وزارتِ دفاع نے برما کے ساتھ اپنی مصروفیات اور آرمی کی ٹریننگ روک دی ہیں۔

کنیڈا کے وزیراعظم جسٹن ٹروڈو(Justin Trudeau) کا مذمتی بیان

کنیڈا کے وزیراعظم جسٹن ٹروڈو(Justin Trudeau) نے ذاتی طور پر مس سوشی کو فون کر کے صورتِ حال کی نزاکت سے خبردار کیا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔اور 18 ستمبر کو پورے دو صفحات پر مشتمل ایک سخت خط لکھا جو کہ کسی بھی سربراہِ مملکت کی طرف سے انتہائی منفرد نوعیت کا خط ہے۔اُن کے خط کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔

''میرے لیے یہ بات انتہائی حیرانی، مایوسی اور صدمے کی بات ہے کہ آپ کے دوسرے کنیڈین شہریوں نے روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم پر آپ کو خاموش دیکھا ہے۔'' (یاد رہے کہ مس سوشی کو اعزازی طور پر کنیڈین شہریت بھی ملی ہوئی ہے) انہوں نے مزید لکھا کہ ''سربراہِ مملکت کی حیثیت سے آپ کی یہ خاص اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری بنتی ہے کہ آپ اس بہیمانہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھائیں اور جو کچھ آپ کے اختیار میں ہے اِس (ظلم) کو روکنے کے لئے کریں۔میں آپ کی حکومت کو یہ بھی کہوں گا کہ آپ اقوامِ متحدہ کے کمشنر برائے انسانی حقوق کو اِن لوگوں تک مکمل رسائی دیں۔اوران کو بلا کسی رکاوٹ کے سویلین آبادی کو مکمل مدد پہنچانے دی جائے۔

وزیراعظم ٹروڈو نے مس سوشی کو بار بار یاد دلایا کہ انسانی حقوق پر جب آپ نے نوبل پرائز لیا تو آپ نے لیکچر دیتے وقت انسانی حقوق پر بڑی لمبی چوڑی بات کی تھی۔آپ اپنی کی ہوئی بات کو عملی طور پر کر کے دکھائیں۔'' (43)

مسلم دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص اپنی قوم کا سیاسی معاشرتی اور معاشی ہولوکوسٹ کا ذمہ دار کم از کم میں تو امت مسلمہ کو خود ہی سمجھتا ہوں۔کیا ہم اقبال کے اِس پیغام کو بھول چکے ہیں کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اور یہ کہ ہمیں بھکاری والا کاسہ توڑ کر اپنے اندر جذبہ خودی پیدا کرنا ہوگا۔ تو پھر بقول اقبال اللہ کی مدد آئے گی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کی پوری شاعری میں اللہ کی مدد کو امت کی وحدت کے تصور، خودی، عزتِ نفس، مسلمانوں میں بیداری اور جذبہ سرشاری، حکمت و دانائی سے مشروط کیا گیا ہے۔ یعنی امت مسلمہ فضائے بدر کا سماں تو پیدا کرے جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں بین الاقوامی برادری اور اس کے قائم کردہ ادارے یعنی اقوام متحدہ وغیرہ کو بھی اس ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بھی حقائق سے پردہ پوشی کی۔ اور جھوٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ جس وجہ سے پوری اسلامی دنیا کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا گیا ہے اور بیانیہ یہ ہے کہ جمہوری اقدار کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ انسانی حقوق کا تحفظ کیا جا رہا ہے، دہشت گردی کو ختم کیا جا رہا ہے۔

عراق، لیبیا اور شام پر جھوٹ اور فریب کی بنیاد پر حملے کر کے افراتفری اور انارکی پھیلا دی گئی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ انسانی حقوق کے تحفظ اور جمہوریت کے فروغ کے لئے صدام، قذافی اور اسد کی حکومتوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ گویا کہ یہ تو مسلمانوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد بنانے کا بہترین فارمولا تیار کر دیا گیا ہے۔ اور اُس کے اثرات بھی سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ یورپ میں دہشت گردی کی نئی لہر نے رابن کک کے خدشات کو درست ثابت کر دیا ہے۔

مغرب کا دوہرا معیار:

پھر یہی نہیں، مسلمانوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ اہل مغرب اور امریکہ دوہرے معیار سے کام لیتے رہے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے وسیع پیمانے پر تباہی مچانے والے ہتھیاروں (Weapons of Mass Destruction=WMDs) کا واویلا مچا کر عراق کو تہس نہس کر ڈالا۔ ایرانی اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے داعش (ISIS) کی مدد کی اور بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق اس کی بنیاد رکھی۔ آج ایک پڑھا لکھا مسلمان یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ جمہوریت کی ''محبت'' میں قذافی کو ہلاک کر کے لیبیا کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی گئی اور اس کے بعد ایک خوشحال ملک کو جمہوریت کے نام پر سوائے تباہی و بربادی اور غربت و جہالت کے کیا ملا؟ کیا یہی جمہوریت کا ثمر ہے؟

مسلمان ہو یا غیر مسلم، ذرا سی بھی عقل رکھنے والا شخص پوچھتا ہے مصر کی جمہوری حکومت میں کیا خرابی نظر آئی اور فوجی ڈکٹیٹر کی کون سی ادا بھائی؟ مصر میں اخوان المسلمون کی حکومت تو جمہوری طریقے سے اقتدار میں آئی تھی، پھر اس کو ختم کرنے میں فوجی ڈکٹیٹر کا ساتھ کیوں دیا گیا؟ ایک غیر جانب دار پڑھے لکھے شخص کو دوہرا معیار سعودی عرب کے حوالے سے بھی نظر آتا ہے کہ وہاں تو کوئی جمہوری حکومت نہیں لیکن سعودی عرب امریکہ کا اتحادی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے حامی بھی۔ آخر یہ کون سی جمہوری اقدار ہیں جو لیبیا اور شام میں مختلف ہیں اور سعودی عرب اور مصر میں دوسری نوعیت کی ہیں؟ اس نکتے سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب بیرونی دنیا سعودی عرب کے داخلی معاملات میں مداخلت کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے کیونکہ اس سے اسلامی دنیا میں بہت بڑا ردعمل سامنے آئے گا جس کو روکنا کسی کے بس میں

نہیں ہوگا۔ سعودی عرب کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہاں اسلامی قوانین کے اطلاق سے جرائم کی شرح آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پوری دنیا سے کم ہے۔

ایک باشعور مسلم اور غیر مسلم یہ بھی دیکھتا ہے کہ طالبان کی حکومت اپنی عدالت میں سزا پانے والے کا سر قلم کریں تو ظلم اور درندگی اور سعودی عرب میں یہی کام ہوتا ہے تو انسانی حقوق کی تنظیموں کو کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ان سزاؤں سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہم صرف اس بارے میں اقوامِ عالم کا تضاد واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اس دوہرے معیار کے خلاف آواز صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مختلف پلیٹ فارمز (Platforms) سے اُٹھاتے ہیں۔

دوہرے معیار کی یہ وہ مثالیں ہیں جو اب زبان زدِ عام ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد واقعات ہیں جو اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ دوہرے معیار کو روا رکھا گیا۔ یقیناً یہ بات اس حد تک صحیح قرار دی جاسکتی ہے کہ مغربی اقوام اندرونی نظام میں تو نہیں لیکن خارجی پالیسی میں یقیناً دوہرے معیار سے کام لیتی ہیں لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ دوسرے کی طرف انگلی اٹھانے والا یہ بھول جاتا ہے کہ ایسا کرتے ہوئے تین انگلیاں اس کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو پوری اسلامی دنیا میں انڈونیشیا اور ملائشیا ہی میں کسی حد تک جمہوریت پائی جاتی ہے۔ ترکی اور پاکستان نے بھی کچھ پیش رفت کی ہے لیکن اسے ایک اچھا آغاز ہی کہا جاسکتا ہے ورنہ سبھی جانتے ہیں کہ طاقت کا اصل سرچشمہ کون ہے؟ ہاں البتہ ترک عوام اور اداروں نے اطمینان کی حد تک فوج کو سیاسی معاملات سے علیحدہ کر دیا ہے۔ حالیہ فوجی بغاوت کو جس طرح کچل دیا گیا وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ترکی کی عوام اور سیاسی جماعتیں بڑی حد تک جمہوری اقدار سیکھ چکی ہیں۔ جبکہ برطانیہ کے چیف آف ڈیفنس سٹاف جنرل سر ڈیوڈ رچرڈز General Sir David Richards نے اپنے گھر میں ایک ڈنر پر مجھے برملا کہا کہ وہ افغانستان اور عراق کی مداخلت پر تحفظات رکھتے ہیں لیکن وہ کریں گے وہی جو اُن کے سیاسی ماسٹرز کہیں گے (یعنی کہ پارلیمنٹ)۔ سیاسی اور فوجی اداروں میں اگر مستحکم ورکنگ ریلیشن شپ ایک نظام کے تحت منسلک ہو تو فوج وہی کرے گی جو عوام کے نمائندے کہیں گے۔ کیا ہی بہتر ہوتا اگر پاکستان میں سیاستدان اور فوج اسی بالغ نظری کا مظاہرہ کریں۔

بدقسمتی تو یہ ہے کہ مغربی ممالک میں دوہرے معیار کا نشانہ خارج میں ہے لیکن مسلم ممالک میں اس منافقت کا شکار خود اس ملک کے شہری ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے کہ مسلم ممالک میں بدترین فوجی آمریتیں ہوں یا خاندانی بادشاہتیں، وہ اپنے عوام کو ملکی معاملات میں دخیل ہونے کا حق نہیں دیتے، اور عوام کی حیثیت اس جدید دور میں بھی رعایا سے زیادہ کچھ نہیں۔ مسلمان ملکوں کی ایک بڑی اکثریت میں کہیں بھی عدلِ اجتماعی نہیں۔ احتساب کے اداروں کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حکمران ہر طرح کے قوانین سے بالاتر ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے تیل کی ساری آمدنی درحقیقت حکمران کی ذاتی آمدنی ہوتی ہے۔ حکمران خاندانوں اور حکمران طبقوں کے لیے بالکل علیحدہ قوانین ہیں اور عام انسان کے لیے بالکل علیحدہ۔ مثلاً کئی عرب ممالک کے شاہی خاندانوں کے ہزاروں لوگوں کو ساری دنیا میں لامحدود مفت سفر کی سہولت حاصل ہے۔ چند امیر مسلمان ممالک کو چھوڑ کر باقی ملکوں میں نچلے طبقے کی صورت حال بہت ابتر ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولیات تک ان کی رسائی نہیں۔ تعلیم، صحت، رہائش اور روزگار تک محض خوش قسمت لوگوں کی رسائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے وسائل میسر نہیں، بلکہ وہ ہیں، مگر وہ غلط ترجیحات، مخالفین کو دبانے اور حکمران طبقے اور ان کے

چہیتوں کے کام آتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اقوامِ مغرب کے بالکل برعکس مسلمان ملکوں نے بلحاظِ مجموعی صنعتی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مسلم ممالک میں نسبتاً سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی شاید ہی کسی ملک کی ترجیحات میں شامل ہو!

کیا یہ غلط ہے کہ پچھلے کئی سو برس میں کسی مسلمان ملک میں کوئی نئی ایجاد نہیں ہوئی؟ اسی لیے ہمیں ہر چیز میں مغربی ممالک کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہماری محتاجی کا فائدہ اٹھائیں، ہم پر اپنی شرائط مسلط کریں اور ہمارا بازو مروڑنے کی کوشش کریں تو جتنا اُن کا قصور بنتا ہے، یقیناً ہم بھی اُتنے ہی قصوروار ہیں۔

مسلمان ملکوں میں عام طور پر رشوت، کرپشن، سفارش، عیاشی اور کام چوری کا کلچر ہے۔ مسلم معاشرے کے امیر طبقے نے اپنی دولت کا بہت کم حصہ کمزور طبقے کے لیے مختص کیا ہے۔ حکومتوں پر عدم اطمینان کا یہ عالم ہے کہ ٹیکس کی ادائیگی کا کلچر پروان ہی نہیں چڑھ سکا اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی اگر ہوتی ہے تو اتنی غیر مؤثر کہ غربت کی شرح میں کوئی قابلِ محسوس کمی دیکھنے میں نہیں آتی۔

مسلم معاشروں میں عام لوگوں کی ترجیحات بھی کسی زندہ قوم کے شایانِ شان نہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اسی لیے مسلمان معاشرے خواندگی کی شرح کے لحاظ سے سب سے کم سطح پر ہیں۔ انصاف، کاروباری دیانت، اخلاقی اوصاف، قانون کی پاس داری اور انفرادی مفاد پر ملکی مفاد کو ترجیح دینے کی خوبیاں کتنی ایک ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہوسکتا ہے ہمارے سر اوپر ہی نہ اٹھ سکیں۔ سوائے پاکستان کے اکثر مسلمان ممالک اپنے دفاع کی مطلوبہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ دفاعی صنعت کے اعتبار سے صرف پاکستان کے پاس نیوکلیئر اور میزائیل ٹیکنالوجی موجود ہے۔ اور وہ ستر (70) فی صد تک دفاعی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ لیکن اگر آپ مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک کی دفاعی صلاحیت کا تجزیہ کریں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہوائی جہاز، ٹینک، توپ، آب دوز، بحری جہاز، ریڈار، بکتر بند گاڑیاں اور اس نوعیت کی دیگر تمام چیزوں کے لیے یہ ممالک دوسروں کے محتاج ہیں۔

مسلمان ممالک آپس میں پالیسیوں کے اعتبار سے بھی بالکل منتشر، متفرق اور مختلف الخیال ہیں۔ ایک فلسطین کے متعلق کسی حد تک ذہنی ہم آہنگی موجود ہے، مگر اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ غیر مربوط اور غیر مؤثر حکمت عملی کی وجہ سے فلسطین کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک مدت سے پوری عرب دنیا نے عملاً فلسطینیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ خود فلسطینیوں کا یہ حال ہے کہ وہ بیسیوں تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے درمیان وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عراق ایران جنگ، عراق کا کویت پر قبضہ، اور پھر اپنی تباہی کا خود انتظام، یمن اور شام کی خانہ جنگی اور سعودی عرب اور ایران کا تنازع! غرض مسائل کا ایسا انبار ہے کہ ان کا مکمل احاطہ کرنا ہی ممکن نہیں۔ اور اب سعودی عرب اور قطر کا تنازعہ ہمیں عراق اور کویت کے تنازعہ کی یاد دلا رہا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اب سعودی عرب کے حصے بخرے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے ہم زندگی کے ایک اہم ترین شعبے کا انتخاب کرتے ہیں اور حقائق کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ ہم تعلیم اور خواندگی کے معاملے میں دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان کیا مقام رکھتے ہیں۔ شعبہ تعلیم کا انتخاب ہم نے اس لیے کیا ہے کہ یہی وہ میدان ہے جس میں ترقی دراصل قوموں کو ہر میدان میں سرخرو اور رہنمائی کے قابل بناتی ہے۔

ایک حالیہ عالمی سروے میں دنیا کی پڑھی لکھی قوموں میں ہمارا مقام ملاحظہ فرمائیے:

ایک مطالعاتی جائزے کے مطابق فن لینڈ دنیا کی سب سے خواندہ قوم ہے۔ دنیا کی زیادہ پڑھی لکھی قوموں کی رینکنگ میں نورڈک ممالک (Nordic Countries) سرفہرست ہیں فن لینڈ کو تمام دنیا پر سبقت حاصل ہے جس کے بعد ناروے، آئس لینڈ، ڈنمارک اور سویڈن کو دنیا کی سب سے زیادہ خواندہ قومیں قرار دیا گیا ہے۔

'The world's Most literate Nations 2016' (دنیا کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اقوام) نامی تحقیق میں پہلی بار دنیا کے 60 سے زیادہ ممالک میں پڑھے لکھے رویے اور خواندگی کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سنٹرل کنیکٹیکٹ اسٹیٹ یونیورسٹی (Central Connecticut State University) کی مارچ میں شائع ہونے والی ایک پریس ریلیز کے مطابق مطالعہ میں ایک ملک کی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت کی پیمائش کے بجائے قوموں کی درجہ بندی ان کے خواندہ طرزِ عمل اور اس کے لیے دستیاب وسائل کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ دنیا کی خواندہ قوموں کی تازہ ترین رینکنگ میں امریکہ اور کینیڈا بالترتیب نویں اور 11ویں نمبر پر ہیں جبکہ برطانیہ فہرست میں نیچے یعنی 17ویں نمبر پر جگہ حاصل کر سکا ہے۔ سنٹرل کنیکٹیکٹ اسٹیٹ یونیورسٹی (Central Connecticut State University) کے صدر اور تحقیق کے مصنف جان ڈبلیو ملر (Dr. John W. Miller) نے مطالعے کے لیے مجموعی طور پر 200 ممالک کے اعداد و شمار پر نظر ڈالی ہے لیکن متعلقہ اعداد و شمار کی کمی کی وجہ سے انھوں نے صرف 61 ممالک کا تجزیہ کیا ہے۔ بقول پروفیسر ملر یہ مطالعہ خواندہ طرزِ عمل اور ان کی حمایت کرنے والے وسائل کو دیکھنے کے لیے وسیلے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ تجزیہ کار جان ڈبلیو ملر جنھوں نے پچھلے 40 برس کے دوران اپنا تعلیمی کام خواندگی کے مسائل کے لیے وقف کر رکھا ہے کہتے ہیں کہ خواندگی کی طاقت اور پڑھی لکھی دنیا کا حصہ بننے کی اہمیت کو لوگ اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ خواندہ طرزِ عمل افراد اور قوموں کی کامیابی کے لیے اہم ہے۔ پروفیسر ملر کے مطالعے میں پڑھی لکھی قوموں کی درجہ بندی کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کو بالترتیب چھٹا اور آٹھواں نمبر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ہالینڈ دسویں، فرانس بارہویں اور آسٹریلیا سولہویں نمبر پر ہے۔

پروفیسر ملر کا مطالعہ دو اقسام کے طریقہ کار پر مبنی تھا جس میں انھوں نے ایک طرف انٹرنیشنل تعلیمی نتائج میں پیش رفت کا جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف خواندگی کے رویے کی خصوصیات مثلاً آبادی، اسکول کی تعلیم کے سال، اخبارات کے قارئین، کتب خانوں کا سائز اور گھروں میں کمپیوٹر کی دستیابی کے اعداد و شمار کا معائنہ کیا ہے۔ پروفیسر ملر کے مطابق وہاں ایک طرف تو اسکولوں کے لازمی تعلیمی سال کی مدت اور تعلیمی اخراجات کے درمیان کوئی بامعنی تعلق نہیں تھا تو دوسری طرف ٹیسٹ کے اسکور اور تعلیمی اخراجات کے درمیان بھی کوئی واضح تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ نورڈک ممالک نے مطالعے میں پہلی پانچ جگہیں حاصل کی ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ کرنا ان لوگوں کی ثقافتی روایات کا حصہ ہے۔

پاکستان کا نظامِ تعلیم اور معاشرے کی پولا رائزیشن:

پاکستان کے نظامِ تعلیم کو ایک عجیب قسم کا ملغوبہ بنا دیا گیا ہے۔ جس سے ایک ''پاکستانی قوم'' نہیں بلکہ اِس نظام سے دو انتہائیں پیدا ہو رہی ہیں یعنی سوسائٹی کی پولا رائزیشن (Polarisation) ہو رہی ہے۔ اور حکمرانوں کو کوئی فکر نہیں کہ وہ نئی نسل کی آئندہ آنے والے اندرونی و بیرونی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تعلیمی لحاظ سے کیسے تیاری کر رہے ہیں۔ حکومت کی اِس وقت کی پہلی چند ترجیحات میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے کی انتہاؤں کو خاتمے (Depolarisng) کے لیے ایک ہمہ جہتی لائحہ عمل تیار کرے۔ جس میں سول سوسائٹی کا ہر شعبہ شامل ہو تا کہ کامیابی حاصل کی جا سکے۔

برطانیہ میں بھی اسلامی سکول اور اسلامی مدارس ہیں لیکن وہ ایک مربوط حکومتی نظام کے ساتھ جڑے ہونے کے باوجود آزاد حیثیت قائم رکھتے ہیں۔اسی طرح عیسائیوں، یہودیوں، سکھوں اور ہندوؤں کے بھی اپنے سکول ہیں اور وہ بھی ایک نظام کے تحت چلتے ہیں۔ایک اعلیٰ سطح کا گرامر سکول ہو یا گورنمنٹ کا سکول وہ سب ایک ادارے:

The Office for Standard in Education (OFSTED) کے تحت عملی طور پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔کئی خیراتی ادارے بھی اپنے سکول اس ادارے کے تحت چلاتے ہیں۔کسی کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔برطانیہ میں بھی طبقاتی امتیاز ہے لیکن وہ انتہائی کم جگہوں میں نظر آئے گا۔

پاکستان کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل تہیں نظر آتی ہیں۔

نمبر 1) ایک گورنمنٹ کے فنڈ سے چلنے والے سکول ہیں جو کہ سیاسی اثر ورسوخ و مداخلت کی وجہ سے اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں۔اساتذہ کا تقرر سیاسی بنیادوں پر ہوتا ہے لہٰذا وہ سکولوں میں جاتے ہی نہیں تنخواہ گھر میں بیٹھ کر لیتے ہیں۔صرف اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرتے ہیں۔لہٰذا وہ والدین جو کہ غریب ہیں صرف وہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے سکول میں بھیجیں گے۔حالانکہ میں خود گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں پڑھا ہوں۔بہت سارے اچھے سکول اور کالج بھی موجود ہیں۔لیکن مجموعی صورتِ حال تسلی بخش نہیں ہے۔

نمبر 2) والدین کا رجحان ہر گلی میں کھلے بغیر کسی نظم کے چلنے والے انگلش میڈیم سکولوں کی طرف ہوتا ہے۔جہاں پر نان کوالیفائیڈ اساتذہ بچوں کو ایسا سلیبس پڑھا رہے ہوتے ہیں جس کے ساتھ بچوں کو کوئی رشتہ قائم کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔بجائے اس کے کہ پرائمری اور مڈل تک پڑھنا، لکھنا اور سیکھنے کا طریقہ سکھایا جائے اُس کے اوپر 15 کلو وزنی کتابوں کا غیر ضروری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔اور اُس بچے کو وہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا اُس کے کلچر، مذہب اور تہذیب سے دور کا واسطہ نہیں۔

نمبر 3) تیسرے نمبر پر ایک اور نظام ہے جو کہ ایک نئی سپیریئر پاکستانی قوم پیدا کر رہا ہے۔اور وہ ہے ایچی سن ٹائپ کے انگلش میڈیم سکول جن کا بچہ صرف اور صرف ملکی اسٹیبلشمنٹ، سیاسی گھرانوں، بڑے پیر گھرانوں سے آتا ہے اور اُن کا کام ملکی باگ ڈور کو سنبھالنا ہوتا ہے، انہوں نے نچلی سطح پر کچھ بھی نہیں دیکھا ہوتا ہے کہ غریب کیسے زندگی گزار رہا ہے۔عام دکاندار یا چھوٹی فیکٹری کا مالک بجلی، پانی اور گیس کے بغیر کیسے روٹی کما رہا ہے اور یہ کہ مزدور اپنے 2 یا 3 بچوں کو کیسے روٹی کھلا رہا ہے اور تعلیم کیسے دلوا رہا ہے۔

نمبر 4) ایک آرمی کا نظام تعلیم ہے جو کہ ایک اور ایکسٹرا سپر قسم کی ''پاکستانی قوم'' پیدا کر رہا ہے کہ وہ سویلین لوگوں کے حالات اور مشکلات سے واقف نہیں ہوتے لیکن اُن میں احساس برتری کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے۔

نمبر 5) پانچواں نظام تعلیم مدارس میں چلایا جا رہا ہے جو کہ خیراتی اداروں کے ماتحت چل رہا ہوتا ہے۔اور یہ اپنے مسلک اور ریسرچ کے اعتبار سے ایک وفاق کے تحت ہوتے ہیں یعنی دیوبندی، بریلوی، اہلِ تشیع، وہابی اور جماعت اسلامی کے علیٰحدہ علیٰحدہ وفاق ہیں میری اِن تمام وفاقوں کے صدور سے ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔اور یہ ایک بالکل علیٰحدہ اور متوازی نظام ہے۔

اربابِ اختیار و اقتدار کی اکثریت کو ان مدارس کے گریجویٹ یا علما سے یہ شکایت رہی ہے کہ یہ مدارس جو مولوی پیدا

کر رہے ہیں وہ معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ (Compatible) نہیں ہو سکتے۔ ایک اور بھی شکایت آتی ہے کہ مدارس میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جبکہ وفاق کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ اگرچہ مدارس میں بہت سارے بچے والدین کے اپنے شوق اور مذہب کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے پڑھنے آتے ہیں لیکن کثیر تعداد میں مدارس وہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں جو کہ حکومت وقت کی ہوتی ہے۔ یعنی بچوں میں خواندگی کی شرح کو بڑھانا، مفت خوراک، کپڑے اور سر چھپانے کے لئے چھت مہیا کرنا مزید یہ کہ بچے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے اور مجرم بننے کی بجائے ایک تعلیمی ادارے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور ایک پُرامن شہری بنتے ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ دینی مدرسے کا پڑھا ہوا فارغ التحصیل یونیورسٹیوں کے ڈگری ہولڈروں کی طرح در بدر نوکری کے لئے دھکے نہیں کھا رہا ہوتا بلکہ اس کی جاب کی ضمانت ہے تو گویا کہ مدارس کا خیراتی نیٹ ورک بنیادی تعلیم سے لے کر نوکری تک عوام اور حکومت کی مدد کر رہا ہوتا ہے یا تو حکومت اس کے برابر کا نیٹ ورک تیار کرے، نہیں تو خواہ مخواہ دینی اداروں کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یعنی کھالیں روک دینے سے اور سرکاری اداروں کی طرف سے علما کو اغوا کر کے اور کچھ عرصے بعد سڑکوں پر چھوڑ دینے سے بہتری نہیں آئے گی بلکہ ملکی فضا مزید مکدّر رہی ہوگی اور انارکی کا خطرہ رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ علما کرام نے عوام کے لئے دینی ضروریات کی ذمہ داری باوجود مشکلات اور کچھ کوتاہیوں کے احسن طریقے سے نبھادی ہے۔ آج اذان کے لئے مؤذن، نماز کے لئے امام، تراویح کے لئے حافظ اور بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے علما کرام موجود ہیں جبکہ دنیاوی تعلیم جو کہ حکومت کی ذمہ داری تھی وہ احسن طریقے سے نہیں نبھائی گئی۔ حکومت کو چاہیے کہ اغیار کو خوش کرنے کی بجائے اور اسلام اور پاکستان کے اسلامی تشخص کے ساتھ معذرت خواہانہ رویہ رکھنے کی بجائے مدارس اور گورنمنٹ کے سکولوں کی بہتری کا سوچیں اور ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس میں علما کرام اور سکولوں کے اساتذہ سے مشاورت ہو بلکہ اُن کو فیصلہ کرنے والے گروپ میں شراکت دار بنایا جائے۔ تاکہ تمام لوگ اِس سارے کام کی Ownership لیں کیونکہ کوئی بھی فیصلہ اوپر یا ''بیرونی'' حکم کے دباؤ سے مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ رہا مسئلہ مدارس پر انتہا پسندی کی تعلیم اور دہشت گردی پھیلانے کا نظام تو میری رائے یہ ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ناسور نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

ایک بات تو طے ہے کہ اِس پانچ قسم کے مختلف نظاموں نے ملک میں دو انتہائیں پیدا کر کے عوام اور خواص کے اندر ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی ہے اور اُس کو پاٹنے کی ضرورت ہے کہ ملک کو اِس وقت بہت زیادہ اندرونی و بیرونی خطرات ہیں۔ اگر سوسائٹی کو Depolarise کر کے ایک پاکستانی قوم نہ بنایا گیا تو قوم کو ناقابل تلافی نقصان ہوگا لہٰذا اربابِ اختیار اور دانشوروں کو چاہیے کہ مل بیٹھنے کے لئے ایک جامع منصوبہ بندی کریں اور یونیورسٹیوں میں جا کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔

اس تجزیے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مغربی ممالک میں ہر چیز درست سمت میں جا رہی ہے اور کرپشن بالکل نہیں ہے وہاں کرپشن بھی ہے، اقربا پروری بھی، فراڈ بھی اور جرائم بھی لیکن ادارے اور احتسابی نظام اس قدر مضبوط ہے کہ بڑے سے بڑا سیاسی یا کاروباری شخص ہو یا پولیس یا قانون سے متعلق سینئر افسر، اگر کسی کے خلاف شکایت ہوگئی ہے تو وہ نظام کے شکنجے سے بچ نہیں سکتا جب تک کہ نظام اسے معصوم نہ قرار دیدے۔ وہاں بھی انتہا پسندی زوروں پر ہے اور آئے دن غیر ملکی

لوگوں پر حملے ہو رہے ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی طبقاتی امتیاز ہے۔ روزانہ کئی ایسے کیس سامنے آتے ہیں اور اس پر میں نے ایک پورا باب اگلے صفحات میں لکھا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد مدارس کا ماحول انتہائی پُرامن ہوتا تھا۔ اور ان کے طلبا کو سیاسی ریلیوں میں بھی جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی لیکن بعد میں ایک بین الاقوامی منصوبے کے تحت ایک پالیسی بنائی گئی۔ کہ روس کے خلاف ایک پرچار کیا جائے۔ پھر پاکستان کی ریاستی پالیسی بنی کہ امریکہ کی سربراہی، فوجی مدد اور پیسے سے اس کام کو باقاعدہ ایک طریقے کے ساتھ پروموٹ کیا جائے۔ تو کچھ مدارس اُس سے متاثر بھی ہوئے۔ لیکن آج کے انتہا پسند کسی بھی مدرسے کے فاضل نہیں ہیں بلکہ یونیورسٹیوں، میڈیکل کالجوں اور آرمی کے اداروں تک کے طلبا موجود ہیں۔ بہرحال برائی جہاں بھی ہو اُس کو ختم کرنا چاہیئے۔ تاکہ کسی ایک ادارے کے غلط رویے کی وجہ سے پورے نظام کو بدنام کر کے ملک اور مذہب کی نیک نامی کو مشکوک نہ کیا جائے۔

چنانچہ یہ ہے عالمِ اسلام کی زبوں حالی، دوعملی، کمزوری، نااتفاقی اور دہرے معیار کا ایک مختصر خاکہ۔ فکری طور پر کم و بیش تمام مسلم معاشرے دو انتہاؤں میں بٹ چکے ہیں۔ کہیں ہمیں مذہبی شدت پسندی نظر آتی ہے تو کہیں ہمیں لبرل شدت پسندی۔ راہ اعتدال کے حامل لوگ بھی خوش قسمتی سے ہیں لیکن پاکستان میں بالخصوص اور دوسرے مسلم معاشروں میں بالعموم اقلیت میں نظر آتے ہیں۔ (ان تک رسائی ہماری اس تحریر کے اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔)

اس ناگفتہ بہ حالت کے ساتھ تو ہمارا محض زندہ رہنا بھی باعث حیرت ہے۔ کجا یہ کہ ہم یہ سوچ سکیں کہ اپنی اس حالت کو بدلے بغیر ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ بن سکیں گے، ان کا مقابلہ کر سکیں گے اور ان کی سازشوں کا توڑ کر سکیں گے۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ پہلے ہمیں اپنے گھر کو ہر اعتبار سے ٹھیک کرنا ہوگا تب کہیں جا کر ہم آگے کا سوچ سکیں گے۔

سوال یہ ہے کہ صرف ہم ہی کیوں دوسروں کی سازشوں کا آلۂ کار اور شکار بنتے ہیں؟ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل خرابی دراصل ہم میں ہے اور اگر ہم میں خامی و کمزوری نہ ہو تو کوئی طاقت بھی ہمیں اپنا آلۂ کار نہیں بنا سکتی۔ اجتماعی معاملات میں قدرت کے کچھ اصول ہیں جن کی بنیاد پر معاشرہ آگے بڑھتا ہے یا پیچھے رہ جاتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والے لوگ ہمیشہ سازشوں کی دہائی دیتے ہیں۔ حالانکہ پس ماندگی کے اسباب کو دشمنوں کی سازش قرار دینا سوائے حقیقت کو چھپانے کے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ جذباتیت، اور تعصب کے بجائے انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ امتِ مسلمہ کی موجودہ تنزلی اور بری حالت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہماری کامیابی کا راستہ کیا ہے۔

شکوہِ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے



دوسرا باب:

مسلم ممالک پر غیر ملکی افواج کی یلغار اور اس کے منفی نتائج

ہماری کوشش ہوگی کہ بہت پرانی تاریخ کو مندرجہ ذیل سطور میں دہرا کر قاری کے لیے مشقت کا سامان نہ پیدا کیا جائے۔ لہٰذا ہم پچھلی کچھ دہائیوں کے اہم واقعات کو زیرِ بحث لائیں گے۔ اور اس پر بھی غور کریں گے کہ ''اسلامی انتہا پسندی'' اور ''اسلامی دہشت گردی'' جیسی منفی اور مضحکہ خیز اصطلاحات کب، کیوں اور کن حالات میں ایجاد کی گئیں۔

روس کے افغانستان میں داخلے سے پہلے مغربی دنیا اس بات سے بے خبر تھی کہ مسلمانوں کا تصورِ جہاد کیا ہے اور تب تک مغرب نے مسلمانوں کا کوئی تعلق دہشت گردی سے نہیں جوڑا تھا یعنی فلسطینی اور اسرائیلی قضیہ میں فلسطینی ردِعمل کو ''اسلامی انتہا پسندی'' یا ''اسلامی دہشت گردی'' کے نام سے موسوم نہیں کیا گیا کیونکہ فلسطینی مزاحمت کار عرب عیسائی بھی تھے اور مسلمان بھی لہٰذا دونوں اپنی قوم کی سلامتی اور اپنے مقبوضہ علاقے کی واپسی کے لئے جنگ آزادی لڑ رہے تھے۔ یاسر عرفات مرحوم کو دہشت گرد تو لکھا جاتا تھا لیکن ''اسلامی دہشت گرد نہیں'' اس لیے ہمیں اس مسئلے کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کے لیے ان حالات و واقعات کا جاننا از حد ضروری ہے جس کے تحت روس افغانستان میں داخل ہوا۔ اور کس طرح ہم معصومانہ بلکہ احمقانہ طریقہ سے مغرب کے ہاتھوں میں استعمال ہوئے اور پھر 2001ء میں جہاد اور دہشت گردی کے فرق مٹانے میں معاون ثابت ہوئے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ایک فوجی کو تیار کرنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فوجی مرنے کے لیے تیار ہے کہ نہیں؟ جبکہ جہادی پر چند ہزار روپے خرچ کر کے ایک ایسا جنونی تیار کر لیا جاتا ہے جو صرف مرنا چاہتا ہے اور اُس کا مقصود صرف اور صرف شہادت ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مجاہد کو اگر شہادت نہیں ملتی اور جنگ سے یا اپنی مہم سے زندہ بچ کر آ جائے تو غازی، یعنی دونوں صورتوں میں مجاہد کامیاب اور بقول اقبال:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

مسلم ممالک پر غیر ملکی افواج کی یلغار میں افغانستان پر روسی حملہ اور پھر امریکہ کی سرپرستی میں اُس کا مقابلہ سرفہرست ہے، لہٰذا مسئلہ افغانستان پر بحث سے پہلے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کی پچھلی تاریخ کا بھی مختصراً جائزہ لیا جائے۔

افغانستان کی تاریخ کا مختصر جائزہ:

افغانستان دراصل برصغیر میں داخلے کا دروازہ رہا ہے۔ آریاؤں سے لے کر ایرانیوں اور ترکوں تک اسی راستے کے ذریعے سے برصغیر میں داخل ہوتے رہے۔ اس لیے یہ علاقہ ہمیشہ سے عالمی طاقتوں کا میدان جنگ بنا رہا ہے۔ برصغیر

پاک و ہند میں انگریزی حکومت جب مستحکم ہوئی تو انہوں نے افغانستان میں بھی قدم جمانے کی کوشش کی۔

پہلی افغان انگریز جنگ (The first Anglo-Afghan War 1839-1842) میں انگریزوں کو بری طرح شکست ہوئی، دوسری افغان انگریز جنگ (The Second Anglo-Afghan War 1878-1880) میں انگریز جزوی طور پر کامیاب رہے۔ اور اس کے نتیجے میں امیر شیر علی کی حکومت ختم ہوئی اور امیر عبدالرحمن افغانستان کے نئے سربراہ بنے۔ یہ حکمرانی انھیں انگریزی بالادستی قبول کرنے کے نتیجے میں ملی تھی۔ امیر عبدالرحمن ((1880-1901 وہ پہلا افغان حکمران تھا جس کے دور میں موجودہ افغانستان کی سرحدوں کا تعین ہوا۔

پہلی جنگ عظیم (World War I- 1914-1918) میں افغانستان غیر جانبدار رہا۔ اس کی سزا عبدالرحمان کو یہ دی گئی کہ ولی عہد حبیب اللہ کو قتل کرا دیا گیا ((1919۔ جس کے بعد امیر عبدالرحمان کے تیسرے بیٹے امان اللہ، افغانستان کے حکمران بنے۔ امان اللہ کے دور میں تیسری افغان انگریز جنگ (The Thrid Anglo-Afghan War 1919-1920) ہوئی جس کا خاتمہ معاہدہ راولپنڈی (Treaty of Rawalpindi) پر ہوا جس میں یہ طے ہو گیا کہ افغانستان پر کسی قسم کا انگریزی اثر و رسوخ نہیں ہوگا۔ اسی لیے 19 اگست کو افغانستان اپنی آزادی کا دن مناتا ہے۔

افغانستان: سیکولرازم اور کمیونزم:

اس کے بعد امان اللہ نے ترکی کے حکمران مصطفی کمال پاشا کے ساتھ تعلقات بڑھائے اور اس کی پیروی میں سیکولرازم کے نفاذ کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ یوں 1929 میں اسے تخت سے ہاتھ دھونے پڑے اور اس کی جگہ اس کے بھتیجے نادر شاہ نئے بادشاہ بنے۔ 1933 میں نادر شاہ کے قتل کے بعد ظاہر شاہ افغانستان کے نئے بادشاہ بن گئے۔

ظاہر شاہ 1933ء میں افغانستان کے بادشاہ مقرر ہوئے۔ اس کے چالیس سال بعد 1973 میں ان کے چچازاد بھائی سردار داؤد نے اس وقت ان کا تختہ الٹ دیا جب وہ بیرون ملک دورے پر تھے۔ اس کے پانچ برس بعد اپریل 1978ء میں کمیونسٹ انقلاب آیا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب نور محمد ترکئی کو صدر بنایا گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان سب تبدیلیوں کو اس وقت کی دوسری سپر پاور سوویت یونین (USSR) کی آشیر باد حاصل تھی۔ ڈیڑھ سال بعد ستمبر 1979ء میں کمیونسٹوں کے ایک اور دھڑے کے سربراہ اور وزیر دفاع حفیظ اللہ امین نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ پہلے حکمرانوں کی طرح یہ بھی روس کی مرضی کے مطابق کام نہ کر سکا تو حالات بہت بگڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دسمبر 1979 میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں اور ببرک کارمل کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ روس کے اس اقدام نے دوسری دنیا کو بھی یہ جواز فراہم کر دیا کہ وہ بھی افغانستان میں مداخلت کریں۔

پاکستان: فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار:

چند سالوں کے اندر ((1982 میں امریکہ، پاکستان، چین اور عرب ممالک کے تعاون سے مجاہدین کی مزاحمت کو عالمی سطح پر سیاسی و مالی مدد ملی۔ یہاں ان ممالک میں سے پاکستان نے فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کیا جس میں جنرل ضیاء الحق، جنرل عبدالرحمن، جنرل حمید گل (اُس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ) اور اُن کے رفقائے کار نے جس مزاحمتی

تحریک کو ایک نیا رنگ دے کر اپنی حیثیت کو منوایا اور پاکستان کو روسی ریڈ آرمی کے تسلط میں آنے سے بچایا۔ مگر سکے کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اس مہم جوئی کا خمیازہ ہم اندرونی اور بیرونی سطح پر ایک مستقل جنگی کیفیت کی شکل میں بھگت رہے ہیں گویا کہ انتہا پسند رویوں اور دہشت گردی نے ہماری قومی سالمیت اور حمیت کو زخمی کر کے رکھ دیا۔ جہاں صدر ضیاء الحق نے جنگی صورتِ حال کے تناظر میں امریکی امداد کو Peanut یعنی (مونگ پھلی) یعنی انتہائی معمولی قرار دیا۔ اور اُس وقت جہادی حلقوں میں یہ شعر اکثر سننے کو ملتا تھا:

غلامی میں کام آتی ہیں نہ شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مجاہدین کے بیشتر رہنما سردار داؤد کے وقت سے ہی پاکستان میں مقیم تھے۔ اس وقت ایک ہی تنظیم تھی جس کا نام ''جمعیت اسلامی'' تھا۔ اس کے قائد برہان الدین ربانی اور سیکرٹری جنرل گل بدین حکمت یار تھے۔ یہ دونوں رہنما جماعت اسلامی پاکستان سے بہت متاثر تھے۔ جبکہ 1976ء میں حکمت یار نے جمعیت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نئی پارٹی ''حزبِ اسلامی'' تشکیل دی چونکہ اس معرکے میں پاکستان ہی فرنٹ لائن ریاست تھی۔ پاکستان کے ارباب اختیار شروع دن سے ہی مجاہدین کی حمایت میں مصروف تھے اس لئے پاکستان کا کردار اور اس کے فیصلے بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن جب جنرل ضیاء الحق مرحوم جولائی 1977 میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سویلین حکومت کو گرا کر اقتدار میں آئے تو امریکا جیسا جمہوری ملک بھی اس فوجی حکومت کی حمایت کیے بغیر نہ رہ سکا لہٰذا جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے امریکی حکومت کی مشاورت سے یہ فیصلہ کر لیا کہ افغانستان میں روسی مداخلت کی مزاحمت کرنی ہے۔ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط؟۔ یعنی پاک افغان 2400 کلومیٹر کے بارڈر پر تکنیکی اعتبار سے ہم کس طرح مجاہدین کی نقل و حرکت کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے تھے؟ مزید یہ کہ ہمارا دوسرا بارڈر جو کہ بھارت کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ بھی ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا ہو سکتا ہے کہ ضیاء الحق حکومت کے پاس امریکہ کی مدد کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ ہو لیکن بعد کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ پاکستانی عوام کے اوپر مضر اثرات مرتب ہوئے۔ ملک میں آج لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہماری اُسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے اپنی کتاب میں لکھا کہ بڑے مقاصد حاصل کرنے کے لیے سیاست دانوں کو کچھ ایسے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں جو حقائق سے دور ہوتے ہیں۔

روس نے افغانستان پر قبضہ کر کے سرد جنگ (Coldwar) کو خلیج فارس (Persian Gulf) کے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لئے ایک حقیقی جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ خلیج فارس سے امریکی بحری بیڑے تیل کی سپلائی لیتے ہیں اور یہ جگہ سٹریٹجی کے اعتبار سے نہایت اہم ہے یعنی اس کے شمال میں ایران، مشرق میں اومان، جنوب میں قطر اور متحدہ عرب امارات، جنوب مغرب میں سعودی عرب اور شمال مغرب میں کویت اور عراق واقع ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں دیکھیں تو

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جگہ خطے کے حالات کے اعتبار سے امریکہ کے لیے کتنی اہم ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق سویت یونین کا اندرونی کمیونسٹ نظام بہت کمزور ہو چکا تھا اور اس نے ٹوٹنا ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عوام کی توجہ کو منتشر کرنے کے لیے افغان جنگ شروع کر دی۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ روس کی گرم پانیوں تک رسائی ایک دائمی خواہش رہی ہے۔ اُس نے اپنی شکست وریخت کے بعد دیکھ لیا کہ جنگیں مسائل کا حل نہیں بلکہ ڈائیلاگ سے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اب گرم پانیوں تک رسائی روس نے چائنا اور پاکستان سے ڈائیلاگ کر کے حاصل کر لی ہے اور CPEC اُس میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق، جنرل اختر عبدالرحمن، جنرل حمید گل اور اُن کے دیگر رفقا نے یہ محسوس کر لیا افغانستان کے بعد اگلا ٹارگٹ پاکستان ہی ہوگا اور امریکہ بھی اس بات سے خوفزدہ تھا کہ روسی ریڈ آرمی جہاں بھی گئی وہاں سے واپس نہیں نکلی اسی وجہ سے شاید ضیاء الحق مرحوم دنیا کو اقبال کا یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیرو سناں اول طاؤس و رُباب آخر

روس کے ٹوٹنے کی وجوہات:

بہرحال روس کے ٹوٹنے کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک وجہ کمیونزم (Communism) کا اندرونی تضاد بھی تھا جس کی وجہ سے گورباچوف (Gorbachev) اقتدار میں آئے اور جس نے گلاسناٹ

(Glasnost=Openness) اور پیراسٹرائیکا (Perestroika=Reconstruction)

جیسی اصلاحات متعارف کروائیں۔ (1991-1980) جس کے اتنے منفی اثرات پڑے کہ 1991 تک سوویت یونین پندرہ کے قریب علیحدہ ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا (اسلامی حلقوں میں کمیونزم کی شکست کی بڑی وجہ خدا پرستی سے انکار تھا۔) بہرحال پاکستانی حکومت کا اُس وقت کے مجاہدین کو سپورٹ کرنے کا نقطۂ نظر بھی وزن رکھتا ہے کہ روس کی اُس وقت افغانستان میں مزاحمت نہ کی جاتی تو پھر اُسے دوسرے ممالک کا رُخ کرنے سے کوئی نہ روک سکتا جس کی ایک مثال یوکرائن، جارجیا اور شام میں روسی طاقت کے مظاہرے سے بھی سامنے آئی ہے کہ یورپ کو اِن تمام محاذوں میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اب تو ڈونلڈ ٹرمپ کے امریکی صدر بن جانے کی وجہ سے روس مزید مضبوط ہوگا عین ممکن ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ امریکہ کے گورباچوف ثابت ہوں اور یہ بھی خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسی امریکی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف چلتی رہی تو یہ شاید کسی قاتلانہ حملے کا شکار ہو جائیں۔

تاہم اگر افغانستان پر روسی قبضے کے وقت پاکستان کو فوجی حکمت عملی اختیار کرنی تھی تو پاکستانی ارباب اختیار کو چاہیے تھا کہ بیرونی حالات میں اپنے ایک سٹریٹیجک کردار کی وجہ سے ملک کی اندرونی ترقی، انتظام وانصرام کی طرف بھی سخت توجہ دیتے یعنی امریکہ کی مدد سے ہائی ٹیک انقلاب Hi Tech Revolution لے آتے۔ ایڈ (Aid) کی بجائے ٹریڈ (Trade) بڑھاتے۔ کالا باغ ڈیم جیسے پراجیکٹ مکمل کیے جاتے۔ کشمیر کے مسئلے کے اوپر مغربی دنیا سے بارگین کیا جاتا جو کہ اب حل ہونا انتہائی مشکل نظر آ رہا ہے کیونکہ انڈیا اب ایک ابھرتی ہوئی اکنامک پاور بن چکی ہے اور وہ ''برکس'' یعنی برازیل، روس، انڈیا، چین اور جنوبی افریقہ:

Brazil, Russia, India, China and South Africa(BRICS)

کا حصہ ہے۔مغرب کی معیشت کو سہارا دینے میں اُن کی ضرورت ہے۔مغربی سفارت کار یا وزراء پاکستان کا دورہ کریں تو انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کرتے ہیں جبکہ بھارت میں کشمیریوں، سکھوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں جیسی اقلیتوں پر ظلم وستم کے معاملے میں اُن کی زبان گنگ ہوجاتی ہے۔

مجاہدین کی نااتفاقی سے نقصان:

دنیا کی تاریخ کے جنگی تجربات سے یہ متفقہ سبق ملتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی بھی یہی ہدایت ہے کہ صرف وہی مسلح مزاحمت کامیاب ہوتی ہے جس کی ایک متفقہ تنظیم ہو، اس کا سیاسی نظم ہو اور فوجی تنظیم اس کے ماتحت ہو۔اس کی پشت پر ایک مضبوط ریاست علی الاعلان کھڑی ہو۔اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ افغان مجاہدین کی ایک متفقہ جلاوطن حکومت بنتی۔اسی کی سربراہی میں جنگ آزادی لڑی جاتی اور دوسرے ممالک مثلاً پاکستان، امریکہ وغیرہ سے وہی جلاوطن حکومت معاہدے کرتی۔لیکن اس کے برعکس طریقہ اختیار کیا گیا۔اور زیادہ سے زیادہ مجاہد تنظیمیں بنیں۔چنانچہ کچھ تنظیمیں تو براہ راست بنائی گئیں۔مثلاً گلبدین حکمت یار نے برہان الدین ربانی سے الگ ہوکر 1979 میں حزب اسلامی قائم کر لی۔مولوی یونس خالص نے گلبدین حکمت یار سے اپنا دھڑا الگ کرلیا۔پھر پروفیسر عبدالرسول سیاف نے 1980ء میں اتحادِ اسلامی قائم کی۔جناب صبغت اللہ مجددی نے نجات ملی قائم کی۔مولوی محمد نبی محمدی نے حرکت انقلاب اسلامی قائم کی۔پیر گیلانی نے محاذ ملی افغانستان قائم کی۔تقریباً انہی ایام میں یعنی 1979ء میں برصغیر کی تاریخ ایک اور انگڑائی لیتی ہے اور شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے خاندان کی طویل ترین شہنشاہیت کا خاتمہ ایران میں انقلاب کے ذریعے ہوجاتا ہے۔اب افغانستان اور ایران کی صورتِ حال کو سامنے رکھیں تو نظر آتا ہے کہ پاکستان میں مختلف مکاتب فکر نے اپنے عسکری ونگ قائم کئے اور پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد پسندی اور دہشت گردی کی بنیاد رکھی گئی جس سے حکومت پاکستان بخوبی واقف تھی۔(بعد میں یہ فرقہ ورانہ تنظیمیں مختلف ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔)اس حکمت عملی کا اصل مقصد یہ تھا کہ تمام افغان تنظیمیں ایک خاص حد سے زیادہ طاقت ور نہ ہونے پائیں اور اس طرح افغانستان میں جو بھی حکومت بنے وہ حکومت پاکستان کے قابو میں رہے۔فوجی حکومت کا خیال یہ تھا کہ اس طریقے سے اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے افغانستان کے بارے میں اصل فیصلے کا اختیار اس کے پاس رہے گا اور امریکی امداد میں وہ اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ رکھ سکے گی۔اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ کا یہ خیال تھا کہ آئندہ کے افغانستان کو پاکستان کی ایک طفیلی ریاست، بلکہ درحقیقت پاکستان کا پانچواں صوبہ بن کر رہنا ہے۔اس کو وہ حربی گہرائی (Strategic Depth) کے نام سے پکارتے تھے۔اس خواہش کے پیچھے یہ توقع تھی کہ امریکا اپنا مطلب نکال کر یہاں سے چلا جائے گا۔اور ان کے لیے میدان صاف ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جب مختلف مسلح تنظیموں کے پاس وسائل، ڈالر اور اسلحہ موجود ہو تو علاقے پر قبضے کے لئے وہ آپس میں بھی لڑیں گی۔چنانچہ یہ تمام تنظیمیں آپس میں بھی لڑتی رہیں اور روسیوں کے خلاف بھی لڑتی رہیں۔چونکہ مجاہدین کی کوئی جلاوطن حکومت موجود نہیں تھی اس لئے اقوام متحدہ کے تحت جنیوا مذاکرات میں ان کی نمائندگی نہیں تھی اور پاکستان کا نمائندہ موجود تھا۔گویا پاکستان نے تمام پتے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔یہی وجہ ہے کہ 1988ء میں ''جنیوا'' معاہدے پر دستخط افغانستان کے ڈاکٹر نجیب اللہ کے نمائندے اور حکومت پاکستان کے ہوئے۔اگر اس کے بجائے یہی معاہدہ ڈاکٹر

نجیب اللہ اور مجاہدین کی جلاوطن حکومت کے درمیان ہوتا تو پرامن انتقال اقتدار عمل میں آتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ پاکستان کا طفیلی بننے کے بجائے ایک آزاد افغانستان ہوتا۔ یاد رہے اس معاہدے پر پاکستان کے وزیراعظم محمد خان جونیجو کے دستخط ثبت تھے۔ اس معاہدے پر جنرل ضیاء الحق کے کچھ تحفظات بھی تھے اور شاید یہی تحفظات جونیجو حکومت کی برطرفی کا سبب بنے۔

فروری 1989 میں روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور اس کے بعد تین برس تک ڈاکٹر نجیب اور مجاہدین کے درمیان لڑائی جاری رہی۔ مارچ 1992 میں کابل کے دفاع پر مامور جنرل رشید دوستم کی بغاوت کی وجہ سے احمد شاہ مسعود کو کابل پر قبضے کا موقع ملا۔ اب ایک اور خونریز دور کا آغاز ہوا جس میں تمام مجاہدین تنظیمیں آپس میں لڑتی رہیں۔ اگلے چار برس پورا افغانستان لاقانونیت، ظلم، بربریت اور طوائف الملوکی کی تصویر بنا رہا۔

گویا افغانستان کے حالات کی خرابی میں روسی افواج کی مداخلت کے بعد سب سے زیادہ کردار اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ کی غلط پالیسی کا تھا۔ اور طالبان کو کئی معاملات میں پاکستانی حکومت کی آشیر باد حاصل تھی۔ جماعت اسلامی بھی اس ذمہ داری میں ایک اعتبار سے شریک تھی کیونکہ جماعت اسلامی اس پورے دور میں اس پالیسی کی پشت پر رہی۔ نیز تمام افغان مجاہد تنظیمیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی تنظیم کی قیادت نے افغانستان کے اتحاد اور اسلام کے ارفع و اعلیٰ اصولوں کی خاطر اپنی انا کی قربانی نہیں دی۔

شر سے خیر:

جب روس نے افغانستان پر مکمل تسلط کے لئے حملہ کیا تو حکمران طبقہ اور آبادی کا دو تہائی حصہ روس کے احسان تلے دبا ہوا تھا اور اس کی آمد کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ فیکٹریوں، صنعتوں اور معاشی ضروریات مہیا کرنے کی وجہ سے اس کو افغانستان میں قبضہ کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی، جبکہ ساری دنیا اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ روس کا مقصد افغانستان نہیں، کیونکہ وہاں تو اس کی کٹھ پتلی حکومت موجود تھی اور ملک کی دو تہائی آبادی ذہنی طور پر اس کے ساتھ تھی، دراصل روس کا مقصد پاکستان کے راستہ خلیج کے تیل پر قبضہ کرنا تھا۔ لہٰذا علما کرام نے روس کو للکارا اور اُس کے ان عزائم کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ علما افغانستان نے بے سروسامانی کے عالم میں جہاد شروع کیا۔

ابتدائی طور پر پاکستان سمیت دنیا بھر میں ان مجاہدین کی سخت مخالفت کی گئی حتیٰ کہ امریکا بھی روس کی سپر طاقت کے خوف سے مجاہدین کی امداد سے کتراتا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ خستہ حال مجاہدین جان و مال کی پرواہ کئے بغیر اتنی بڑی فوج کے آگے سینہ سپر ہو رہے ہیں اور روس کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اُس نے پاکستان اور سعودی عرب کے ذریعے اس جنگ میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

تحریکِ طالبان افغانستان:

افغان جہاد کے خاتمے اور جنرل ضیاء الحق اور اُن کے رفقا کی وفات کے بعد war Lords پر کوئی کنٹرول نہ رہا۔ لہٰذا افغانستان میں مکمل خانہ جنگی اور انارکی نے گھر کر لیا۔ حتیٰ کہ اسی انارکی کے دوران 1994 میں طالبان نے جنم لیا۔ جن کی ایک مخصوص فکر تھی۔ اُس وقت پاکستان میں ایک سوشلسٹ جماعت یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی

اور وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اور وزیر داخلہ جنرل نصیر اللہ بابر تھے۔ طالبان کی تحریک اصلاً افغانستان کی تباہ شدہ صورتِ حال کے خلاف عوام کے سب سے بڑے فعال طبقے یعنی دینی مدارس کے نوجوان طلبہ کا احتجاج تھا۔ اِن نوجوان طلبا کی زیادہ تعداد اُن مجاہدین کے بچوں یا عزیزوں کی تھی جو افغان جہاد میں شریک ہوئے یا انہوں نے اپنے گھر بار مادرِ وطن کو چھوڑ کر پاکستان، ایران یا سعودی عربیہ کے مدارس میں پڑھنا شروع کر دیا اور وہ اپنے مادرِ وطن کی تباہ شدہ صورتحال سے انتہائی مایوس تھے۔

1994ء میں جب طالبان نے مفسدین کے خلاف ''اسپین بولدک'' سے جہاد کا آغاز کیا اور 35 مجاہدین علما جمع ہوئے تو ان میں سے بیشتر مجاہد علما مفتی نظام الدین شامزئیؒ کے شاگرد تھے۔

اس دوران اُسامہ بن لادن نے سعودی عرب میں امریکی فوجیوں کی موجودگی کے خلاف کارروائیوں کا اعلان کیا تو امریکا اور سعودی عرب نے طالبان کی حکومت امارتِ اسلامی افغانستان سے مطالبہ کیا کہ وہ اُسامہ بن لادن کو امریکا یا سعودی عرب کے حوالہ کریں مگر طالبان حکومت نے اس سے انکار کر دیا۔ اس دوٹوک جواب پر امریکا نے طالبان کو سزا دینے اور انکار کا مزہ چکھانے کے لئے ستمبر 1998ء میں اُسامہ بن لادن کے ٹھکانوں پر 70 کروز میزائل داغے۔

طالبان نومبر 1994ء میں نمودار ہوئے اور اسی مہینے میں قندھار پر قبضہ کر لیا اور اگلے دو سال کے اندر اندر یعنی ستمبر 1996ء تک کابل پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس دو سالہ لڑائی کے دوران میں خونریزی یقیناً ہوئی لیکن وہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی جنگوں کے لحاظ سے مقابلۃً بہت کم تھی۔ یہ پورا علاقہ جس پر اب تک طالبان نے قبضہ کیا تھا، پشتون اکثریت کا علاقہ تھا، سوائے ہرات کے، جہاں تاجک اکثریت میں تھے۔ واضح رہے کہ طالبان تحریک کی تقریباً تمام تر لیڈر شپ پشتونوں پر مشتمل تھی۔ تحریک کے وقتاً فوقتاً پچاس بڑے لیڈروں میں سے صرف تین یا چار غیر پشتون تھے۔ (وقتاً فوقتاً اس لئے کہ بسا اوقات ملا محمد عمر اپنی کابینہ میں یک دم کافی تبدیلیاں لے آتے تھے۔) اس کے بعد طالبان اگلے پانچ سال تک غیر پشتون علاقے فتح کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ ان میں تاجک، ہزارہ اور ازبک علاقے شامل تھے۔ ان علاقوں پر قبضہ کے لئے بہت خون ریزی ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ سالوں میں دو طرفہ لڑائی میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں سے کئی علاقوں پر کئی کئی مرتبہ کامیابی اور پسپائی ہوئی۔ مثلاً مئی 1997 میں طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا اور پھر انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اگست 1998 میں طالبان نے ایک دفعہ پھر مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ یہی حالت بہت سے دوسرے علاقوں کی رہی۔ طالبان کی فیصلہ کن شکست تک یہ لڑائی جاری رہی تھی۔ پشتونوں اور غیر پشتونوں کے درمیان اس لڑائی میں دونوں طرف سے ایک دوسرے پر بہت مظالم بھی ڈھائے گئے۔ مثلاً مزار شریف میں ستمبر 1997ء میں دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک کئے۔ اس کے بعد جب اگست 1998 میں طالبان نے دوبارہ مزار شریف پر قبضہ کیا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ وہ دور ہے جب سعودی عرب اور ایران کی پراکسی جنگ نے ایک نئی جہت لی اور اُس کے اثرات پاکستان کے اندر نا تھمنے والے شیعہ سنی فسادات شروع ہوئے یاد رہے کہ آٹھ سالہ عراق، ایران جنگ (20 Sep 1980 - 22 Aug 1988) میں بھی عربوں اور کئی مغربی ممالک نے صدام حسین کا ساتھ دیا بالآخر عراق سے کویت پر حملہ کروا کر پورے مشرق وسطی کو ایک تباہ کن جنگ میں دھکیلا گیا صدام حسین کو عبرت کا نشانہ بنایا گیا اور اُس کی جگہ شیعہ حکومت قائم

کر کے سنی، شیعہ فسادات کی مستقل آبیاری کی جارہی ہے اور اب شام کی صورتحال بھی ہمارے سامنے ہے۔

امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمہ:

اس مختصر تاریخ کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہم ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے امارتِ اسلامی افغانستان حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس زوال کی چند بنیادی وجوہات ہیں:

طالبان کی اکثریت تقریباً پشتونوں پر مشتمل تھی اور وہ اکثر ایک ہی سوچ کے مالک تھے (افغانستان میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی 42%) یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ طالبان نے پشتون علاقے میں جنم لیا۔ ان کی لیڈر شپ اور فوج بھی اکثر پشتونوں پر ہی مشتمل تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ تمام بدامنی دراصل زیادہ تر پشتون علاقے میں تھی۔ طالبان کا ظہور دراصل اسی بدامنی کا ردعمل تھا۔ یاد رہے افغانستان پر ہمیشہ پشتونوں نے ہی حکومت کی ہے۔ ازبک ((9%، تاجک ((27%، ہزارہ ((9% اور دیگر علاقے پرامن تھے۔ وہاں مستحکم اقتدار تھا۔ اس لئے وہاں کوئی ردعمل بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان کو اصل کامیابی پشتون علاقے میں ہی ملی اور اس علاقے میں امن وامان کے قیام سے عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے بعد طالبان نے غیر پشتون علاقوں کا رخ کیا اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ یہ طالبان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ ان علاقوں میں عموماً امن تھا اس لئے طالبان کے حملے کا کوئی جواز نہ بنتا تھا۔ ان علاقوں کے لوگ اور ان کی حکومتیں ممکن ہے طالبان کے معیار اسلام پر پوری نہ اترتی ہوں، تاہم یہ لوگ بہت پُرخلوص مسلمان تھے اور یہ بہت غیر مناسب تھا کہ ان پر فوج کشی کی جاتی۔ جب ان علاقوں پر ایک ایسی فوج نے حملہ کیا جو تقریباً ساری کی ساری پشتونوں پر مشتمل تھی اور ہرات کا سابقہ ریکارڈ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے مقامی لوگوں کو شامل نہیں کیا، تو اس سے قدرتی طور پر غیر پشتونوں نے یہی سمجھا کہ پشتون ان کو غلام بنانے آرہے ہیں۔ چنانچہ غیر پشتونوں نے اس کے خلاف نہایت سخت مزاحمت کی۔ اور آخر وقت تک طالبان اس قابل نہیں ہوسکے کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کرسکیں۔

طالبان کی اکثریت ایک ہی طبقے یعنی دینی مدارس کے علما اور طلبہ پر مشتمل تھی اور پھر ان کی حکومت میں اکثریت بھی اُن کی ہوتی تھی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ملا عمر بذاتِ خود اپنے سات سالہ درس نظامی کورس کو مکمل نہ کرسکے تھے۔ صرف انہوں نے درجہ ثالثہ تک مکمل کیا تھا۔ یہاں یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ہر طالب عالم دین نہیں تھا، لیکن ہر طالب داڑھی اور پگڑی کے ساتھ حلیے کے اعتبار سے عالم نظر آتا تھا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کو چلانے کے لیے حکومتی انتظام و انصرام میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا شامل ہونا ازحد ضروری تھا اور ایسا الحاق نہ ہونے کی وجہ سے طالبان اپنی استطاعت، استعداد اور قوت میں اضافہ نہ کرسکے مزید یہ کہ طالبان کے اذہان میں بھی وسعت نہ ہوسکی۔ جس کے نتیجے میں باقی تمام طبقات میں احساس پیدا ہوا کہ طالبان انہیں اپنا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔

طالبان کے لئے مناسب حکمت عملی یہ تھی کہ ستمبر 1996 میں کابل اور پورے پشتون بیلٹ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ یہ اعلان کرتے کہ وہ باقی تمام نسلی گروہوں اور طبقوں سے گفتگو کے ذریعے سے ان کو بھی شریک اقتدار کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اُسی وقت افغانستان میں امن کی بنیاد پڑ جاتی۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے بیرونی دباؤ (بشمول عرب ممالک) پر ایسا نہیں کیا دوسری طرف ایران بھی افغانستان میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے کے لئے کئی گروپوں کو مسلح کرنے میں لگ گیا۔ جس کے نتیجے میں افغانستان کے مزید پانچ برس خانہ جنگی کی نذر ہوئے اور مزید لاکھوں افراد موت کی

بھینٹ چڑھ گئے۔ جہاں ہم طالبان کو اس کا قصوروار سمجھتے ہیں وہاں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی ناکامی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے طالبان کی حکومت کو بین الاقوامی دھارے میں شامل ہونے کیلئے کوئی مؤثر اور بامعنی کردار ادا نہیں کیا اور اِسی طرح مغرب بھی طالبان کو اِس پورے دور میں بین الاقوامی برادری کا ایک مؤثر حصہ بنانے میں ناکام ہو گئے۔ یہاں تک کہ 1999ء میں پاکستان کی جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ کر منتخب وزیرِاعظم محمد نواز شریف کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ اور جنرل پرویز مشرف کو پاکستان کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا گیا۔

گیس اور تیل کی کمپنیوں پر مشتمل ایک کنسورشیم CentGas

عالمی سطح پر یہ بات بھی زبان زدِ عام ہے کہ وسطی ایشیا سے تیل کی نئی لائن بچھانے کے لیے امریکی تیل کی کمپنی UNOCAL نے کچھ دوسری تیل کی کمپنیوں کے ساتھ مل کر گیس اور تیل کی آٹھ بڑی کمپنیوں پر مشتمل ایک کنسورشیم Cent Gas کے نام سے بنایا جس کا کام افغانستان کے راستے ترکمانستان سے پاکستان تک گیس کی پائپ لائن بچھانے کے لیے امریکہ نے طالبان کے ساتھ مذاکرات کیے اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل نہ ہونے پر مذاکرات ناکام ہو گئے۔ جس کی وجہ سے طالبان کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ 9/11 کے واقعہ سے ساڑھے تین سال قبل 99-1998 میں کر لیا گیا تھا۔[1] اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 12 فروری 1998ء میں امریکہ کی بڑی تیل کی کمپنیوں میں سے ایک UNOCAL کارپوریشن جو کہ CentGas کنسورشیم کا اہم حصہ تھی وہ انتہائی سیاسی اثر رسوخ رکھتی ہے۔(2) اُس کے وائس پریذیڈنٹ مسٹر جان ماریسکا (John Maresca) نے امریکی کانگریس کی بین الاقوامی تعلقات کی کمیٹی کو وسطی ایشیا، ایران، افغانستان، پاکستان اور بھارت پر اپنا بیان دیتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ افغانستان میں طالبان کی جگہ ایسی حکومت آنی چاہیے جو کہ بین الاقوامی سطح پر قابلِ قبول ہو۔ گویا کہ امریکی حکومت اور تیل کا کاروبار کرنے والی کمپنیاں 9/11 سے پہلے طالبان کو ہٹانے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ جان ماریسکا کے بیان کا کچھ حصہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

"The Caspian region contains tremendous untapped hydrocarbon reserves. Just to give an idea of the scale, proven natural gas reserves equal more than 236 trillion cubic feet. The region's total oil reserves may well reach more than 60 billion barrels of oil. Some estimates are as high as 200 billion barrels.

One obvious route south would cross Iran, but this is foreclosed for American companies because of U.S. sanctions legislation. The only other possible route is across Afghanistan, which has of course its own unique challenges. The country has been involved in bitter warfare for almost two decades, and is still divided by civil war. From the outset, we have made it clear that construction of the pipeline we have proposed across Afghanistan could not begin until a recognized government is in place.

The 1,040-mile long oil pipeline would extend south through Afghanistan to an export terminal that would be constructed on the Pakistan coast.

The proposed 790-mile pipeline will open up new markets for this gas, traveling from

Turkmenistan through Afghanistan to Multan in Pakistan.

"ترجمہ:..... ''کیسپین (CASPIAN) یا قزوین کے (سمندری) علاقے میں ہائیڈروجن گیس کے وسیع ذخائر کو ابھی تک کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ 236 ٹریلین مربع فٹ قدرتی گیس کے ذخائر ہیں اور تیل کے 60 بلین بیرل اور بعض اندازوں کے مطابق 200 بلین بیرل موجود ہیں۔

ایک واضح آپشن یہ ہے کہ تیل کی پائپ لائن ایران کے راستے سے بچھائی جائے لیکن یہ دروازہ (ایران پر) امریکی پابندیوں کی وجہ سے امریکی کمپنیوں پر پہلے سے بند ہے۔ دوسرا ممکنہ راستہ افغانستان کے ذریعے ہے جس کے اپنے چیلنجز ہیں۔ یہ ملک تقریباً دو دہائیوں سے باہمی لڑائی جھگڑوں میں پھنسا ہوا ہے اور ابھی تک سول جنگ کی وجہ سے بٹا ہوا ہے۔ ہم نے شروع سے ہی یہ بات واضح کردی ہے کہ جس پائپ لائن کی ہم نے افغانستان کے راستے سے (بچھانے کی) تجویز دی ہے وہ اس وقت تک شروع نہیں کی جائے گی جب تک افغانستان میں ایک تسلیم شدہ حکومت کا قیام عمل میں نہیں آتا۔

یہ 1040 میل تیل کی لائن جنوب کو افغانستان کے راستے پاکستان کی بندرگاہ پر تعمیر شدہ ایک ایکسپورٹ ٹرمینل کے ساتھ جوڑے گی۔

790 میل لمبی مجوزہ پائپ لائن ترکمانستان سے ہوتی ہوئی افغانستان کے راستے ملتان پاکستان تک گیس کی نئی مارکیٹ کھولے گی۔''(3)

طالبان اور اسلام:

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ طالبان انتہائی پختہ عقیدے کے مالک مسلمان تھے۔ اپنے نظریے کے ساتھ بے پناہ اخلاص رکھتے تھے۔ لیکن وہ اسلام کی صرف اور صرف اسی تعبیر کو قبول کرنے اور نافذ کرنے کو درست سمجھتے تھے جو ان کے نزدیک درست تھی۔ اسی لئے کئی مواقع پر اپنے اساتذہ جو کہ جید علما کرام تھے اُن کی بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی غیر لچکدار رویہ اُن کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ جس طرح انہوں نے حادثہ 9/11 کے بعد حضرت مولانا سلیم اللہ خان نور اللہ مرقدہ، مفتی نظام الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات کے بعد بھی بین الاقوامی معاملات میں اُن کا رویہ تبدیل نہ ہوا۔ بدقسمتی سے طالبان نے اسلام کے نام پر ایک ایسا طریقہ کار اپنایا جس میں خیریت تو موجود تھی لیکن خیریت مفقود تھی جس سے اسلام کا غلط تاثر پیدا ہوا۔

مزید برآں طالبان نے اسلام کے فوری نفاذ کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اس کو حاصل کرنے میں اُن سے کئی غلطیاں بھی ہوئیں۔ انہوں نے کئی ایسے احکام صادر کئے جو قبل از وقت تھے۔ اگر وہ عوام کی ذہن سازی کر کے موسیقی، داڑھی، خواتین کی تعلیم اور پردہ اور میڈیا کے حوالے سے احکامات تدریجاً لاگو کرتے تو بہتر نتائج سامنے آتے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ طالبان اسلام کے نام پر پشتون کلچر کا نفاذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گویا کہ امت مسلمہ کو نفاذِ اسلام کے لئے امارات افغانستان کی شکل میں جو تجربہ گاہ میسر آئی تھی اُسے کھو دیا گیا۔ اب ایسا سنہری موقع دوبارہ میسر آنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔

خلفائے راشدین کی حکمت:

مندرجہ بالا احکامات صادر کرنے سے پہلے عوام کی تربیت کر کے حالات کو سازگار بنانا انتہائی ضروری تھا۔ طالبان کو چاہیے تھا کہ وہ اسلام کے احکام کو اسی طرح نافذ کرتے جس طرح حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے نافذ کیا تھا۔ کہ خلفائے راشدین کے دور میں قطعی احکام اور ارکان کو سختی سے نافذ کیا گیا جیسے زکوۃ کا نظام یا مرتدین سے قتال وغیرہ اس کے علاوہ ہر ہدایت اور حکم کو ترغیب، تلقین اور ذہنی تربیت کے ذریعے سے نرمی اور محبت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف بڑے جرائم پر انتہائی سزائیں بھی صرف اسی وقت نافذ کی گئیں جب معاشرے کی پوری تربیت کی گئی اور جب ان جرائم کی طرف لے جانے والے عوامل تقریباً ختم ہو کر رہ گئے۔

درحقیقت طالبان کا تجربہ نفاذ اسلام اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ تھا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے خواتین اور عام لوگوں میں ناپسندیدگی اور لاتعلقی کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی۔ طالبان کا یہ فہمِ اسلام اور اس ضمن میں ان کے اقدامات درحقیقت امریکہ اور مغرب کے بہت زیادہ مفاد میں تھے۔ اگر طالبان کی حکومت بن لادن کی سرپرستی نہ کرتی، تو امریکہ کو افغانستان پر حملہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ درحقیقت اس طرح کے تعبیرِ اسلام کی وجہ سے مغرب کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے ذرائع ابلاغ پر اسلام کے خلاف خوب پروپیگنڈا کرے۔ چنانچہ اس طرح کے تعبیرِ اسلام پر مبنی حکومت مغرب کے مفاد میں ہوتی ہے کیونکہ اس طرح وہاں کے عوام اسلام سے متنفر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال سعودی عرب ہے۔ مثلاً عورتوں کی ڈرائیونگ اور تعدد ازدواج کا مسئلہ کو سامنے رکھیں تو نظر آتا ہے کہ سعودیہ میں بھی سرکاری سطح پر کسی حد تک بعض پہلوؤں کے اعتبار سے طالبان سے ملتا جلتا فہمِ اسلام نافذ ہے، تاہم مغرب کو اس حکومت سے کوئی خطرہ نہیں۔ مغربی ذرائعِ ابلاغ اس حکومت کی پالیسیوں کے خلاف پروپیگنڈے بھی کرتے ہیں اور امریکہ ان عرب ممالک سے اپنے سارے سیاسی فائدے بھی حاصل کرتا ہے۔ اِس لئے طالبان کو چاہیے تھا کہ پہلے عوام کی بتدریج ذہن سازی اور اصلاح کرتے اور پھر اِسی رفتار سے اِسلام کا نفاذ ہوتا کیونکہ عوام الناس طالبان سے اس لئے بہت خوش تھے کہ انہوں نے عوام کے جان و مال کا تحفظ لاء اینڈ آرڈر کے ذریعے یقینی بنایا اور پوست کی کاشت مکمل طور پر بند کر دی۔ یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دسمبر 2007ء میں پاکستان مخالف 13 گروپوں نے مل کر بیت اللہ محسود کی سربراہی میں تحریک طالبان کے نام سے ایک نئی عسکری تنظیم تشکیل دی اور جس نے پاکستان میں بہت ساری دہشت گردی کی کارروائیاں کیں اور سینکڑوں معصوموں کی جانیں لیں۔ لہٰذا ہمیں طالبانِ پاکستان اور طالبانِ افغانستان کو دو علیحدہ گروپ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔

برطانوی صحافی ایوان رڈلی کا اسلام قبول کرنا:

طالبان کا عمومی طور جو میڈیا کے ذریعے تعارف ہوتا ہے اُس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں جمہوریت، آزادئ رائے اور اپنے مخالفین کے لئے انصاف، عفو و درگزر اور رواداری کا جذبہ مفقود ہے۔ دوسری طرف اگر ہم ایک غیر مسلم برطانوی صحافی ایوان رڈلی (Yvonne Ridley) جو کہ افغانستان کا غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرتے ہوئے گرفتار کی گئی تھی، کی طالبان کی دس روزہ قید میں گزرے ہوئے وقت سے متعلق کہانی کو پڑھیں تو یقین ہوتا ہے کہ

انہوں نے واقعی ایک غیر مسلم قیدی عورت کے ساتھ جس طرح کا انسانی برتاؤ کیا وہ قابل ستائش ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے اس احسن سلوک سے متاثر ہو کر محترمہ نے اسلام قبول کر کے اپنا نام ''مریم'' رکھا۔ آج کل یہ محترمہ میڈیا پر مسلمانوں کا دفاع کر رہی ہے۔ اپنی کتاب In the hands of the Taliban میں رقم طراز ہیں:

"When I was released everyone expected me to relay horrific tales of brutality (but the) Taliban treated me with great respect…..very very well". "Whilst the Taliban had faults but they were on the whole likeable"

"Discovering Islam was an eye opener". "Islam is a great unifier, a religion of social justice; it transcends race and national borders. Islam has inspired more Scholars, mystics and poets than soldiers"

"Since the crusades the west has held a stereotypical image of Islam, (that) women are subjugated is a nonsense. I admire the way it supports and promotes women."

"People often mix up religion and cultures".

ترجمہ:..... ''جب میں (طالبان کی) جیل سے رہا ہوئی تو ہر کوئی مجھ سے یہ توقع کر رہا تھا کہ میں ان کے ظلم و بربریت کی خوفناک کہانیاں سناؤں گی۔ (لیکن) طالبان نے میرے ساتھ انتہائی احترام والا سلوک کیا..... بہت بہت اچھا (سلوک کیا)۔ جہاں طالبان میں کچھ خامیاں تھیں وہاں وہ مجموعی طور پر چاہنے کے قابل (یعنی اچھے) لوگ تھے۔

اسلام کے متعلق جاننا میرے لیے چشم کشا (واقعہ) تھا۔ (لوگوں کو) اسلام جوڑتا ہے۔ یہ معاشرتی انصاف کا مذہب ہے۔ اسلام نسلی اور قومی حدود سے ماورا ہے۔ اسلام نے فوجیوں سے زیادہ اہل علم، صوفیا اور شعرا کو متاثر کیا ہے۔ صلیبی جنگوں کے وقت مغرب نے اسلام کے متعلق ایک دقیانوسی چشم کا نقشہ بنا رکھا ہے کہ عورت محکوم ہے۔ یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔ میرے لیے یہ بات قابل ستائش ہے جس طرح یہ (اسلام) عورتوں کے لئے ممد و معاون ہے۔ کچھ لوگ مذہب اور ثقافت کو ملا دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بات کو سمجھ نہیں پاتے۔''(4)

اسی طرح طالبان اگر ستمبر 1996 کے بعد ملک کے اندر مکالمہ پر مبنی حکمت عملی کی ابتدا کرتے اور اقوام عالم سے اس میں مدد کی اپیل کرتے۔ اور اس میں پاکستان بھی اگر مخلصانہ طور پر تدبر کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے طالبان کی مدد کرتا اور ایران اور سعودی عرب کے مدد کردہ گروپوں کو ایک جگہ بٹھا کر افغانستان کی ترقی کے لئے کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کرواتا تو شاید اب تک افغانستان کی کایا پلٹ چکی ہوتی اور طالبان غالب پارٹنرز کی حیثیت سے ایک خوبصورت، معتدل اسلامی افغانستان کے حکمران ہوتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ لیکن دوسری طرف ناقدین یہ بھی کہتے ہیں کہ طالبان چاہے کچھ بھی کر لیتے افغانستان پر تیل کی پائپ لائن کی وجہ سے امریکہ اپنا پلان کسی بھی صورت میں ادھورا نہ چھوڑتا۔

طالبان کی حکومت کے بعض مثبت پہلو بھی تھے مثلاً انہوں نے منشیات کا صفایا کر دیا، ہیروئن، چرس، افیون اور اسی طرح کی تمام چیزوں کا انتہائی کامیابی سے خاتمہ کیا۔ پھر امن وامان اور جرائم کی عمومی بیخ کنی اور انصاف عام آدمی کی پہنچ میں تھا۔

القاعدہ کے متعلق طالبان کی پالیسی:

طالبان کی خارجہ پالیسی پہلے دن سے ہی دوسرے ممالک کے لئے تحقیر کی بنیاد پر قائم تھی۔ دنیا بھر میں پاکستان ہی

ان کا ساتھی تھا۔ مگر پاکستان کی درخواست کے برعکس انہوں نے ڈیورنڈ لائن (Durand Line) کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے یہ پاکستان کے وجود کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔ پاکستان کے بے شمار مجرموں نے (جن کے ہاتھ فرقہ وارانہ اور اغوا کی وارداتوں سے آلودہ تھے) افغانستان میں پناہ لی تھی۔ انہیں پاکستانی حکام کے حوالے کرنے سے مسلسل ٹال مٹول کا رویہ اختیار کئے رکھا۔ یہی صورت حال ان کی ''القاعدہ تنظیم'' اور ''بن لادن'' کے بارے میں تھی۔ دوسری طرف ایران کی مدد سے چلنے والی عسکری تنظیمیں بھی مذکورہ بالا سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ اور ایجنسیاں اس بات پر سخت پریشان تھیں کہ وہ اپنا اثر ورسوخ پاکستانی شیعہ کمیونٹی کے اندر بڑھانے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔

بن لادن 1980 میں افغانستان آئے۔ اور دس برس بعد واپس سعودی عرب چلے گئے۔ اگلے دو سال وہ سعودی عرب میں ہی مقیم رہے۔ پھر 1992 میں وہ سوڈان چلے گئے۔ وہاں چار برس رہنے کے بعد وہ مئی 1996 میں اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت جلال آباد پہنچے۔ اس وقت یہاں شمالی اتحاد اور طالبان کی کشمکش عروج پر تھی، تاہم بن لادن نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ان کے جلال آباد پہنچنے کے چار مہینے بعد وہاں طالبان کا قبضہ ہو گیا۔

سعودی عرب میں امریکی افواج کی آمد:

سوال یہ ہے کہ افغانستان چھوڑنے کے چھ سال بعد 1996 میں اُسامہ بن لادن واپس کیوں آئے؟ ظاہر ہے کہ وہ اس دفعہ نہ تو جہاد کے لئے آئے تھے، نہ ہی شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان خانہ جنگی میں حصہ لینے آئے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب خلیجی جنگ کے موقع پر امریکی افواج سعودی عرب پہنچیں تو بن لادن نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف جان کر ان پر کھلے بندوں تنقید شروع کر دی۔ جب خلیجی جنگوں کے بعد بھی امریکی افواج سعودی عرب میں مقیم رہیں تو بن لادن نے سعودی حکمرانوں کو اسلام کا غدار کہنا شروع کیا۔ اور اپنے لئے یہ مشن بنا لیا کہ وہ امریکی افواج کو سعودی عرب سے نکال کر رہیں گے۔ یہی مشن لے کر وہ سوڈان گئے اور جب سوڈان پر دباؤ بہت بڑھ گیا تو یہی مشن لے کر وہ افغانستان چلے آئے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں امریکی افواج کی آمد کے متعلق چند اہم امور کی نشاندہی کی جائے۔ عراق نے کویت پر قبضہ کرنے کے بعد اس بات کا بار بار اعادہ کیا کہ اس کا اگلا ٹارگٹ اب سعودی عرب ہے۔ تاہم جب کویت کو آزاد کرا لیا گیا اور عراق کو بالکل بے دست و پا بنا لیا گیا، تو پھر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ سعودی عرب میں امریکی افواج موجود رہیں۔ چنانچہ ان افواج کو سعودی عرب کی سرزمین سے نکالنے کا بن لادن کا مطالبہ حق بجانب تھا۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا اس مقصد کے لیے پرامن حکمت عملی اختیار نہیں کی جا سکتی تھی؟ اگر بن لادن چاہتے تھے کہ ان افواج کو سعودی عرب سے نکال دیا جائے تو اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ بن لادن خاندان کا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے وہ سعودی شاہی خاندان کے اندر مستقل اس مقصد کے لئے ترغیب دینا جاری رکھتے اور یہ کوشش کرتے رہتے کہ سعودی افواج کو اتنا مضبوط بنایا جائے کہ وہ اپنے ملک کا دفاع کرنے کے قابل ہو سکیں اور یوں امریکی افواج کی کوئی ضرورت نہ رہے۔ بن لادن خاندان کے نہ صرف سعودی حکمرانوں بلکہ جارج بش سے نہایت گہرے، ذاتی اور کاروباری تعلقات تھے اور اگر بن لادن اس مقصد کے لئے اپنی دولت اور دوسرے ذرائع استعمال کرتے تو شاید اب تک امریکی افواج سعودی عرب سے نکل چکی ہوتیں۔ (واضح رہے کہ 2005ء میں امریکہ نے سعودی عرب سے اپنی تقریباً

ساری فوج نکال لی تھی۔ تاہم اب بھی کویت، قطر، بحرین اور متحدہ عرب امارات میں امریکی افواج موجود ہیں۔ ان سب ممالک کے بادشاہ امریکی افواج کی موجودگی کو اپنے اقتدار کے مفاد میں سمجھتے ہیں)۔

گویا اصل مسئلہ یہ تھا ہی نہیں کہ صرف سعودی عرب سے امریکی فوج نکل جائے۔ اصل مسئلہ تو اس سے کہیں زیادہ گھمبیر ہے، وہ یہ کہ مسلم حکمرانوں نے اپنے دفاع اور معیشت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اس لیے کچھ ممالک اپنے دفاع کے لیے بڑی طاقتوں کے محتاج ہیں اور کچھ اپنی معیشت کے لیے ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھتے ہیں اگر ان دو بنیادی مسئلوں کو مسلمان حکمران حل کر لیتے تو کسی ملک کو اسلامی ممالک میں دراندازی کی جرأت نہ ہوتی۔

بہرحال جب بن لادن مئی 1996 میں افغانستان آئے تو ان کے سامنے یہی مشن تھا کہ امریکی افواج کو سعودی سرزمین سے طاقت کے بل پر نکال باہر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگست 1996 میں انہوں نے پہلی بار امریکیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ طالبان کے برسرِاقتدار آنے کے بعد انہوں نے ملا عمر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور قندہار چلے گئے۔ اُن کی زیرِسرکردگی بہت سے کیمپ بنائے گئے جہاں سیکڑوں عربوں اور دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مسلح تربیت دی جاتی تھی۔ 23 فروری 1998 کو خوست کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے ایک منشور جاری کیا جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا گیا اور یہ فتویٰ دیا گیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے ہر باشندے، خواہ وہ سویلین ہوں یا فوجی، کو قتل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

جب اگست 1998 میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارتخانوں میں بم دھماکوں سے دوسو بیس افراد ہلاک ہوئے، تو قدرتی طور پر سب کی نگاہیں بن لادن کی طرف اٹھیں۔ بن لادن نے بھی اپنے ایک بیان میں حملہ آوروں کی تعریف و تحسین کی۔ جتنے افراد کو ان کیسوں میں موردِالزام ٹھہرایا گیا اور جن کو عدالتوں کی طرف سے سزائیں دی گئیں، ان سب نے القاعدہ سے تعلق کا اعتراف کیا۔ یہ عین قدرتی امر تھا کہ امریکہ طالبان حکومت سے یہ مطالبہ کرتا کہ القاعدہ تنظیم سے وابستہ افراد کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس معاملے میں امریکہ نے اقوامِ متحدہ کو بھی ساتھ ملایا اور اس کی طرف سے یہ متفقہ قرارداد منظور ہوئی کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔

اس کے جواب میں طالبان کی طرف سے دو وضاحتیں پیش کی گئیں۔ پہلا جواز یہ تھا کہ یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور دوسرا جواز یہ تھا کہ ان کی نقل و حرکت محدود کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں جواز بہت کمزور تھے۔ کسی مہمان کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ میزبان ملک میں بیٹھ کر کسی اور ملک کے خلاف اعلانِ جنگ کرے۔ اس اعلانِ جنگ کو آج تک واپس نہیں لیا گیا۔ طالبان نے بھی کبھی اس کی مذمت نہیں کی۔ بلکہ بن لادن نے ہر موقع پر اس کی بار بار تائید و حمایت کی۔

گویا القاعدہ تنظیم کے ہیڈکوارٹر کی افغانستان میں موجودگی طالبان کے لئے آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ اس کا ادراک نہ کر سکے اور صلح حدیبیہ کے واقعہ سے کوئی سبق حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

9/11 کو امریکی ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور جارج بش کا ''Crusade''

۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ رونما ہوا اور امریکا نے اُسامہ بن لادن کو اُن کے حوالے کرنے اور تمام ٹریننگ سنٹر بند کرنے اور امریکی افواج کو کھلے عام افغانستان میں رسائی کی شرائط پیش کیں بصورتِ دیگر حملہ کی دھمکی دی اور پاکستان کے جنرل پرویز مشرف کو ٹیلی فون پر دھمکی دی کہ دوستی یا دشمنی؟ دوستی میں طالبان حکومت کے خاتمہ

کے لئے پاکستان کی سرزمین کے استعمال کے ساتھ تمام معلومات فراہم کرنا شامل تھا جبکہ دشمنی کی صورت میں پاکستان پر بھی حملہ کیا جا سکتا تھا۔ امریکی صدر جارج بش کے مندرجہ ذیل بیانات سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس حملے کو ''صلیبی جنگ'' کا نام دے کر اعلان کیا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ آ جائیں یا ہمارے مخالفین میں، یعنی درمیانی کوئی راستہ نہ دیا گیا:

" This Crusade, this war on terror, is going to take a while"

ترجمہ:..... یہ صلیبی جنگ، یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ، کافی عرصہ تک لڑی جائے گی۔(5)

" You are either with us or against us"

ترجمہ:..... یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف۔(6)

پاکستانی حکمرانوں نے دنیا کی واحد سپر پاور امریکا سے دشمنی کی بجائے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور طالبان کی حمایت سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اس سے قبل ہی ملا عمر اعلان کر چکے تھے کہ جنگ اور امارتِ اسلامی کا خاتمہ قبول ہے مگر اُسامہ بن لادن ہمارا مہمان ہے اس لئے ہم اُسے امریکا کے حوالے نہیں کریں گے۔ حکومت پاکستان نے اگرچہ امریکا کو نا صرف ہوائی اڈے مہیا کئے بلکہ مکمل اطلاعات بھی فراہم کیں تاہم پاکستان نے جنگ روکنے کی کوششیں بھی کیں، خصوصاً اس سلسلہ کی بڑی جدوجہد آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل محمود نے کی، جو کہ ۱۱/ستمبر کو امریکا میں تھے انہوں نے جنگ کو ٹالنے کے لئے افغانستان کے کئی دورے بھی کئے۔ آخری حربہ کے طور پر انہوں نے مولانا فضل الرحمن، قاضی حسین احمد، مولانا سمیع الحق کو لے جانے کی کوشش کی مگر مولانا فضل الرحمن اس کے لیے کسی طور پر تیار نہیں ہوئے کہ وہ ملا عمر سے اُسامہ بن لادن کی حوالگی کی بات کے لئے پاکستان کے سفیر بن کر جائیں۔

گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد امریکہ نے بہت واضح الفاظ میں طالبان کو الٹی میٹم دیا کہ القاعدہ تنظیم کے اہم ارکان کو اس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اقوام متحدہ نے بھی اپنی متفقہ قرارداد کے ذریعے سے طالبان سے یہ مطالبہ کیا کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔ اس وقت طالبان کے پاس دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ القاعدہ کے اہم ارکان کو امریکہ کے حوالے کر کے اپنے ملک، حکومت اور عوام کو تباہی سے بچایا جائے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ انکار کیا جائے۔ تیسرا راستہ یہ تھا کہ اُسامہ کو کسی دوسرے ملک میں بھیج دیا جاتا۔ جبکہ طالبان نے انکار والا راستہ پسند کیا۔ یہ بات ہر انسان کو سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس انکار کی صورت میں القاعدہ کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت بھی جائے گی اور ممکنہ تباہی سے اموال و املاک اور عام انسانی جانوں کا ضائع ہونا بھی یقیناً ہوگا۔

جنرل مشرف نے 22 ستمبر 2006ء کو برطانوی اخبار ''گارڈین'' سے انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ صدر بش نے اسسٹنٹ سیکریٹری آف سٹیٹ کے ذریعے ہمیں دھمکی بھجوائی تھی کہ اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے تو ہم تمہیں واپس پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے۔(7)

پاکستان کے جید علمائے کرام کی ملا عمر سے ملاقات

9/11 کے حادثے کے بعد جب افغانستان پر امریکی حملے کا یقین ہو گیا تو پاکستان سے جید علما کرام کا ایک وفد جو مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مفتی نظام الدین شامزئی، ڈاکٹر شیر علی، قاری سعید الرحمن،

قاری عتیق الرحمن اور مفتی جمیل احمد خان پر مشتمل تھا۔ان علما نے ملاعمر اور اُن کے رفقا سے تفصیلی ملاقات کی۔ کیونکہ یہ موضوع انتہائی اہم اور حساس ہے اس لئے میں نے اس موضوع پر رہنمائی کے لئے امت مسلمہ کے ایک عظیم سکالر اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہٗ سے مشاورت کی جس میں یہ طے ہوا کہ ہمیں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے ایک ملاقات کرنی چاہیے کیونکہ مفتی صاحب اُس وفد میں شامل تھے جس نے 9/11 کے حادثے کے بعد امریکی انتظامیہ کے طالبان پر دباؤ بڑھانے کے بعد ملاعمر کے ساتھ مذاکرات کیے۔حضرت قاری صاحب نے محبت فرمائی اور حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب سے اس چیز کا ذکر فرمایا اور وقت لے لیا۔ہم دونوں ملتان سے سیدھا کراچی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی قیام گاہ پر دارالعلوم کورنگی پہنچے۔ یہ دارالعلوم تقریباً 172 ایکڑ رقبے پر محیط ہے ۔گیٹ سے داخل ہوتے ہی انتہائی کشادہ معیاری اور صاف ستھری سڑکیں،خوبصورت دورویہ درختوں سے مزین پرسکون ماحول آنے والے کو بار بار احساس دِلاتا ہے کہ اپنا ٹھکانہ یہیں کرلو۔ایک انتہائی وسیع وعریض مسجد گیٹ میں داخل ہوتے ہی آنے والے کا استقبال کرتی ہے۔اس مسجد کا صرف ایک ہال تقریباً 6 کنال جگہ پر مشتمل ہے اور یہ ہال بغیر کسی ستون کے تعمیر کیا گیا ہے۔مزید برآں طلبہ کے لئے جدید نظام تعلیم کے علاوہ بہترین رہائش گاہیں بمع بینک،ڈسپنسری،شاپنگ سنٹر موجود ہیں۔حضرت مفتی رفیع صاحب نے مسجد کے دورے کے دوران انتہائی مفید معلومات مہیا کیں تو ایسے لگا جیسے حضرت مفتی صاحب خود ایک بڑے انجینئر اور آرکیٹیکٹ ہوں،اور کیوں نہ ہوں کہ اس پورے منصوبے کا تخیل انہوں نے ہی دیا ہے۔میری رائے میں یہ دارالعلوم بین الاقوامی یونیورسٹیوں کے معیار سے کم نہیں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ حکومتی اداروں، وزرا اور بیرونی سفرا کو اس ادارے کا ایک بار ضرور دورہ کرنا چاہیے اور مدارس کے ناقدین کو تو یقینی طور پر اس جامعہ کو وِزٹ کر کے حقیقت حال جاننی چاہیے۔

ایک پرتکلف عشائیہ کے بعد ہر دو حضرات کو کتاب کا مسودہ دکھایا گیا اور وفد کی طالبان سے ملاقات کے متعلق حضرت مفتی تقی صاحب کی رائے لینے کی درخواست کی گئی جو کہ حضرت نے قبول کی اور فرمایا کہ اِس موضوع پر دفتر میں بیٹھ کر کل تفصیلی بات چیت کرلیں گے۔مفتی رفیع عثمانی صاحب کے فرزند ارجمند مفتی زبیر عثمانی صاحب نے بھی اِس ضمن میں کافی رہنمائی کی۔

مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں کتاب کا مسودہ پیش کیا تو انہوں نے اُسی وقت اُس کی ورق گردانی شروع کر دی اور بالخصوص کتاب سے مندرجہ ذیل پیراگراف پڑھ کر تعریفی کلمات فرمائے اور دعائیں دیں۔

> ''پہلے ظلم کے خاتمہ کے لیے یا کسی تنازعہ کے حل کے لیے جنگ لڑی جاتی تھی لیکن اب ظلم یہ ہے کہ اسلحہ کو بیچنے کے لیے پہلے جنگی ماحول پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال کے لیے کسی ایک ملک کو ٹیسٹنگ گراؤنڈ کے طور پر چنا جاتا ہے،آج کل مسلم دنیا کو مستقل طور پر ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنا دیا گیا ہے۔''

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کا بیان:

اگلے روز مجھے حضرت شیخ الاسلام کے دفتر میں لے جایا گیا کہ دن بارہ بجے کا وقت طے تھا۔حضرت والا ناسازیٔ طبیعت کے باوجود تشریف لائے اور اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔عجیب اتفاق ہے کہ بیان کے بعد

وہاں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے نائب ناظم مولانا اللہ وسایا صاحب اور ختم نبوت کراچی کے امیر اور مبلغ مولانا قاضی احسان احمد صاحب بھی تشریف لائے اور اس مبارک سفر میں میری ان کے دفتر میں ظہرانے پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب کی گفتگو درج ذیل ہے۔''

''ستمبر 2001ء میں امریکا کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کا ذمہ دار امریکی انتظامیہ کی طرف سے القاعدہ کو ٹھہرایا جا رہا تھا اور طالبان سے یہ مطالبہ بڑی سختی سے کیا جا رہا تھا کہ القاعدہ کی لیڈر شپ کو امریکا کے حوالے کیا جائے جس پر خطے کے مسلمان بالعموم اور علمائے کرام بالخصوص کافی فکر مند نظر آ رہے تھے۔ اسی دوران طالبان کے مقرر کردہ کراچی کے قونصل جنرل (شاید رحمت اللہ کاکا خیل) نے ہمارے ساتھ رابطہ کیا کہ بہت بڑا خطرہ لاحق ہے کیونکہ ملا عمر اُسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اگر آپ علمائے کرام کا ایک وفد افغانستان جا کر ملا عمر سے مذاکرات کر کے صورتِ حال کو سُلجھا لیں تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے مشاورت کے بعد مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مفتی نظام الدین شامزئی، ڈاکٹر شیر علی، قاری سعید الرحمن، قاری عتیق الرحمن اور مفتی جمیل احمد خان پر مشتمل وفد تشکیل دے کر افغانستان جانے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اب ہمارے لئے موجودہ حساس صورتِ حال میں افغانستان میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لہٰذا لا جسٹک اور وفد کی حفاظت کے لئے آئی ایس آئی کے سربراہ، لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد سے بات چیت کی گئی، جنہوں نے طیارے کا انتظام کیا تا کہ ہم طالبان سے ملاقات کر کے دن بھر میں واپس آ جائیں۔ مولانا سلیم اللہ خان کی سربراہی میں پاکستان کے علمائے کرام کے وفد نے ملا عمر سے قندھار میں ایک تفصیلی ملاقات کی۔ ملا عمر کا موقف تھا کہ اُسامہ بن لادن ایک مجاہد ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں انہوں نے 9/11 والے دھماکے نہیں کروائے۔ علمائے کرام کے وفد نے انہیں مسائل کو مذاکرات سے حل کرنے کا مشورہ دیا اور حضور ﷺ کی زندگی کی کئی مثالیں بشمول صلح حدیبیہ ان کے سامنے رکھیں اور افغان قونصل جنرل کی تجویز پر ملا عمر کو مشورہ دیا گیا کہ اِن مشکل حالات میں طالبان خود کوئی فیصلہ نہ کریں بلکہ اسلامک کانفرنس کی تنظیم OIC جس کو اب اسلامی تعاون کی تنظیم کہا جاتا ہے کے ذیلی ادارے اسلامک فقہ اکیڈمی سے شرعی فیصلہ لے لیا جائے اور اس کے بارے میں امریکا کو بھی باخبر رکھا جائے۔ اس سے تمام پارٹیوں کو کچھ سوچنے کا وقت بھی ملے گا اور امریکا کے حملے کا فوری خطرہ بھی ٹل جائے گا۔ یاد رہے کہ ان مذاکرات میں جنرل محمود احمد کی کوئی مداخلت نہیں تھی کیونکہ وہ طالبان سے پہلے تفصیلی مذاکرات کر چکے تھے بلکہ یہ صرف پاکستانی علمائے کرام کی ملا عمر سے بات چیت تھی۔ علما کی اِس تجویز سے ملا عمر نے اتفاق نہ کیا لہٰذا یہ مذاکرات کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو گئے۔''

میری رائے میں شاید ملا عمر کا علامہ اقبال کے اس شعر پر سو فیصد یقین تھا کہ:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے ، تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

بعض اوقات جب مسلمانوں کو پسپائی ہو یا بظاہر شکست کا سامنا کرنا پڑے تو ہمارے کئی خیر خواہ اپنی دانست میں

کچھ مفروضے گھڑ لیتے ہیں جن کو اسلام کے قطعی اصول سمجھ کر مسلمانوں کے حق و ناحق ہونے کا فیصلہ کر کے عوام کو پریشان کرتے ہیں، اس واقعہ کے بعد بھی ایسے کئی مفروضے قائم کیے گئے، مثلاً یہ کہ پروردگار کا واضح حکم ہے کہ مقابلے کی پوری قوت فراہم رکھی جائے۔ جب سامان حرب و اسلحہ میں دو قومیں ایک دوسرے کے برابر ہوں تب اگر زیادہ صبر و استقامت والی طاقت افرادی قوت کے اعتبار سے کچھ کم بھی ہو، تب بھی وہ مقابلہ جیت سکتی ہے۔ دور رسالت ﷺ اور دور صحابہؓ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان اسلحہ کی تعداد میں یقیناً فرق رہا ہے لیکن دونوں طرف سے ہمیشہ ایک ہی جیسے ہتھیار استعمال کئے جاتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ دشمن کے پاس کوئی ایسا ہتھیار ہو جو مسلمانوں کے پاس نہ ہو۔ پچھلے تین سو برس کی تاریخ مسلسل ہمیں سبق دیتی ہے کہ بہترین مسلمانوں کے مقابلے میں وہ دشمن جنگ جیتا جس کے پاس مسلمانوں سے برتر اسلحہ تھا۔ مثلاً میسور میں ٹیپو سلطان (1799ء ہار گیا۔ سید احمد شہیدؒ (1831ء) کے مقابلے میں سکھ حکومت جنگ جیت گئی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے مقابلے میں انگریز کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اسی طرح کی بیسیوں مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پچھلے تین سو برس کے واقعات سے طالبان اور پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے قائدین نے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔

ہم نے ان سوالات کے جواب کے لیے جید علما سے رابطہ کیا انہوں نے ان واقعات کے بارے میں جو جوابات دیئے ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے ہر عمل کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد ہوتا ہے اگر وہ مقصد پورا ہو جائے تو وہ اس عمل میں کامیاب ہیں خواہ نتیجہ بظاہر اچھا نہ ہو، اور وہ خاص مقصد ہے ''اللہ تعالیٰ کی رضا'' اب اس مقصد کے حصول کے لیے جو کام کیا جائے وہ کامیاب ہے، اور اگر دین کا بڑے سے بڑا عمل بھی اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے کیا جائے وہ بے فائدہ ہے، بخاری شریف کی پہلی حدیث میں اسی بات کو ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

> ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، پس جس شخص کی ہجرت دنیا کے کسی سامان کے حصول کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہے۔''(8)

اب ہجرت جیسا بڑا عمل اگر صحیح نیت سے نہ کیا جائے، تو وہ بھی بے فائدہ ہے اسی طرح نماز اسلام کا اہم رکن ہے لیکن اگر کوئی شخص ریاکاری (فاسد نیت) کے ساتھ یہ عمل کرے تو یہی اہم رکنِ اسلام شرک کا سبب بن جائے گا، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

> ''جس شخص نے دکھلاوے کے لیے نماز پڑھی تو اس نے شرک کیا''۔.....(9)

حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ کے پاس سامان حرب کی کمی تھی تو آپ ﷺ نے ہمیشہ حکمت کے ساتھ لڑائی سے گریز کر کے مسلمانوں کو بچایا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال جنگِ خندق ہے۔ اس وقت دشمنوں کی تعداد دس ہزار، جب کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مزید یہ کہ دشمن کے پاس اسلحہ بہت بڑی مقدار میں تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار سے مشورہ کر کے مقابلہ کرنے کی بجائے مدینہ کے گرد خندق کھود کر اس کے اندر مسلمانوں کو محصور کر کے انہیں دشمن سے بچایا۔ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود صحابہ

کرام کو مشورہ میں شریک کیا حتیٰ کہ کئی منافقین سے بھی مشورہ کیا گیا تا کہ مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دشمن کو بھی مؤثر جواب دیا جا سکے اسی طرح صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی حضور ﷺ کی سیرت کا وہ اہم پہلو ہے جو ہمارے لیے حکمت وصبر کا مینارۂ نور ہے۔

واضح رہے کہ گیارہ ستمبر سے پہلے خود طالبان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ تین مسلمان ملکوں پر مشتمل ایک عدالت بنائی جائے جس کے سامنے اسامہ بن لادن کو پیش کیا جائے۔ جب گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی علما کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے قندہار گیا اور وہاں مفتی نظام الدین شامزئی صاحب جو کہ طالبان کے نامور اساتذہ میں سے تھے نے اسی تجویز کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ اس تجویز کی بنیاد پر بات آگے بڑھائی جائے تو مناسب ہوگا لیکن طالبان نے اپنی تجویز پر عمل کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب اسامہ بن لادن پر صرف طالبان کی عدالت میں ہی مقدمہ چل سکتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے چند ہفتے بعد امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول (Colin Powell) نے پیش کش کر دی کہ اسامہ بن لادن پر کسی دوسرے غیر جانبدار ملک میں اس ملک کے قانون کے مطابق مقدمہ چلایا جائے تو یہ امریکہ کو منظور ہوگا۔ لیکن اس پیش کش کو طالبان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ دنیا بھر میں شرعی عدالت تو صرف طالبان کی ہے۔ اس لئے اسامہ بن لادن کے متعلق اسی کا فیصلہ چلے گا۔

پاکستانی علما کے مشورہ کے مطابق اگر طالبان اسلامک کانفرنس کی تنظیم OIC جس کو اب اسلامی تعاون کی تنظیم کہا جاتا ہے کے ذیلی ادارے اسلامک فقہ اکیڈمی سے شرعی فیصلہ لے لیتے تو اس سے تمام پارٹیوں کو کچھ سوچنے کا وقت بھی مل جاتا اور امریکا کے حملے کا فوری خطرہ بھی ٹل جاتا۔

9/11 کے حملے کا ذمہ دار کون:

صرف عالم اسلام میں ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی اس موضوع پر ابھی تک بحث جاری ہے کہ 11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کس نے کیا تھا۔؟ صرف مسلمانوں میں ہی عام طور پر یہ بات مشہور نہیں ہے کہ یہ حملہ سی آئی اے نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے کروایا تھا بلکہ کئی غیر مسلم امریکی انجینئروں، آرکیٹیکٹوں اور سائنسدانوں نے باقاعدہ تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ 9/11 کا حملہ کسی بیرونی گروپ کا کام نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت عمارتوں کو گرایا گیا اس کے لئے انہوں نے Architect and Engineers for 9/11 Truth کے نام سے تنظیم بنائی ہے جس میں چوٹی کے تقریباً 3000 انجینئرز اور آرکیٹیکٹ شامل ہیں، یہ عمارتیں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ دھماکوں سے گرائی گئی ہیں۔(10)

کئی تجزیہ نگاروں کے مطابق ان عمارتوں کو اس لیے گرایا گیا تا کہ سی آئی اے اپنے پوشیدہ عزائم کی تکمیل کر سکے یعنی افغانستان کے راستے تیل کی پائپ لائن بچھانے کے پروجیکٹ کو مکمل کیا جا سکے۔ اس سازش کو برطانوی سیاست دانوں نے بھی اپنے بیانات میں پیش کیا ہے۔ جبکہ امریکی حکومت اس کی تردید کر چکی ہے۔ ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ یہ حملہ اسرائیلی ایجنسی موساد نے سی آئی اے کے ساتھ مل کر کروایا تھا اس لیے کہ اُس دن ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والے چار ہزار یہودی غیر حاضر تھے، گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حملہ یہودیوں نے کیا ہے اور یہودیوں کو اس کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ حقیقتاً اس حملے میں بہت سے امریکی یہودی بھی ہلاک ہوئے، اس حملے میں اسرائیل کے انچاس 49 یہودی

شہری بھی ہلاک ہوئے۔ ممکن ہے کہ اُس دن کچھ یہودی اپنے مذہبی تہوار کی وجہ سے غیر حاضر ہوں۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس حملہ کے نتیجہ میں کئی مسلمان بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

القاعدہ۔ 9/11 حملہ کا ذمہ دار؟:

بدقسمتی سے گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے دوسرے اہم رہنما اپنے ہر بیان اور ہر انٹرویو کی وجہ سے اپنے لئے مزید مشکلات پیدا کرتے گئے۔ مثلاً اسامہ بن لادن نے دسمبر 2001ء کو اپنے ایک بیان جو کہ ABC NEW پر 2 مئی 2011ء میں بھی نشر ہوا، اس بیان میں حملہ آوروں کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تائید کی۔[11] سات اکتوبر کے بیان میں انہوں نے کہا کہ حملہ آور بہت اچھے نوجوان مسلمان تھے جن کو پروردگار نے اس حملے کی توفیق بخشی اور جنت کی ابدی نعمتیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ تیرہ اکتوبر کو القاعدہ کے ترجمان نے الجزیرہ ٹی وی پر کہا کہ مغرب کے اندر رہنے والے مسلمانوں کو اونچی عمارتوں میں رہنے اور ہوائی سفر سے گریز کرنا چاہیے اس لئے کہ اس طرح کے مزید خودکش حملے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسامہ بن لادن نے اپنے ایک مبینہ انٹرویو میں نیوکلیئر، کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیار رکھنے کا دعویٰ کیا۔ پاکستانی صحافی حامد میر کو انٹرویو میں صاف لفظوں میں کہا کہ نائن الیون کا واقعہ ان کی مدد سے ہوا۔ اس طرح انہوں نے اپنے خلاف ایکشن کے لئے دنیا بھر کو ایک بھرپور اخلاقی جواز فراہم کر دیا۔

اگر اُس وقت اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیا جاتا تو اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت اگر نہیں تھے تو یہ مقدمہ سالوں تک چلتا پھر کہیں جا کر سزا کی نوبت آتی۔ لیکن دوسری صورت میں تو بشمول القاعدہ سب کی تباہی یقینی تھی۔ چنانچہ وہی ہوا طالبان کو شکست ہوئی۔ اور افغانستان میں تباہی کی ایک اور داستان رقم ہوگئی۔ اور اِس سے دائیں بازو کی مغربی نسل پرست تنظیموں کو اسلام مخالف جذبات کو ہوا دینے میں مدد مل رہی ہے۔ ایسی تنظیموں کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور سیاسی طور پر طاقتور ہو رہی ہیں۔

پھر امریکی الیکشن سے پہلے اُنتیس اکتوبر 2004ء کو اسامہ بن لادن نے اپنی ایک ویڈیو تقریر میں واضح طور پر یہ کہا کہ یہ حملہ القاعدہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ان کے بیان کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

"And as I looked at those demolished towers in Lebanon, it entered my mind that we should punish the oppressor in kind and that we should destroy towers in America in order that they taste some of what we tasted and so that they be deterred from killing our women and children".

ترجمہ:..... ''اور جب میں لبنان کے (اسرائیل کی جارحیت کی وجہ سے) تباہ شدہ ٹاورز دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ ظالم کو سزا دینی چاہیے اور یہ کہ ہمیں امریکہ (اسرائیل کا اتحادی ہونے کی وجہ سے) کے ٹاور گرانے چاہئیں تاکہ وہ بھی اس کا مزہ چکھیں جس کا ہم نے چکھا ہے تاکہ وہ ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے دور رہیں۔''(12)

پاکستان کے ممتاز صحافی حامد میر نے یہ انکشاف کیا کہ جب نائن الیون سے کچھ عرصے پہلے وہ اسامہ بن لادن سے ملنے کے لیے گئے تھے تو وہاں القاعدہ کے کمپیوٹرز میں نائن الیون کے مرکزی کردار عطا محمد کی تصویریں اور معلومات موجود

تھیں۔ اور وہ یہ بات جانتے تھے کہ عطا محمد کو کوئی بھاری ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ میڈیا کا ایک تجربہ کار جرنلسٹ اُسامہ بن لادن کو مل رہا ہے اور 9/11 کے واقعات کے مرکزی کردار عطا محمد کی تصویر کمپیوٹر پر دکھائی جا رہی ہے۔ کہ یہ جان بوجھ کر رکھی گئی تھی کہ میڈیا اِس کو ریکارڈ کا حصہ بنالے کہ یہ القاعدہ کا بندہ تھا یا یہ کہ جس ادارے نے حامد میر کی ملاقات کا بندوبست کیا تھا وہ بھی جانتے تھے۔

2007ء میں نائن الیون کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر اسامہ بن لادن نے نائن الیون کے ایک خودکش حملہ آور کو خراج تحسین پیش کیا۔ اسامہ بن لادن کے ذاتی معالج ڈاکٹر عامر عزیز نے ڈاکٹر اسرار احمد کو بتایا کہ بن لادن نے ان کے سوال پر یہ اعتراف کیا کہ اس حملے کا حکم انہوں نے دیا تھا۔ یہ بات ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستانی صحافی نعیم بلوچ کو اپنے ایک انٹرویو میں بتائی جو روزنامہ جناح میں اکتوبر 2005 میں شائع ہوا۔ واضح رہے کہ آرتھو پیڈک سپیشلسٹ ڈاکٹر عامر عزیز انقلابی مسلمان ہیں۔

جیسا کہ پروفیسر ڈیوڈ گرفن نے "A 571 Page Lie" میں اِس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ جنرل محمود نے CIA کے سربراہ جارج ٹینٹ کے ساتھ 9/11 کے ایک ہفتہ پہلے ملاقات کی تھی اور عطا محمد کو ایک لاکھ ڈالر دینے کا کہا تھا۔ اس طرح کی سازشوں میں بعض سادہ لوگ استعمال ہو جاتے ہیں۔ کس کی سادگی اور کس کی سازش۔ فیصلہ قارئین خود کریں کہ جھوٹ اتنا بولا گیا کہ سب کو یقین ہو گیا کہ واقعتاً ''جھوٹ'' سچ ہی تھا۔ یہ راز تو تب ہی آشکارا ہو گا جب کوئی نئی وِکی لیکس منظر عام پر آئے گی۔

یہ عین ممکن ہے کہ کچھ اور اداروں نے بھی القاعدہ کی مدد کی ہو۔ تاہم اس کی حقیقت کچھ عرصے بعد ہی کھل سکے گی۔ ممکن ہے کہ اس تجزیے کے جواب میں یہ کہا جائے کہ خود امریکہ کے اندر کچھ ایسی فلمیں بنائی گئی ہیں جن میں اس پورے واقعے کے ذمہ داروں کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں بے شمار لوگ سازش کی تھیوریوں (Conspiracy Theories) پر یقین رکھتے ہیں، اسی طرح امریکہ میں بھی کچھ لوگ ایسی تھیوریز پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ہالی ووڈ کی ایک فلم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ انسان تو سرے سے چاند پر چڑھا ہی نہیں۔ بالکل اسی طرح ایک مشہور امریکی ڈاکومنٹری فلم میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو عرب نائن الیون کے واقعے کے ذمہ دار تھے، ان کے ساتھ بش کا کوئی مشترکہ کاروبار تھا۔ ظاہر ہے کہ کانسپریسی تھیوریز کی بنیاد پر تو کسی بھی وقت کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس حقائق کی بنیاد ہمیشہ واضح دلیل پر ہوتی ہے۔

9/11 کمیشن کی رپورٹ یا "A 571-page lie"؟:

امریکی صدر جارج بش اور امریکی سینیٹ نے 11 ستمبر 2001ء کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جہازوں کے ذریعے حملوں سے متعلق تقریباً 13 مہینوں کے بعد 27 نومبر 2002ء کو ایک ''9/11 کمیشن'' بنایا جس کا مقصد 11 ستمبر 2001 کے حملوں سے متعلق حالات وواقعات کی مکمل تحقیق کرنا تھا۔

اُس کمیشن کی تقریباً 500 صفحات کی رپورٹ 22 جولائی 2004ء کو منظر عام پر آئی جبکہ 28 صفحات کو عوام سے چھپایا گیا۔ جبکہ 2016ء میں یہ صفحات بھی سینٹ کے ذریعے سامنے لائے گئے۔ اِس میں سعودی مداخلت اور سہولت کاری کا ذکر کیا گیا۔ اس کمیشن کے 10 ممبر تھے۔ اور جارج بش نے ہنری کسنجر (Henry Kessinger) کو چیئرمین

مقرر کیا۔لیکن عوام کے شدید دباؤ پر اس نے استعفیٰ دے دیا۔پھر نیا چیئرمین نیو جرسی کے سابق گورنر تھامس کین (Thumos H. Kean) کو بنایا گیا اور اس کمیشن کے 78 کے قریب ملازمین تھے۔اس انکوائری پر 15 ملین امریکی ڈالر خرچ ہوئے۔یاد رہے کہ کمیشن کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی افغانستان پر اکتوبر 2001ء میں حملہ کر دیا گیا تھا۔

پروفیسر ڈیوڈ رے گرفن (David Ray Griffin) دہشت گردی کے موضوع پر ایک مایہ ناز تجزیہ نگار مانے جاتے ہیں۔تقریباً 10 کتابوں کے مصنف ہیں اور 9/11 کے حادثے سے متعلق امریکی حکومت کے موقف پر سخت تنقید کرتے رہے ہیں۔وہ اس رپورٹ کو ''571 صفحات کا جھوٹ'' (A 571-page lie) کے نام سے پکارتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کمیشن آزاد کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ بش انتظامیہ کا ایک ممبر اس کمیشن کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا۔9/11 گلوبل ریسرچ نامی ایک تھنک ٹینک نے پروفیسر ڈیوڈ گرفن کی اِس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک رپورٹ میں ایک سو سے زیادہ نشاندہیاں کی ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس رپورٹ کو ایک خاص حکومتی حکمتِ عملی کے تحت تیار کروایا گیا ہے۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت ساری شہادتیں 9/11 رپورٹ میں ڈالی ہی نہیں گئی ہیں۔مثلاً:

1۔ امریکی کمپنی UNOCAL کا یہ بیان کہ وسطی ایشیا سے گیس اور تیل کی نئی لائن کی مناسب سیکورٹی طالبان کے بس کا روگ نہیں۔(لہٰذا یہ عندیہ دے کر امریکی انتظامیہ کو 9/11 سے پہلے باور کرایا گیا کہ طالبان کا ہٹانا ضروری ہے۔)

2۔ اس شہادت کو بھی رپورٹ میں نہیں ڈالا گیا کہ جولائی 2001ء میں امریکی نمائندوں کی طالبان سے میٹنگ میں کوئی (امریکی منشا کے مطابق) معاہدہ نہ ہو سکا۔لہٰذا اکتوبر 2001ء تک (طالبان کے خلاف) جنگ شروع ہوجائے گی۔

قارئین! یاد رہے کہ صدر بش کی ٹیم تیل کی کمپنیوں سے منسلک لوگوں سے بھری ہوئی تھی اور یہ لوگ اپنی کمپنیوں کے مفادات کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتے رہے۔اور پوری دنیا کو دہشت گردی کی آگ میں دھکیل دیا۔بش کے صدارتی دور میں نائب صدر ڈِک چینی (Dick Cheney) ایک تیل کی کمپنی ہیلی برٹن (Halli Burton) کے چیف تھے۔اور الیکشن سے پہلے 34 ملین ڈالر لے کر ریٹائر ہوئے۔بعد میں اس کمپنی نے عراق کی جنگ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور ڈِک چینی کی نائب صدارت کے عہدے کو استعمال کرتے ہوئے 39 بلین امریکی ڈالر کے کنٹریکٹ لیے۔(گویا 34 ملین دینے کا سودا ''گھاٹے'' کا نہیں تھا۔)

3۔ اسی طرح مزید کئی شہادتیں رپورٹ میں نہیں ڈالی گئیں کہ اُس وقت کے پاکستانی ISI کے DG جنرل محمود احمد کا 9/11 سے ایک ہفتہ پہلے امریکہ کا دورہ اور CIA کے چیف جارج ٹینٹ (George Tenet) سے ملاقات کا رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں۔کہ انہوں نے 9/11 کے ماسٹر مائنڈ عطا کو ایک لاکھ ڈالر دینے کا کہا تھا لیکن اس خبر کے افشا ہونے پر بش انتظامیہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ جنرل محمود کو فارغ کر دیا جائے۔

4۔ اس طرح اسامہ بن لادن کا مئی کے اندر 2001ء میں امریکی ہسپتال میں علاج اور سعودی انٹیلیجنس کے سربراہ سے ملاقات کی شہادت کو رپورٹ میں نہیں ڈالا گیا۔(13)

قارئین حقیقت یہ ہے کہ امریکی سائنسدانوں، انجینئروں اور تجزیہ نگاروں نے کئی سوالات اُٹھائے ہیں کہ یہ رپورٹ صرف اور صرف حکومتی موقف کو درست ثابت کرنے اور مزید مضبوط کرنے کے لئے لکھی گئی ہے وگرنہ یہ جھوٹ کا

پلندہ ہے لیکن عام آدمی کس کی بات پر یقین کرے کہ سچ اور جھوٹ میں کوئی تمیز نہیں رہی۔ اور ہر کوئی اتنا ہنر مند نہیں کہ اتنے بڑے ٹیکنیکل آپریشن کی گہرائی کو سمجھ سکے۔

مزید یہ کہ امریکہ کے ڈھائی ہزار کے قریب پروفیسرز، آرکیٹیکٹس اور انجینئرز کا یہ دعویٰ ہے کہ: نائن الیون کا حملہ امریکی اداروں کی اندرونی سازش تھی اور اس پر طرہ یہ کہ کچھ عرب نوجوان (جو کہ اپنے پاسپورٹ بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے کہ ان کی فوراً نہ کہ کوئی بیرونی طاقت ایک گھنٹہ تک امریکی فضا میں طیاروں کو اغوا کر کے اُڑاتی رہی اور دنیا کی سب سے بڑی فضائی طاقت ان جہازوں کو روکنے میں ناکام رہی۔ اور یہ کہ یہ بلڈنگ ایک آٹو میٹک تباہ کن نظام کے تحت گرائی گئی۔

''مکمل کنٹرول کی ڈاکٹرن'' پر مبنی امریکی خارجہ پالیسی:

امریکی خارجہ پالیسی (Full spectrum Dominance Doctrine)

''مکمل کنٹرول کی پالیسی'' پر چلتی ہے۔ جس کا مقصد ہے کہ امریکہ کو پوری دنیا میں فوجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے ترقی کو کنٹرول کرنا چاہیے۔

Full-spectrum dominance also known as full-spectrum superiority, is a military entity's achievement of control over all dimensions of the battle space, effectively possessing an overwhelming diversity of resources in such areas as terrestrial, aerial, maritime, subterranean, extraterrestrial, psychological, and bio- or cyber-technological warfare. Full spectrum dominance includes the physical battle space; air, surface and sub-surface as well as the electromagnetic spectrum and information space.

ترجمہ:.....فل سپیکٹرم ڈومینینس (Full Spectrum Dominance) یعنی ''مکمل دھاک'' جسے [امریکی محکمہ دفاع (پینٹا گون) والے [اِسے Spectrum Superiority یعنی مکمل برتری یا افضلیت والی پالیسی یا ڈاکٹرن بھی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ امریکی افواج کی (دوسری اقوام پر) بری، فضائی، بحری، زمین کے اندر، زمین کے باہر (خارج الارض) نفسیاتی، کیمیائی، سائبر ٹیکنالوجی میں جنگی حوالے سے مؤثر طریقے سے برتری حاصل کرنا اور حد سے زیادہ قابو میں رکھنا ہے۔(14)

افغانستان پر امریکی حملہ.....پھر دنیا بدل گئی

جب طالبان حکومت نے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو امریکہ نے طالبان پر زبردست بمباری شروع کر دی۔ دوسری طرف سے شمالی اتحاد نے بھی اپنے حملے بڑھا دیئے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں تین مہینے کے اندر اندر طالبان حکومت ختم ہوگئی، کابل پر حامد کرزئی کا قبضہ ہوگیا اور امریکہ اور نیٹو کی افواج افغانستان میں اتر گئیں۔ ہمارے خیال میں امریکہ کا یہ حملہ غلط تھا کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ اس حملے کے نتیجے میں لازماً ہزاروں بے گناہ افراد ہلاک ہوں گے۔ نیز اُس وقت اس بات کا بھی تجزیہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس حملے کے نتیجے میں مستقبل میں بین الاقوامی سطح پر کیا مصیبتیں اور مشکلات سامنے آئیں گی۔ یعنی کل کو کوئی طاقت ور ملک (مثلاً روس یا چین وغیرہ) اُٹھ کر کسی دوسرے ملک پر جارحانہ حملہ کر دے تو اُس کو ہم کس منہ سے روک سکتے ہیں؟ چنانچہ اُس وقت امریکہ کے لیے صحیح

راستہ یہی تھا کہ وہ افغانستان پر اقتصادی اور دیگر پابندیاں لگاتا۔ اس کے نتیجے میں کسی نہ کسی دن طالبان کو بین الاقوامی رائے عامہ کے سامنے سر جھکانا پڑتا کیونکہ طالبان کی حکومت عراق یا ایران کی طرح کی ایک مضبوط حکومت نہ تھی کہ وہ اقتصادی پابندیوں کا بوجھ برداشت کر سکتے اور اگر آج کے حالات کا ایک تنقیدی جائزہ لیا جائے تو امریکی سپر پاور اپنی غلط حکمت عملی کی وجہ سے اُنہی بے سروسامان طالبان سے جنگ ہار چکے ہیں اُس میں تجزیہ نگار ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ سی آئی اے کے آئی ایس آئی کے خلاف معاندانہ رویے نے دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا اور سی آئی اے آئی ایس آئی کی مدد سے محروم ہوگئی۔ آئی ایس آئی دنیا میں ٹاپ کی انٹیلی جنس ایجنسیوں میں شامل ہے اور افغانستان کی صورتِ حال کو جس قدر یہ لوگ جانتے ہیں اتنا افغان حکومت خود نہیں جانتی۔ افغانستان کی صورتِ حال یہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں غیر ملکی فوجی مٹھی بھر طالبان سے علاقے خالی نہیں کروا سکے۔ لیکن بین الاقوامی طور پر افغانستان پر امریکی حملے کو نہ روکنے کی وجہ سے اقوام متحدہ یا دوسرے بین لاقوامی ادارے لیبیا، عراق، یمن، صومالیہ اور شام پر امریکی حملوں کو بھی نہ روک سکے۔ اور نتیجتاً کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ شہید ہوگئے اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں لوگ زخمی اور بیمار ہوگئے۔ نفسیاتی طور پر متاثرین کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ یہاں یہ بات جاننا بھی انتہائی ضروری ہے کہ ان جنگوں میں نہ صرف ہزاروں کی تعداد میں امریکی فوجی مارے گئے بلکہ لاکھوں کی تعداد میں نفسیاتی بیماریوں کا شکار بھی ہوئے۔

Veterans PTSD Statistics کے مطابق 2014ء تک عراق اور افغانستان سے تقریباً 27 لاکھ امریکی فوجی واپس آئے۔ یہ مزید لکھتے ہیں کہ رینڈ کارپوریشن کی ایک تحقیق کے مطابق عراق اور افغانستان سے واپس آنے والے فوجیوں کی تقریباً 20% تعداد Post Traumatic Stress Disorder (PTSD) اور ڈیپریشن کا شکار ہیں گویا کہ تقریباً 5 لاکھ 40 ہزار فوجی نفسیاتی طور پر بیمار ہیں۔ 2012 VA Suicide Data Report کے مطابق 5 سے 8 ہزار امریکی فوجی جنگ سے آنے کے بعد ہر سال خودکشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (15)

اربوں کا مالی نقصان اور انفراسٹرکچر کی تباہی اس کے علاوہ ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ یہ حملے اور قبضے نام نہاد ''دہشت گردی'' کے خلاف کئے گئے۔ لیکن دنیا میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندی کے واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا مزید غیر محفوظ ہوگئی ہے اور تیسری عالمی جنگ کی طرف انتہائی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔

بش کے ''Crusade'' پر امریکی ٹیکس دہندگان کا خرچ:

امریکی اربابِ اقتدار و اختیار اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی بھی قوم پر جا کر جنگ تو مسلط کر سکتے ہیں لیکن اُس کو ختم اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے کیونکہ مقامی لوگ سالہا سال تک غیر ملکی افواج کو گوریلا جنگ میں مصروف رکھ سکتے ہیں جس طرح طالبان کر رہے ہیں جب کہ غیر ملکی افواج ایک طویل جنگ کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ اس سے فوجیوں کے مورال پر بھی اثر پڑتا ہے اور معیشت پر بھی۔ بش انتظامیہ کی ملٹری کمپین ''وار آن ٹیرر'' پر اب تک تقریباً دو ٹریلین ڈالر خرچ ہو چکے ہیں اور امریکی عوام 2016ء تک 19 ٹریلین ڈالر کے قرضہ کے نیچے دب چکی تھی۔

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کی 20 ستمبر 2001 کی اشاعت کے مطابق صدر بش نے کہا:

"Our war on terror begins with al Qaeda, but it does not end there. It will not end until

every terrorist group of global reach has been found, stopped and defeated."

ترجمہ: ''ہماری دہشت گردی کے خلاف جنگ القاعدہ سے شروع ہوئی ہے لیکن اس پر ختم نہیں ہوگی یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی، جب تک ہم ہر گلوبل دہشت گرد گروپ کو تلاش کر کے روک نہ لیں اور ان کو شکست نہیں دے دیتے۔''(16)

امریکی کانگریس نے ''وار آن ٹیرر'' کی مد میں بش انتظامیہ کے لیے ایمرجنسی فنڈ کے طور پر تقریباً 22.9 بلین ڈالر منظور کیا، جبکہ جنگ پر اخراجات بڑھتے بڑھتے 2002 میں 59 بلین ڈالر، 2003 میں 112 بلین ڈالر اور پھر 2008 میں 235 بلین ڈالر تک پہنچ گئے۔ اسی طرح ہر سال اس جنگ پر تقریباً 100 بلین ڈالر خرچ ہو رہا ہے۔ جنگی اخراجات کے لئے کانگریس کی منظوری تو صرف 1.7 ٹریلین امریکی ڈالر تھی جبکہ حقیقی معنوں میں یہ رقم بڑھ کر 2.1 ٹریلین امریکی ڈالر ہو چکی ہے۔(17)

اس جنگ پر اخراجات کے اعداد و شمار مختلف تھنک ٹینک اپنے حساب سے مختلف بیان کرتے ہیں جو کہ 2 سے 5 ٹریلین تک جا پہنچتے ہیں۔ اِس نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ (War On Terror) پر صرف افغانستان میں امریکہ کے 783 بلین امریکی ڈالر خرچ ہو چکے ہیں۔ یعنی ہر گھنٹے میں تقریباً 4 ملین امریکی ڈالر اِس غیر ضروری جنگ پر خرچ ہو رہے ہیں۔((19A

اسی طرح عراق (جہاں پر دہشت گردی، القاعدہ یا داعش کا نام و نشان بھی موجود نہ تھا) کے اوپر حملہ اور قبضہ قائم رکھنے پر اِس وقت تک امریکہ کا 820 بلین امریکی ڈالر خرچ ہو چکا ہے۔ گویا کہ امریکی عوام ہر گھنٹے میں تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار امریکی ڈالر جنگ پر خرچ کر رہی ہے اور ابھی شام میں جو خرچ ہو رہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ ایک ملین کے قریب انسانی جانوں کا زیاں اس کے علاوہ ہے۔ 10 ملین کے قریب لوگوں کا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جانا علیحدہ ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 10 لاکھ کے قریب بچے اور بڑے معذور یا نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ وہ اگر خودکش بمبار نہیں بنیں گے تو کیا امن کے سفیر بنیں گے؟

اگر امریکہ یہی رقم اپنے لوگوں کی تعلیم، صحت، روزگار اور ماحولیات کی بہتری پر خرچ کرتا تو امریکہ کے تمام اندرونی مسائل کا حل نکل آتا کہ نہ کوئی بے روزگار اور نہ کوئی جرم اور نہ ہی کوئی بے گھر سڑک کے کنارے رضائی لے کر لیٹا ہوا مانگ رہا ہوتا۔

اربوں ڈالر جنگ کی آگ میں جھونک دینے سے کیا دنیا سے دہشت گردی ختم ہوگئی؟ اس کا جواب ہمیں نفی میں ہی ملے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا بالخصوص یورپ کو دہشت گردی نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

نیٹو کے ڈپٹی کمانڈر جنرل نک کارٹر کا بیان:

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں نیٹو کے ڈپٹی کمانڈر جنرل نک کارٹر کے اُس بیان کو نقل کیا جائے جس میں انہوں نے افغانستان کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جنگ کی بجائے ڈائیلاگ کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے کہ:

"I think that at that stage, if we had been very prescient, we might have spotted that a final political solution to what started in 2001, from our perspective, would have involved getting all Afghans to sit at the table and talk about their future. The problems that we have been encountering over the period since then

are essentially political problems, and political problems are only ever solved by people talking to each other."

ترجمہ:''ہم نے جو 2001ء میں جنگ شروع کی تھی اگر ہمیں اُس وقت صورتِ حال کا ادراک ہوتا کہ اس کا آخری حل سیاسی ہی ہونا ہے تو ہم تمام افغان گروپوں کو ایک جگہ پر بٹھا کر اُن کے مستقبل کی بات کرتے۔اُس وقت سے اب تک ہم سیاسی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔اور ان سیاسی مسائل کا حل تب ہی نکل سکے گا جب لوگ آپس میں بات چیت کریں گے۔''(18)

احقر نے ڈائیلاگ کی اہمیت سے متعلق اپنی تجاویز کئی اہم پلیٹ فارمز پر دی ہیں جن میں International Centre for Counter Terrorism, Hague کا خطاب، برطانیہ کی موجودہ حکومتی پارٹی کنزرویٹو کے تھنک ٹینک Bow Group کی افتتاحی تقریب میں 2010 کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکی افواج افغانستان سے نکل جائیں اور اقوام متحدہ ان کی جگہ لے کر ایک غیر جانبدارانہ الیکشن کرائیں جس میں طالبان وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرکت کریں، اور اگر طالبان الیکشن جیت جائیں تو اقوام متحدہ کو بھی وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقتدار طالبان کے حوالہ کر دینا چاہیے۔اور پھر بجائے اس کے کہ طالبان کی ٹانگیں کھینچی جائیں بلکہ ملکی امور کو چلانے میں ان کی معاونت کرنی چاہیے۔جو انفراسٹرکچر اور ملک کی تعمیر و ترقی کا کام ہے وہ او،آئی،سی یعنی اسلامی تعاون کی تنظیم کی سربراہی میں افغان حکومتی ادارے ایک مکمل پروگرام کے تحت شروع کریں اور پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔اسی طرح برطانوی چینل 4 پر Rory Stewart MP اور کرنل رچرڈ کیمپ کے ساتھ ڈائیلاگ کی اہمیت پر بحث۔برطانوی وزارتِ خارجہ اور برطانوی ہائی کمیشن اسلام آباد کو انٹرویو، Peace one Week, South Asia Free Media Association(SAFMA) کو انٹرویو کے دوران جنگ کی بجائے ڈائیلاگ اور لوگوں کو مارنے کی بجائے ان کی تربیت پر زور دیا۔ (19-26)

شومئ قسمت کہ کابل پر قبضے کے پندرہ برسوں بعد بھی افغانستان کے حالات پہلے کی طرح مخدوش اور دگرگوں ہیں۔نیز مستقبل کے لیے بھی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔جب باہر کی کوئی فوج کسی جگہ آتی ہے،تو اُس سے بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں اور اُس کے اقدامات کے نتیجے میں عام لوگ بھی اُس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔لہٰذا اس نفرت آمیز مخالفت کا اظہار افغانستان، عراق، لیبیا اور شام میں ہو رہا ہے اور اس کے اثرات سبھی ہمسایہ ممالک، خصوصاً پاکستان پر پڑ رہے ہیں۔بلکہ بین الاقوامی طور پر امریکہ اور برطانیہ کے جنگی جنون پر مختلف حلقوں سے سخت تنقید کی گئی ہے۔برطانیہ کے حالیہ الیکشن میں اپوزیشن لیڈر مسٹر جرمی کوربن نے سختی سے نہ صرف اس جنون کی مذمت کی بلکہ عوام سے الیکشن کا وعدہ کیا کہ وہ دوسرے ممالک پر حملوں کو روکنے کی سخت پالیسی بنائیں گے اور امن قائم کرنے کے لئے ایک وزارت بھی تشکیل دیں گے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ ان کو ووٹ ملے اور حکومتی کنزرویٹو پارٹی سادہ اکثریت سے محروم ہوگئی۔

موجودہ صورت حال اور ممکنہ حل:

تادم تحریر افغانستان خانہ جنگی کا شکار ہے، امریکی فوج کی مدد سے جناب اشرف غنی کی جمہوری حکومت قائم ہے۔یہ صاحب اچھی شہرت کے حامل ہیں، اور دلی طور پر چاہتے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان میں امن قائم ہو۔عملی طور پر کابل سے باہر افغان حکومت کو کافی مشکلات ہیں کیونکہ افغانستان کے ایک حصے پر طالبان کا قبضہ ہے۔افغانستان کی حکومت تو اتر

کے ساتھ پاکستانی حکومت پر الزام لگاتی رہتی ہے کہ وہ طالبان کے بعض دھڑوں کی حمایت کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کی حکومت مستحکم نہیں ہے اور طالبان پر قابو پانا ممکن نہیں ہو رہا۔ اس کے برعکس پاکستان افغان حکومت پر الزام لگاتا ہے کہ اس نے پاکستان دشمن عناصر بشمول تحریک طالبان پاکستان کو پناہ دے رکھی ہے جو پاکستان میں بھارتی حکومت کی مدد سے دہشت گردی کی وارداتیں کر رہے ہیں۔ اس انتشار اور افغان و پاک باہمی عدم اعتماد کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ بھارت افغانستان میں اثر ورسوخ بڑھا رہا ہے۔ اس طرح افغانستان پاک بھارت پراکسی وار (Proxy War) کا مرکز بنتا جا رہا ہے، امریکہ کا الزام بھی یہ ہے کہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ ابھی تک سٹریٹجک گہرائی (Strategic Depth) سے باہر نہیں آئی۔ اس لیے جب تک وہ افغانستان میں اس کی مدد سے قائم حکومت کو مستحکم کرنے میں اس کی عملی مدد نہیں کرتا، خطہ میں امن ممکن نہیں۔

اس صورت حال سے نکلنے کا اس کے سوائے کوئی حل نہیں کہ امریکہ اور افغان حکومت اور طالبان مذکرات پر راضی ہوں۔ ان مذکرات میں امریکہ، افغان حکومت، پاکستان اور طالبان شامل ہوں۔ اقوام متحدہ کی نگرانی میں ایک حکومت قائم ہو جس کے تحت افغانستان میں غیر جانبدارانہ اور شفاف انتخابات کرانے چاہئیں۔ طالبان بھی اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کریں اور پھر جو بھی سیاسی طاقت فتح یاب ہو وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کو قبول کرتے ہوئے ایک خود مختار حکومت قائم کرے لیکن اس ''آئیڈیل منزل'' کو حاصل کرنے میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ مغرب کو بھی اپنا مزاج بدلنا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ مصر کے محمد مرسی جو کہ جمہوری طریقہ سے جیت کر ملک کے صدر بنے اور ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ذریعے سے اُس قانونی حکومت کو ختم کروا دیا گیا کیونکہ وہ اسلام کی بات کرتا تھا ایسے اقدام سے عوام میں مغرب کے خلاف بداعتمادی اور نفرت بڑھتی ہے۔

ہمیں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ طالبان بین الاقوامی اصول وضوابط یعنی اقوام متحدہ کے چارٹر کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ نہ ہی وہ کسی جمہوری حکومت کے تحت کام کرنے کو تیار ہیں۔ جس میں امریکہ یا اس کے کسی حمایتی ملک کا کردار ہو گا۔ بہرحال چین، پاکستان اور افغانستان کے درمیان مکالمہ بھی ایک خوش آئند اقدام ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے حتیٰ کہ کوئی پرامن اور پائیدار حل نکل آئے۔ اقوام متحدہ کو کسی کی دھونس میں نہیں آنا چاہیے اور وہ کسی بھی ایسے ملک کو اپنا پلیٹ فارم نہ استعمال کرنے دے جو اپنے پوشیدہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے دوسرے ملکوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔

موجودہ افغان حکومت اور طالبان دونوں فریق ایک دوسرے کو معاف کرنے کو تیار نہیں لہٰذا اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ کسی وقت بھی ایک دوسرے سے انتقام لینے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے مذاکرات ایک ایسے ضامن کے ہمراہ کرائے جائیں جسے تمام فریقوں کا اعتماد حاصل ہو۔

اقوام متحدہ مسلمانوں سے متعلق بین الاقوامی مسائل مثلاً مسئلہ کشمیر و فلسطین اور روہنگیا کے حل کیلئے آگے بڑھ کر غیر جانبدارانہ لیڈرشپ رول ادا کرے۔

❀❀❀

تیسرا باب:

''سرحدوں کے آگے'' جہاں اور بھی ہیں

افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات شروع دن سے ہی بہتر نہیں رہے اور اُس کی بنیادی وجہ ڈیورنڈ رلائن (Durand Line) ہے۔ڈیورنڈ رلائن کا 1640 میل لمبا بارڈر جو کہ برطانوی راج کے وقت سر مورتمر ڈیورنڈ (Sir Mortimer Durand) اور امیر افغانستان عبدالرحمٰن خان کے درمیان ایک معاہدے کے تحت قائم کیا گیا تھا۔

The Durand Line is the 2640-kilometer (1640-mile) border between Afghanistan and Pakistan. Its the result of an agreement between Sir Mortimer Durand, a secretary of the British Indian government, and Abdur Rahman Khan, the emir, or ruler, of Afghanistan.

یہی لائن اب پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی علاقوں کا بارڈر ہے۔ جو کہ افغانستان کو پسند نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نے اپنے قیام کے بعد اقوام متحدہ میں شمولیت کی درخواست دی تو افغانستان نے اُس کی مخالفت کی۔ یہ دونوں ممالک اسلامی جمہوریہ ہیں۔اور غیر یورپی ممالک نیٹو کے اتحادی اور سارک SAARC " South Asian Association For Regional Cooperation کے ممبر ہیں۔

لیکن دونوں ممالک کے تعلقات کوئی مثالی نہیں ہیں۔سابقہ افغان صدر جناب حامد کرزئی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ افغان اور پاکستانی جدا نہ ہونے والے بھائی (Inseperable Brothers) ہیں لیکن اس کو حقیقت کے روپ میں کیسے ڈھالا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں سول سوسائٹی یعنی ''عوام سے عوام'' کا ڈائیلاگ از حد ضروری ہے۔ان نفرتوں کو محبتوں میں بدلنا کیوں ضروری ہے اس کا احساس دونوں اقوام میں پیدا کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اس کے لئے خواتین اور نوجوان بہترین کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دونوں اقوام بیدار ہو کر یہ احساس پیدا کریں کہ دونوں ممالک امن کے ضامن ہوں۔

افغانستان ایک تاریخی اہمیت کا حامل ملک رہا ہے کہ جب ذرائع نقل وحمل اس طرح میسر نہیں تھے جیسے آج ہیں تو اُس وقت متحدہ ہندوستان سے وسطی ایشیا تک افغانستان ہی رابطہ تھا بلکہ آج بھی وسطی ایشیائی ریاستوں کو جوڑنے اور بحر قزوین (Caspean Sea) سے تیل کی پائپ لائن بچھانے کے حوالے سے افغانستان اور پاکستان دونوں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور پاکستان کی اسٹریٹیجک اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔تجزیہ نگاروں کی رائے میں ان دونوں ممالک کے تعلقات کی ناہمواری ودشواری میں کچھ بیرونی عناصر بالخصوص بھارت کا ہاتھ ہے،یعنی اِس کو اگر بھارت کی Cold Start Doctrine والی پالیسی کے تناظر میں دیکھیں تو معاملے کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوتا ہے لہٰذا پاکستان کو چاہیے کہ اِن تعلقات کی اہمیت کو سمجھے۔ دونوں ممالک کے تعلقات کو سپوتاژ کرنے میں اپنوں کی ناہنجاری کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔افغان جہاد سے لے کر اب افغان طالبان اور پاکستانی طالبان تک دونوں ممالک میں خلیج بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔

پاکستان بنتے وقت افغانستان سے ملحقہ سرحدی علاقوں کے مکینوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا غیر مشروط اعلان کیا۔ بالخصوص خیبر پختونخوا اور فاٹا کے افغانستان کے ساتھ ملحقہ سرحدی علاقوں میں 50 ملین کے قریب پشتون رہائش

پذیر ہیں اور ان میں رشتہ داریاں بھی ہیں۔جس میں قائداعظمؒ کے دست راست علما شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے جید اور صاحب بصیرت علمائے کرام کا بہت اہم کردار تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ جناب قائداعظم نے مغربی پاکستان کا جھنڈا علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے ہاتھوں اور مشرقی پاکستان کا جھنڈا مولانا ظفر احمد عثمانی سے لہروایا اور پہلی دستور ساز اسمبلی کی دعا بھی انہی حضرات سے کروائی۔

پاکستان اور افغانستان دونوں ممالک کی عوام کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور تجارتی بندھن ہے جو کہ اِن کو قریب لانے کے لئے کافی ہونا چاہیے تھا۔جیسا کہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا کہ:

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

لیکن بدقسمتی سے بداعتمادی کی فضا روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔میں دونوں ممالک میں Civil Society کے درمیان ڈائیلاگ پر زور اس لئے دیتا ہوں کہ جب لندن میں 7 جولائی 2005ء کے خودکش بمبار دھماکوں کے بعد میں ایک مطالعاتی وفد شمالی آئرلینڈ لے کر گیا کہ دیکھا جائے کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل آئرش ریپبلکن آرمی (IRA) کی مار دھاڑ، قتل غارت گری اور بم بلاسٹ کیسے ختم ہوئے۔اور کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کے درمیان نفرتوں کے الاؤ کو کیسے ٹھنڈا کیا گیا۔کس طرح ایک دوسرے سے بدلہ لینے کی آگ کو بجھایا گیا۔یعنی IRA ایک ایسا دہشت گرد گروپ تھا جس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کشتی کو بم سے اُڑا کر اُن کو جان سے مار دیا تھا[1]۔ 80 کی دہائی میں برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کے ہوٹل پر بم سے حملہ کر کے کئی لوگ مار دیئے۔سرزمین برطانیہ اور بیرونِ ممالک برطانوی مفادات کو دھما کے کر کے زبردست جانی و مالی نقصان پہنچایا گیا۔[2]

ایک وقت یہ تھا کہ برطانیہ کے لوگ آئرش لوگوں سے نفرت کا اظہار اس طرح کرتے کہ اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیوں میں یہ کتبہ لگا کر رکھتے تھے: ''No Irish, No Black, No Dog''[3] لیکن امن کیسے ممکن ہوا۔؟ اُس میں ''عوام سے عوام تک'' ڈائیلاگ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

اگرچہ شمالی آئرلینڈ برطانیہ کا حصہ ہے جبکہ پاکستان اور افغانستان دو علیحدہ ممالک ہیں لیکن اِس میں کامن فیکٹر نفرت، بداعتمادی، غلط سوچ اور غلط نظریات و آرا کا ہے جن کو تبدیل صرف عوام ہی کر سکتی ہے۔یہاں میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ جب ہمارے وفد نے شمالی آئرلینڈ میں ایک ایسے سنٹر کا دورہ کیا جہاں پر IRA کے سزا یافتہ مجرموں کی معاشرے میں بحالی کے حوالے سے تربیت ہوتی ہے میرے ایک سوال کہ ''آپ نے تشدد کا راستہ کیوں اختیار کیا؟'' جواب میں یہ کہا گیا کہ وہ برطانیہ والوں کو آئرلینڈ میں غاصب کے طور پر دیکھتے ہیں۔تو یہاں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ سوچ کیسے تبدیل ہوئی؟

اگرچہ بہت سے لوگوں نے افغانستان اور پاکستان کی عوام کو قریب لانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ''نشستند، گفتند، برخاستند'' سے آگے نہیں نکل سکی۔البتہ اکتوبر 2015ء سے Centre for Research and Security Studies (CRSS) نے "Beyond Boundaries" کے نام سے افغانستان اور پاکستان کے دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنانے کیلئے ایک انتہائی مؤثر ڈائیلاگ Afghanistan Track 1.5/II Pakistan- شروع کیا ہوا ہے جس میں ان کے افغان پارٹنر

Duran Research and Analysis(DRA) ، (FIDA) The Foundation for Integrated Development Action

اور Women and Peace Studies Organisation (WPSO) جیسی تنظیمیں رہیں۔

جبکہ موجودہ پارٹنرشپ CRSS اور OESP (Organisation of Economic Studies and Peace) کے درمیان ہے۔ جو کہ ایک اچھا آغاز Initiative ہے جس میں خواتین، نوجوان، اساتذہ، سیاست دان، سابقہ سفارت کار و بیورو کریٹ کے علاوہ میڈیا بھی دونوں ممالک کے باہمی خوشگوار تعلقات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس پراجیکٹ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ جو مختلف سیمیناروں، ادبی اور ثقافتی تقریبات، طلبا کے وفود کے تبادلوں کے ذریعے مختلف مکالمات میں شریک ہو رہے ہیں۔ جس کے بہتر نتائج آنا شروع ہو گئے ہیں۔

دونوں حکومتوں نے اس کو بہتری کی طرف ایک مفید اقدام قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ CRSS کا پلیٹ فارم اختلافی مسائل پر غور کرنے کی بجائے مشترکہ قدروں کو منانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جس سے دونوں اقوام میں برداشت، حکمت، دانائی اور تدبر پیدا ہونے کے مواقع میسر آ سکتے ہیں۔ اس ڈائیلاگ کے نتیجے میں ایک ورکنگ گروپ Pakistan-Afghanistan Joint Committee (PAJC) بن چکا ہے۔ اور Afghan Studies Centres کا قیام بھی عمل میں آ چکا ہے۔(4)

میری رائے میں دینی اور سیکولر حلقوں کو مل کر اس منزل کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی اور غیر ریاستی عناصر کو اس احسن کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ مزید یہ کہ حکومتی اداروں کی طرف سے ایسے دوطرفہ ڈائیلاگ کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہونی چاہیے بلکہ ان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں مدد و معاون ہونا چاہیے۔

پاکستان۔افغانستان جوائنٹ کمیٹی (PAJC) کے اجلاس کی صدارت:

صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس

Beyond Boundaries III کے پراجیکٹ کی پاکستان۔افغانستان جوائنٹ کمیٹی (PAJC) کا حالیہ اجلاس میری صدارت میں 15 دسمبر 2017ء کو CRSS اور OESP کے اشتراک سے کابل میں ہوا۔ اِس وفد میں پاکستان کی طرف سے رانا افضل خان MNA، شازیہ مری MNA، سینیٹر شبلی فراز، سینیٹر مرتضیٰ وہاب، سابقہ سفیر میاں ثناء اللہ، سابقہ سفیر سیما الٰہی بلوچ، سابقہ سفیر قاضی ہمایوں، جنرل (ر) آصف یٰسین ملک، سابقہ آئی جی شعیب سڈل، کاشف عباس ARY، محمد طاہر خان ماہر پاک افغان امور، راجہ سرفراز جیو، رحمن اظہر ایکسپریس، امتیاز گل CRSS، طٰہٰ قریشی MBE، زاہد حسین ماہر جرنلسٹ اور مصنف، فائزہ سیکرٹری جنرل پاکستان افغانستان جوائنٹ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے شرکت کی۔ اور افغانستان کی طرف سے عبدالقادر زازئی MP، میر واعظ یٰسینی MP، خالد پشتون MP، رنگینہ کارگر MP، ایلے ارشاد MP، سلیم خان قندوزئی سابقہ گورنر صوبہ ننگرہار، آصف ننگ ڈائریکٹر ٹیکنیکل ریسرچ سنٹر کاروان یونیورسٹی، دانش کاروخیل جرنلسٹ، نجیبہ ایوبی جرنلسٹ، محمد رفیع صدیقی آپریشن ڈائریکٹر خورشید گروپ، عبدالقدیر بھامن انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس کے سربراہ، محمد یونس مہمند نائب صدر افغانستان چیمبرز آف کامرس، مزمل شنواری سابقہ وزیر،

اسیلہ وردک سفارت کار، مینا وردک انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس کی نمائندہ ، نقیب اللہ سافی سیکرٹری جنرل پاکستان۔ افغانستان جوائنٹ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری۔

اس سے پہلے ہمارے وفد کے لئے افغانستان میں پاکستان کے سفیر جناب زاہد نصراللہ صاحب نے ایک بریفنگ اور پرتکلف عشائیے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا اس میں ان کی معاونت کمرشل اتاشی کے علاوہ ڈیفنس اتاشی بریگیڈیئر فاروق زمان نے کی۔

CRSS کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ صورتِ حال کافی مخاصمانہ ہوسکتی ہے اسی لئے انٹرنیشنل ابزرور کے طور پر آپ تدبر اور حکمت سے اِس اجلاس کی صدارت کریں تا کہ مطلوبہ نتائج حاصل کرسکیں۔

اس اجلاس کے تمام شرکاء جہاں دیدہ اور پیشہ وارانہ مہارت کے حامل ہائی پروفائل لوگ تھے۔لہٰذا انہوں نے اپنا اپنا مؤقف واضح الفاظ میں پیش کیا اور ایک دوسرے کو حوصلے کے ساتھ سنا۔تمام شرکا نے میری توقع سے زیادہ باہمی احترام و برداشت کا خیال رکھا اور ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس اجلاس میں اس پراجیکٹ کے پہلے اجلاسوں کا ایک جامع جائزہ لینے پر مجھ پر یہ آشکارا ہوا کہ دونوں ممالک کے درمیان بہتری کی صورتِ حال پیدا ہونے اور دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ورکنگ گروپس کا قیام ایک حوصلہ افزا اقدام ہے۔بالخصوص کابل اور اسلام آباد میں وفود کا تبادلہ بالخصوص دونوں ممالک کے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن (DGMOs) کے درمیان مشاورت یقینی طور پر ایک مثبت پیش رفت ہے کہ موجودہ نظم وضبط دونوں ممالک کے تعلقات میں مزید بہتری لائے گا اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے سے تعاون اور گفتگو جاری رکھیں گی۔

دوطرفہ تعلقات میں بہتری لانے کے لئے امن کا قیام، سیکورٹی میں بہتری، مہاجرین کی پرامن اور باوقار طریقے سے واپسی، میڈیا کے درمیان تعاون، عوام اور سامان کی نقل وحرکت سے متعلق نظم وضبط، تجارت کی سہولت، ویزہ کے راستے میں رکاوٹیں اور طلبا وطالبات کے لئے وظائف جیسے اہم مسائل پر کھلے دل سے بحث وتمحیص PAJC کے اراکین کی سنجیدگی بالکل مترشح تھی۔

PAJC کی سفارشات:

PAJC کے اراکین کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس ڈائیلاگ کی افادیت کو چیک کرنے کے لئے ایک مانیٹرنگ گروپ بنانے کے ساتھ ساتھ دونوں حکومتوں کے لئے مندرجہ ذیل سفارشات بھی مرتب کی گئیں۔

(۱) ٹرانزٹ ٹریڈ سے متعلق مسائل کے حل کے لئے

APTTCA (Afghanistan-Pakistan Transit Trade Coordinating Authority)

کے اجلاس کو فوری طور پر بلایا جائے۔

(۲) دوطرفہ تجارتی مذاکرات بشمول پاکستان کے لئے افغان برآمدات پر ریگولیٹری ٹیکس کے فوراً شروع ہونے چاہئیں۔

(۳) افغان طلبا وطالبات کے لئے پاکستان کی طرف سے وظائف پر فوراً عملدرآمد ہونا چاہیے۔

(۴) پاکستان کی طرف سے دیئے گئے پراجیکٹوں کی تکمیل کے لئے افغانستان فوراً اقدامات کرے اور افغانستان حکومت

ہسپتال کے لئے آلات اور مشینوں پر ٹیکس کی معافی کے لئے اقدامات کرے۔

(۵) وہ لوگ جو پاکستان کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر افغانستان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اُن کی ایلومنائی (Alumini) بنائی جائے تا کہ وہ دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔

(۶) ویزہ کے لئے دونوں ممالک آسانیاں پیدا کریں۔ بالخصوص کاروباری حضرات، پارلیمنٹیرنز، میڈیا کے نمائندگان اور مریضوں کے لئے خصوصی انتظام کئے جائیں۔

دوطرفہ تعلقات کو مزید بہتر بنانے کے لئے اقدام:

(i) نوجوانوں کے تبادلے کیلئے ایک ایسا پروگرام وضع کیا جائے کہ ایک دوسرے ممالک کے مختلف خاندانوں کے ساتھ نوجوان کچھ وقت گزار سکیں۔

(ii) صحافیوں کے لئے بھی ایک Exchange پروگرام ترتیب دیا جائے تا کہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔

(iii) ثقافتی پروگرام بھی ترتیب دیئے جائیں جن میں مختلف گلوکار بھی شریک ہوسکیں۔

(iv) سندھ حکومت کے وزیر اعلیٰ نے جنوری 2017 میں جن پروگراموں کی منظوری دی تھی اُس کو بھی چیک کیا جائے کہ کہاں تک پہنچے ہیں۔

(v) برطانوی تھنک ٹینک ''فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈیویلپمنٹ'' FIRD جو کہ تنازعات کے حل کے لئے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، نے سکول آف اکنامکس اینڈ لاء یو کے کے اشتراک کے ساتھ 10 وظائف کا اعلان کیا۔ جس میں 5، 5 طلبا افغانستان اور پاکستان سے برطانیہ جا کر تعلیم حاصل کریں گے۔ بشرطیکہ درخواست گزار یو کے ویزا اینڈ امیگریشن کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔

یونیورسٹی طلبا کے چبھتے ہوئے سوالات:

اس دورے میں کابل کی کاروان یونیورسٹی اور کاردان یونیورسٹی (Kardan University and Karwan University) کا دورہ بھی کیا گیا جہاں لیکچرز اور طلبا کے ساتھ مذاکرے ہوئے۔ یہ انٹرنیشنل ریلیشنز کے طلبا و طالبات تھے اور کافی سنجیدہ اور چُبھتے ہوئے سوالات کر رہے تھے۔ ان مذاکروں میں جناب رانا افضل خان MNA، محترمہ سیما الٰہی بلوچ سابقہ سفیر، طٰہٰ قریشی MBE، مزمل شنواری سابقہ وزیر، ایلے ارشاد MP اور معروف صحافی جناب زاہد حسین نے شرکت کی۔ مزمل شنواری نے CRSS اور OESP کے اشتراک سے Beyond Boundaries III پروجیکٹ کے اغراض ومقاصد، اس کی ضرورت اور مطلوبہ نتائج پر روشنی ڈالی۔ رانا افضل خان نے اپنے افغان بھائیوں، مختلف اداروں، سیاست دانوں اور کاردان و کاروان جیسے تعلیمی اداروں کی طرف سے پاکستان کے وفد کا گرم جوشی سے استقبال پر اظہارِ تشکر کیا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ہمارے لئے افغانستان میں امن واستحکام اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا پاکستان میں۔ یہ تبھی ممکن ہے جب دونوں ممالک اس کے حصول کے لئے مخلصانہ کوشش کریں۔ ہم آپس میں بھائی ہیں اور ہم اپنے اختلافات مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر حل کر سکتے ہیں۔ ہمیں جہاں پر ابلم ہے اس کو قبول کرنا ہوگا اور اس کے لئے ایک

پائیدار حل تلاش کرنا ہوگا۔ افغانستان ایک خود مختار ملک ہے اور ہماری قطعاً کوئی خواہش نہیں کہ ہم اس کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کریں۔

راقم الحروف کا مندوبین سے خطاب:

راقم الحروف نے اپنی معروضات کا آغاز قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ کی تلاوت سے کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ... (5)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنا دیے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (نہ کہ ایک دوسرے سے تعصب یا نفرت کرو)، بے شک تم میں سے عزت و اکرام والا وہ ہے جو تم میں سے پرہیز گار ہے''۔

اس کے بعد میں نے اِس بات پر زور دیا کہ دونوں قومیں مسلمان ہیں اور جسد واحدہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک ہی ثقافت ہے، ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں۔ افغانوں کے پاکستان کے اندر کاروبار ہیں لیکن اِس قدر مخاصمت میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ شاید ہم قرآن مجید کا سبق بھول چکے ہیں۔

میں نے اساتذہ اور طلبا کو یہ چیز باور کرائی کہ وہ نہ صرف افغانستان بلکہ اس پورے خطے کا سرمایہ اور مستقبل ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے ماضی کے بوجھ کو اتار پھینکنا ہوگا اور مذاکرات کے اس طرح کے پروجیکٹس کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ ایک غیر جانبدار برطانوی مبصر کی حیثیت سے میں نے ان کو یورپ میں جرمنی، فرانس اور برطانیہ وغیرہ کے درمیان مخاصمت، نفرت اور دشمنی جو دو عالمی جنگوں پر منتج ہوئی تھی اور جس میں لاکھوں سویلین و فوجیوں نے اپنی جانیں ضائع کیں۔ صنعت کو تباہ کر دیا گیا۔ لندن شہر کے اندر تباہی و بربادی کے مناظر ابھی تک محفوظ ہیں۔ اس قدر جنگجو رویوں اور ماحول کے باوجود ان ممالک نے مل کر یورپین یونین، یورپین مارکیٹ، یورو کرنسی اور نیٹو بنائی۔ ان کی اس سوچ میں تبدیلی اور اتحاد کی وجہ سے پورے خطے میں امن، مضبوط سیاسی نظام، انسانی حقوق اور معاشی استحکام پروان چڑھا۔ انہی ممالک نے مل بیٹھ کر ڈائیلاگ کے ذریعے عفو و درگزر کی پالیسی اپنائی اور امن قائم کیا۔ پاک افغان تعلقات بھی عفو و درگزر کے بعد برابری کی بنیادوں پر اُستوار ہو سکتے ہیں۔ اور امن قائم کر کے سیاسی اور معاشی استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے جس سے دونوں ممالک کی عوام خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتی ہے۔

مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان دیوارِ برلن گر سکتی ہے تو افغانستان اور پاکستان کے درمیان یہ مخاصمت کی دیوار کیوں نہیں گر سکتی۔؟ انتہا پسندی اور دہشت گردی ایک بین الاقوامی اور کثیر الجہتی مسئلہ ہے لہٰذا مل کر اس کا مقابلہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ نوجوانوں کو بتایا گیا کہ وہ ہمارا سرمایہ اور مستقبل ہیں اور ان کو چاہیے کہ وہ تعصّبات کی عینک کو اتار کر اپنا آزاد نقطہ نظر قائم کریں۔ نوجوانوں کے سامنے برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ کی عوام کے مخاصمانہ تعلقات کی مثال بھی سامنے رکھی گئی۔ جہاں دہشت گردی کے ذریعے ہزاروں افراد کو موت کی نیند سلا دیا گیا یہاں تک کہ IRA کے دہشت گردوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دھماکے سے اُڑا دیا تھا اور برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر جس ہوٹل میں قیام پذیر تھیں اُس کو بھی بم سے اُڑا کر کئی لوگوں کو مار دیا گیا تھا۔ لیکن عوام سے عوام کے ڈائیلاگ نے شمالی آئرلینڈ میں امن کی فضا قائم کرنے میں مدد کی جس کی وجہ سے وہی تشدد پسند لوگ آج جمہوری نظام کا حصہ ہیں، حکومت کا انتظام و انصرام اُن کے ہاتھ میں

ہے۔اور ملکہ برطانیہ کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ہمیں جنگ اور امن کے یورپی تجربے سے سبق سیکھنا ہوگا۔پاکستان کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کی دشمنی کے تناظر میں ہمسایہ ملک افغانستان کے ساتھ تعلقات نہ بگاڑے اور اسے چاہیے کہ وہ ہر قسم کے تشدد کو بالخصوص شمالی علاقہ جات سے ختم کرے۔اور اسی ضابطے کا افغانستان پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک سے پاکستان کے خلاف کام کرنے والے تمام متشدد گروپوں کا خاتمہ کرے۔مزید یہ کہ افغانستان اور پاکستان کو امن اور سیکورٹی کے حوالے سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لئے معاشرے کے تمام طبقوں بالخصوص ان پانچ قسم کے طبقوں کو ڈائیلاگ کرنے کے لئے آگے کرنا ہوگا۔

(1) P2P عوام سے عوام۔
(2) G2G حکومت سے حکومت یعنی سیاست دان۔
(3) A2A آرمی سے آرمی یعنی فوج
(4) M2M میڈیا سے میڈیا یعنی ذرائع ابلاغ۔
(5) B2B بزنس سے بزنس یعنی کاروباری حضرات۔

سابقہ سفیر سیما الٰہی بلوچ نے تقریر کرنے کی بجائے انتہائی اہم سوالات اُٹھائے۔جس سے یہ معلوم ہوا کہ طلبا اور اساتذہ کی ایک قابل ذکر تعداد یا تو پاکستان میں پیدا ہوئی تھی یا اُنہوں نے پاکستان میں تعلیم حاصل کی تھی یا اُن کے والدین افغانستان پر روسی قبضے کے وقت پاکستان میں پناہ گزین رہے۔ان اجلاسوں میں ایک نقطہ تو کھل کر سامنے آیا کہ دونوں ممالک کی عوام میں کوئی فاصلے نہیں ہیں۔افغان شرکاء نے کہا کہ ہم پاکستانی عوام کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے روس کے خلاف جہاد میں ہماری مدد کی اور ہمارے مہاجرین کو نہ صرف اُس وقت سہارا دیا بلکہ ابھی تک پاکستان کی طرف سے مدد جاری ہے۔لیکن بہرحال پاکستان کی طرف سے طالبان، انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کی حمایت اور ہمارے ملک کا نقصان ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔

طلبہ پاکستان مخالف جذبات رکھنے کے حوالے سے کافی کھل کر گفتگو کرتے رہے۔ان میں سے اکثریت یہ یقین رکھتی تھی کہ پاکستان، افغانستان کو غیر مستحکم کرنے کے لئے حقانی نیٹ ورک جیسے دہشت گرد گروپوں کو سپورٹ کرتا ہے۔جب بعض حضرات پاکستان کے خلاف انتہائی منفی رویوں کا اظہار کرتے تو علامہ اقبال مرحوم کے یہ مصرعے میرے ذہن میں گھومتے:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

انہوں نے کہا کہ پاکستان نے ہمارا بارڈر بند کر دیا۔ہمارے کاروباروں کو گزند پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ہمارا فروٹ بارڈر پر گل سڑ گیا۔یہ فوج کا فیصلہ تھا۔سیاست دان بے بس نظر آتے ہیں۔جب ہم قانونی طور پر ویزا لے کر پاکستان جاتے ہیں تو پولیس ہمیں پھر بھی روکتی ہے اور رشوت کا تقاضا کرتی ہے۔پاکستانی فوج ہمیں بھارت کی طرف دھکیل رہی ہے اور وہ ہمارے ساتھ کھلے دل کے ساتھ ٹریڈ کرتے ہیں۔اور ہمیں ہزاروں وظائف دیتے ہیں۔ہماری روزانہ 5 پروازیں بھارت کے لئے جاتی ہیں جبکہ پاکستان کے لئے صرف ایک۔پاکستان ہمیں یہ کیوں کہتا ہے کہ بھارت کے ساتھ ہم تعلقات نہ رکھیں۔ہم ایک آزاد ملک ہیں اور ہمیں آزادانہ فیصلے کرنے دیئے جائیں۔

بہر حال وفد کے تمام اراکین نے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر چہ کئی مسائل ہیں لیکن کچھ چیزیں بڑھا چڑھا کر پیش کی جارہی ہیں اور اُس میں میڈیا کا منفی کردار بھی ہے اور اس کے ساتھ بھارت کا منفی پراپیگنڈا افغان عوام کے اوپر اثر انداز ہو رہا ہے۔

پاکستان کے لئے افغانستان میں امن نہ ہی صرف عزیز ہے بلکہ یہ اُس کی ترجیحات میں شامل ہے۔ پاکستان نے افغان جہاد اور اُس کے بعد کی بدامنی سے ہزاروں جانیں گنوائیں۔ جس میں سیکورٹی اداروں کو بھی بہت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اربوں ڈالر کا نقصان اس کے علاوہ ہے۔ لہٰذا ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم دہشت گردوں کو افغانستان میں کارروائیاں کرنے کے لئے کوئی مدد دیں جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ کئی لوگ اس وقت افغانستان میں پناہ گزین ہیں جنہوں نے پاکستان میں دھماکے کر کے زیادہ جانی نقصان کیا ہے۔ اور یہ تمام اطلاعات پاکستان کے آرمی چیف جنرل قمر باجوہ نے افغانستان کے اربابِ اقتدار و اختیار تک پہنچادی ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے مندرجہ ذیل ورکنگ گروپ بنانے کی تجاویز دی ہیں۔

(۱).....ملٹری ٹو ملٹری ڈائیلاگ کا آغاز
(۲).....دونوں ممالک کے درمیان انٹیلی جنس کا تبادلہ
(۳).....بارڈر مینجمنٹ
(۴).....افغان مہاجرین کی واپسی
(۵).....اقتصادی معاونت

افغانستان کے CEO جناب عبداللہ عبداللہ سے ملاقات:

Beyond Boundaries III کے پراجیکٹ کی پاکستان۔ افغانستان جوائنٹ کمیٹی (PAJC) کے ممبران کی ملاقات افغان قومی اتحاد حکومت کے چیف ایگزیکٹو جناب ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ سے اُن کے دفتر میں ہوئی اور ظہرانے پر کھلے ماحول میں گفت وشنید ہوئی۔ اس سے پہلے جناب عبدالرؤف ابراہیمی سپیکر نیشنل اسمبلی افغانستان کے ساتھ ان کے چیمبر میں ناشتے پر تبادلہ خیال ہوا۔ ان دونوں اجلاسوں کے محرک اور منتظم مزمل شنواری سابقہ ڈپٹی وزیر تجارت تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ نے شرکا کانفرنس سے کہا کہ دہشت گردوں کے خلاف صحیح معنوں میں جنگ دونوں ممالک کے درمیان اعتماد کی فضا بحال کر سکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ افغانستان ہمیشہ ہمسایہ ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کو اہمیت دیتا ہے۔ جو کہ باہمی احترام، اچھی ہمسائیگی اور مخلصانہ تعاون پر مبنی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ خصوصی طور پر اس اطلاع پر بہت متفکر اور ناراض نظر آئے۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ پاکستان کی طرف بنائے گئے جناح ہسپتال کے لئے آلات کی فراہمی کے راستے میں افغان بیوروکریسی رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ انہوں نے اپنی ٹیم کو اس وقت ہدایات دیں کہ اس کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کر کے ہسپتال کے لئے مشینوں کے لگانے کا کام مکمل کر کے رپورٹ دی جائے۔

انہوں نے کہا کہ سیاسی عزم کی کمی ہے لیکن ٹریک ٹو (II) ڈائیلاگ کا ہونا خوش آئند اقدام ہے۔ چاہے حکومتوں کے درمیان کچھ بھی ہو جائے۔ حکومت کے درمیان جیسی مرضی گفتگو ہو لیکن کچھ منفی چیزیں ایسی ہو جاتی ہیں کہ ہر دفعہ نئے سرے سے آغاز کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ دہشت گردی کی وجہ سے ہماری ساری طاقت اور توجہ خرچ ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہماری ہر ملاقات سے امید پھوٹتی ہے لیکن دو طرفہ تلخی اور دہشت گردی اس (امید) کی جگہ لے لیتی ہے۔ ہم ملنا چاہتے ہیں لیکن کبھی کبھار حالات خراب ہو جاتے ہیں۔

ہمیں مشترکہ خطرات کے لئے مشترکہ حل تلاش کرنا ہوں گے۔ (وہ حقانی نیٹ ورک اور طالبان کی طرف اشارہ کررہے ہیں) ہمیں اپنی سیاسی طاقت اور حوصلے کے ذریعے نوجوانوں کو ماضی کے بوجھ سے چھٹکارا دلانا ہوگا۔ اگرچہ 1990ء کی دہائی میں طالبان ملک کے تقریباً 70 فیصد علاقے پر کنٹرول رکھتے تھے لیکن اپنے گھر میں مشکلات کے باوجود ہماری قیادت (پروفیسر برہان الدین اور احمد شاہ مسعود شہید) نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ تاجک حکومت اور اپوزیشن کو کامیاب مذاکرات کے لئے آمنے سامنے بٹھانے کے لئے جو کچھ بھی کرسکتے ہیں، کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جناب عبداللہ کی PAJC کے اراکین کے ساتھ گفتگو انتہائی نپی تلی تھی جو کہ امید، جذبے اور احتیاط کا حسین امتزاج لگ رہی تھی کہ وہ واقعی چاہتے تھے کہ پاکستان اور افغانستان سکیورٹی کے مسائل پر قابو پا کر خطے کو امن کا گہوارہ بنایا جائے۔

اس اجلاس میں پاکستانی وفد کے اراکین نے اس بات پر زور دیا کہ باوجود یکہ پاکستان نے اپنے افغان بھائیوں کیلئے افغان جہاد کے مشکل وقت میں ان کے ساتھ فیاضی کا مظاہرہ کیا پھر بھی افغان بھائیوں میں پاکستان کے لئے منفی جذبات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمارے لئے یہ حیران کن بات ہے کہ افغانستان کا رجحان بھارت کی طرف زیادہ ہے حالانکہ بھارت مسلم دشمنی میں اسرائیل کا اتحادی ہے۔

ہم افغانستان کو ایک آزاد اور خودمختار ملک تصور کرتے ہیں اور اس کی مکمل خودمختاری پر یقین رکھتے ہیں۔ افغانستان اگر بھارت کے ساتھ تعلقات رکھنا چاہتا ہے تو رکھے، ہمیں بالکل کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اعتراض ہے تو وہ یہ کہ جب افغان ارباب اختیار واقتدار نیو دہلی میں کھڑے ہوکر پاکستان کے خلاف بیان دیتے ہیں اور اسے ایک دہشت گرد ملک قرار دیتے ہیں۔

پاکستانی وفد نے جناب عبدالرؤف ابراہمی، جناب عبداللہ عبداللہ اور افغان ممبران پارلیمنٹ کو یقین دہانی کروائی کہ انہیں افغانستان کو غیر مستحکم کرنے کی بجائے اپنے اس برادر ملک میں سیاسی ومعاشی استحکام اور دیرپا امن میں دلچسپی ہے اور (DGMOs) ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن کا دوطرفہ ڈائیلاگ ایک خوش آئند اقدام ہے اور پاکستانی چیف آف آرمی سٹاف کے افغانستان کے دورے سے اس کو مزید استحکام ملے گا۔ انہوں نے کہا کہ ''عوام سے عوام'' (People to People) ڈائیلاگ ایک قابل ستائش اقدام ہے اور اس سے ایک ایسی تحریک کو فروغ ملے گا جس سے دونوں ممالک کے حکومتی اہلکاروں میں بھی تعاون کی راہ کھلے گی اور سیاسی اداروں میں بھی عزم اور جذبہ پیدا ہوگا۔ پاکستان افغانستان کو بھارت کے پرزم سے نہیں دیکھتا۔ بس اتنا ہے کہ اگر افغانستان کو شکایت ہے تو پاکستان سے بات کرے نہ کہ بھارت میں جاکر میڈیا سے بات کرے۔

رانا افضل خاں نے کہا کہ ابھی پچھلے دنوں کھٹمنڈو میں ایک کانفرنس کے دوران افغان مندوب نے پاکستان کو دہشت گردی کے حوالے سے خوب برا بھلا کہا جبکہ ہم نے انتہائی مثبت طریقے سے اس کا جواب دیا۔ لہٰذا ہم دونوں ممالک کو چاہیے کہ اپنے مسائل باہمی گفت وشنید سے حل کریں نہ کہ دنیا کے سامنے اپنی جگ ہنسائی کا باعث بنیں۔

ظہرانے کے دوران ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ وہ جلد پاکستان کا دورہ کریں گے اور توقع ظاہر کی کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات جلد معمول پر آجائیں گے اور تعلیم اور میڈیکل کے شعبوں میں مزید تعاون بڑھے گا۔

چوتھا باب:

پاکستان کی نظریاتی اساس

دوقومی نظریہ: اسلامی، سیکولر یا جمہوری:

دونوں کے لب و لہجے سے ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ان کا بس چلتا تو کب کا ایک دوسرے کا سر پھاڑ چکے ہوتے۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنے طلبا کو کیا سکھاتے ہوں گے۔؟

ایک پروفیسر صاحب کلین شیو اور لباس سے خاصے ماڈرن لگ رہے تھے، جبکہ دوسرے اس کے بالکل برعکس ہیئت کے مالک، سر پر گھنے مگر الجھے ہوئے بال اور اپنے لباس کے بارے میں خاصے بے پرواہ۔ لیکن ماڈرن پروفیسر کافی رجعت پسند (Conservative) خیالات کے مالک اور دوسرے صاحب بالکل ہی سیکولر خیالات کے حامل۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ مجھے آج، اک آگ کا دریا ہے، اور ڈوب کے جانا ہے، کی کیفیت سے گزرنا ہوگا۔

اصل میں آج پاکستان کی ایک یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ گروپ ڈسکشن کا سیشن تھا۔ اس کا اہتمام پروفیسر ڈاکٹر ظفر اللہ صاحب نے کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بطور خاص کہا کہ ایک گھنٹے کا مذاکرہ یونیورسٹی میں اساتذہ کے ساتھ کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں نظریہ پاکستان کے موضوع پر دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور دونوں اپنے اپنے نظریات کے حوالے سے دو مختلف انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔ ان کے نظریات اور رویے میں بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ایک غیر جانبدار سکالر ان سے مذاکرہ کرے تاکہ اس غیر یقینی صورتِ حال کو ختم کیا جا سکے جو کہ مستقبل میں طلبا کی رہنمائی کے لئے بھی کام آ سکے۔

مقررہ وقت پر یونیورسٹی کے ایک ہال میں اساتذہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ رسمی تعارف کے بعد ناظم تقریب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا ایک منفرد معاملہ ہے۔ عام طور پر ''قومیں'' اور ''زبانیں'' پہلے سے موجود ہوتی ہیں، پھر حالات کی ضرورت کے تحت ان کی نئی جغرافیائی حد بندی ہوتی ہے لیکن پاکستان کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945) کے بعد جب انگریزی استعمار کا جانا ٹھہر گیا تو بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی۔ جس کا حتمی نتیجہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں نکلا۔ یوں 13 اگست 1947 تک جغرافیائی حیثیت سے ''پاکستانی قوم'' تو موجود نہیں تھی لیکن اگلی صبح ''ملک پاکستان'' وجود میں آ چکا تھا، اس طرح اردو زبان کسی ملک کی سرکاری زبان نہیں تھی لیکن وہ اس نوزائیدہ ملک کی زبان قرار دے دی گئی تھی۔ یوں ملک پہلے اور اس کے بعد قوم وجود میں آئی۔ اس لیے پاکستان میں روز اوّل ہی سے یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس کیا ہے۔ ''دوقومی نظریہ'' پاکستان کا مطلب کیا ''لا الٰہ الا اللہ'' اسلامی ریاست، سیکولر ریاست، جمہوری ریاست، اسلامی جمہوری ریاست ۔۔۔ یہ سبھی باتیں کی جاتی ہیں اور ان کے اپنے اپنے دلائل ہیں، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان کا نظریاتی تشخص آج بھی کئی حلقوں میں زیر بحث رہتا ہے لہٰذا آج ہم نے جناب طٰہٰ قریشی کو دعوت دی ہے کہ وہ اس مذاکرے کی صدارت کریں اور اپنے خیالات و نظریات ہم سے ''شیئر'' کریں اور شرکا گفتگو کی آرا پر اپنا قیمتی تجزیہ بھی دیں۔

میں نے کانفرنس روم میں بیٹھے شرکا کی طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی تو اکثر شرکا کو بڑے اشتیاق سے گفتگو کا منتظر پایا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ محترم پروفیسر صاحب نے انتہائی اختصار کے ساتھ مسئلے کو بیان کر دیا ہے۔لیکن میں اپنی گفتگو کے آغاز سے پہلے دو باتیں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری طرف سے کوئی لمبی تقریر نہیں ہوگی۔ بلکہ ہم سب کی باہمی گفتگو ہوگی۔ دوسرے آپ اپنی رائے کا اظہار جب کر لیں تو وہ دوسروں پر مسلط کرنے کوشش نہ کریں بلکہ اپنے اندر سننے کا جذبہ پیدا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے ہمیں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق ایک حقیقت کو ماننا ہوگا کہ وہ کوئی مذہبی یا روحانی رہنما نہیں تھے بلکہ وہ ایک بااصول سیاست دان اور کامیاب وکیل تھے۔مسلمانوں نے انہیں انگریز کی حکومت سے ہندوؤں کے خلاف دوقومی نظریئے کا مقدمہ لڑنے کے لئے چنا جس میں وہ کامیاب ہوئے اور مسلمانوں کیلئے پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ مملکت معرض وجود میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان دوقومی نظریئے (ہندو اور مسلمان) کی بنیاد پر بنا اور یہ کہ 'پاکستان کا مطلب کیا؟ ''لا الہ الا اللہ'' ، وہ عوامی نعرہ ہے جس کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم ممکن ہوئی۔ قائداعظم کے ایسے بیسیوں بیانات ہیں جس میں انھوں نے فرمایا کہ مطالبہ پاکستان ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی خواہش کا نام ہے، یہ بات اس قدر ثابت شدہ ہے شاید ہی کوئی یہ مطالبہ کرے کہ بتاؤ قائداعظم نے یہ بات کہاں کہی۔اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم کے وہ فرامین بھی ملتے ہیں جن میں انھوں نے واضح الفاظ میں اس بات کی تردید کی ہے کہ پاکستان کوئی متشدد قسم کی مذہبی ریاست ہوگی جہاں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر شہری حقوق نہیں دیے جائیں گے۔ بلکہ قائداُن کے حقوق اور تحفظ پر بہت زور دیتے تھے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ 1973ء کا آئین پاکستان کی ایک متفقہ دستاویز ہے اور اس میں پاکستان کا نام 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' ہے۔ ہاں زندہ معاشروں میں نظریات اور آرا پر گفتگو ہوتی ہے، اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں، آئین و دساتیر میں بھی تبدیلیاں اور اضافے (Amendment) ہوتے ہیں، ملکوں کے نام تک بدل جاتے ہیں لیکن اس کا ایک طریقہ کار ہے۔ اور اس طریقہ کار کا آغاز مذاکرے اور دلیل کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور میرے خیال میں ہماری آج کی نشست اسی طریقہ کار کی ایک کڑی ہے۔۔۔۔ میں ابھی کچھ اور جملے کہنا چاہ رہا تھا لیکن سامنے بیٹھے گھنے اور قدرے الجھے بالوں والے ایک پروفیسر صاحب نے اپنی عینک کا فریم ٹھیک کرتے ہوئے سوال داغ دیا۔ یہ وہی صاحب تھے جن کا تذکرہ میں آغاز میں کر چکا ہوں۔ان کا سوال تھا:

''قریشی صاحب 67 سال گزرنے کے بعد بھی آج یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ قائداعظم کا تصور پاکستان ''سیکولر'' (Secular) تھا یا ''تھیوکریٹک (Theocratic) پاکستان؟ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟''

ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ:

سوال بڑا ٹو دی پوائنٹ تھا لیکن میں اپنی رائے یوں براہ راست نہیں دینا چاہتا تھا۔اس لیے محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:

''قائداعظم نے حکومت کی پالیسی کی وضاحت کے لیے 13 جولائی 1947 کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی اور اس میں غیر مسلم اقلیتوں کو ہر لحاظ سے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے مذہب، عقیدے، جان و مال اور ثقافت کو تحفظ

حاصل ہوگا۔'' پریس کانفرنس میں موجود ایک صحافی نے جب قائداعظم سے یہ پوچھا کہ پاکستان کی ریاست ''سیکولر'' (Secular) ہوگی یا ''تھیوکریٹک'' (Theocratic) (پاپائی) تو ان کا جواب تھا کہ یہ سوال احمقانہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ''تھیوکریٹک'' ریاست کا کیا مطلب ہے؟ (قائداعظم کا اشارہ یورپ کی پاپائیت کی طرف تھا کیونکہ تھیوکریٹک کی اصطلاح مسیحی عقیدہ الوہیت کے پس منظر سے پیدا ہوئی ہے لیکن وہ پس منظر یہاں موجود نہیں) اس پر جب ایک صاحب نے کہا کہ ''تھیوکریٹک'' ریاست کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمان پورے شہری ہوں گے اور غیر مسلم دوسرے درجے کے شہری۔ اس پر جناح نے کہا تھا: ''پھر تو محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے، وہ سب رائیگاں گیا۔ خدا کے لیے اس قسم کے بیہودہ خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ پاکستان ایک خالص جمہوری ریاست ہوگی جس کے تمام شہری یکساں حقوق کے مالک ہوں گے۔

یہاں تک کہہ کر میں نے ذرا توقف کیا اور سوال اٹھانے والے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اگر اس روایت کے معتبر ہونے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں تو خود ہی فرمایئے کہ قائداعظم کا تصور پاکستان کیا تھا؟''

''بہت واضح ہوگئی بات، اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوگا کہ ان کے نزدیک پاکستان ہرگز کوئی مذہبی ریاست نہیں ہوگی۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ جناح کے پاکستانی نیشنلزم میں اسلام کو کسی قسم کی برتری حاصل نہیں تھی۔ ان کے نزدیک پاکستان کی جغرافیائی حدود میں آباد ہر شخص کو بلالحاظ مذہب وعقیدہ ترقی وخوشحالی کے یکساں مواقع مہیا تھے۔ گویا قائد کے مطابق نظریہ پاکستان فقط جغرافیائی سرحدوں پر مبنی تھا۔''

میرے بولنے سے قبل ہی ماڈرن لباس والے صاحب بول اٹھے: ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، بھلا قائداعظم کے اس فرمان سے ''فقط جغرافیائی سرحدوں'' کا فلسفہ کہاں سے نکل آیا؟'' انھوں نے جملے کے آخری الفاظ خاصے چبا چبا کے بولے تھے۔

دوسرے پروفیسر صاحب نے بھی میری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

''یہ مفہوم قائداعظم کے ان اقدام اور احکامات سے نکلتا ہے جو انہوں نے بطور گورنر جنرل پاکستان دیے تھے انھوں نے ایک ہندو دلت جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون مقرر کیا۔ کیا وہ ان کے ذریعے سے ملک میں ''اسلامی قانون کی بالادستی'' چاہتے تھے؟ اگر ان کا یہ مقصد ہوتا تو وہ ان جید علما میں سے کسی ایک کو اس منصب پر فائز کر سکتے تھے جن کو مرکزی اسمبلی کی رکنیت بھی حاصل تھی۔ ایسا کرنے میں قائداعظم کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ اسی طرح قائداعظم نے سرظفر اللہ خان کو پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کر دیا یہ صاحب احمدیہ (قادیانی) گروہ کے سرگرم رکن تھے۔ جنہیں 1974ء میں پاکستانی پارلیمنٹ (جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے) نے متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا۔ یہ وہی سرظفر اللہ ہیں جنہوں نے قائداعظم کا جنازہ بھی نہیں پڑھا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ مجھے مسلمان حکومت کا غیر مسلم وزیر یا غیر مسلم حکومت کا مسلم وزیر سمجھا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ قائداعظم نے ایسے لوگوں کو وزارتیں دے کر کیا اسلامی نظام قائم کرنا تھا؟ یقیناً وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔''

'اگر اس سے آپ یہی نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں! محترم قریشی صاحب نے قائداعظم کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان پر غور کیجیے۔۔۔ قائداعظم نے غیر مسلموں کے لیے ''اقلیت'' کا لفظ استعمال نہیں کیا؟ کیا انھوں نے

ایک سے زیادہ دفعہ یہ نہیں کہا کہ نظریہ پاکستان ہی اصل میں نظریہ اسلام ہے۔ کیا انھوں نے سٹیٹ بنک کے افتتاح پر نہیں کہا تھا نہ ہمیں کمیونزم سے کوئی لینا دینا ہے نہ سرمایہ دارانہ نظام سے، اسلام ہمیں معیشت اور اقتصادیت کے اپنے اصول دیتا ہے۔'

قبل اس کے کہ وہ پروفیسر صاحب اپنے حق میں قائداعظم کے مزید دلائل دیتے، دوسرے پروفیسر صاحب نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا: ''ذرا ٹھہریں قبلہ۔۔ یہ سارے سیاسی بیانات تھے اصل اور پالیسی بیان اس بیانیے کو حاصل ہے جو انھوں نے پارلیمنٹ کے پہلے اجلاس میں دیا ان کا فرمان تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ''ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے''۔ دراصل قائداعظم جس قسم کا پاکستانی نیشنلزم ابھرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اس کی بنیاد سیکولر تھی اور ان کا یہ مطلب نہیں تھا کہ لوگ اپنا مذہبی عقیدہ ترک کر دیں گے بلکہ ان کی رائے تھی کہ سیاسی اعتبار سے سب ایک قوم کے شہری ہوں گے'' اور مذہب ہر فرد کا ''ذاتی عقیدہ'' ہوگا۔ اب یہ سیکولرازم نہیں تو اور کیا ہے؟'' انھوں نے جملہ ختم کر کے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کے ''ممدوح'' پروفیسر صاحب بول اٹھے اور ان پر کچھ ایسے جملے چست کیے جن کا تذکرہ ہم اس کتاب میں نہیں کر سکتے اور اس کے بعد وہی منظر تھا جس کا میں آغاز میں ذکر کر چکا ہوں۔

اس موقع پر میزبانی کے فرائض ادا کرنے والے پروفیسر صاحب نے انھیں روک دیا۔ اور قدرے تند لہجے میں کہا کہ وہ اپنی بحث بند کر کے قریشی صاحب کی بات سنیں۔ ان کی اس مداخلت کے بعد ماحول پر تھوڑی دیر کے لیے ناگوار قسم کی خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے قدرے دھیمے لہجے میں سیکولرازم کی بات کرنے والے پروفیسر صاحب سے پوچھا:

''جناب اگر پاکستانی نیشنلزم کی بنیاد سیکولر تھی پھر سیکولر ہندوستان سے علیحدہ ہو کر پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی، کانگرس بھی تو یہی کہتی تھی!''

''بہت اچھا سوال کیا آپ نے! لیکن معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ یہ سوال ایک غلط مفروضے پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس ایک سیکولر جماعت تھی جو ایک آزاد سیکولر ہندوستان قائم کرنا چاہتی تھی اور مسلم لیگ سیکولرازم کی مخالف تھی، اس لیے پاکستان بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کانگرس ہرگز ایک سیکولر جماعت نہیں تھی اور نہ وہ ایک آزاد سیکولر ہندوستان قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیڈر انتہائی متعصب ہندو تھے جو کہ برہمن طبقے کی پورے برصغیر پر بالادستی چاہتے تھے۔ لیکن کمال منافقت سے سیکولرازم کا فقط نام لیتے تھے۔ شروع میں مسلم رہنما بھی اس خوش فہمی میں رہے کہ کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ (سیکولر) جماعت ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا محمد علی جوہر سے لے کر محمد علی جناح تک تمام اکابر مسلم رہنماؤں نے اپنی سیاسی زندگی کا ایک حصہ کانگریس کے پلیٹ فارم کی نذر کیا مگر جوں جوں ان پر اصل حقیقت منکشف ہوتی گئی وہ کانگریس سے بددل ہو کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہوتے گئے۔ مسلم عوام الناس پر بھی بتدریج ثابت ہوا کہ کانگریس سیکولر نہیں بلکہ ایک متعصب ہندو جماعت ہے اور سیکولرازم کے نعرے کی آڑ میں ان کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے محکوم و محروم کر کے رکھنا چاہتی ہے۔ خاص طور پر کانگریسی وزارتوں (1939-1937ء) کے بعد یہ تاثر بہت گہرا ہوا اور یوں بتدریج مسلم لیگ مسلم عوام الناس کی امنگوں کی ترجمان بن گئی اور 46-1945 کے عام انتخابات میں برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم کے طور پر ابھری۔ اگر کانگریس واقعی ایک سیکولر جماعت ہوتی تو مسلمانوں کو اپنے لیے ایک علیحدہ جماعت مسلم لیگ بنانے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔'' اس کے بعد انھوں نے کچھ توقف کیا لیکن میں چاہتا تھا

وہ اپنی بات تسلی سے پوری کرلیں اس لیے انھیں مزید بولنے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے میرا اشارہ پاتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی ومعاشرتی حقوق کی تمام تر جدوجہد متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے جاری رکھی۔ قائداعظم کے نزدیک متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن یعنی گروپنگ سکیم اس پاکستان سے زیادہ قابل ترجیح تھی جو بعد میں معرض وجود میں آیا۔ کیا قائداعظم گروپنگ سکیم ''اسلامی نظام کی تجربہ گاہ'' بنانے کے لیے حاصل کررہے تھے۔ یاد رہے کہ اس اسکیم میں امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور خزانہ مرکز کو سونپنے کی تجویز تھی، اور اس صورت میں ہندو اکثریت کے ساتھ مل کر صرف سیکولر بنیاد پر کام ہوسکتا تھا۔ قائداعظم اس کے لیے تیار تھے لیکن ہندو برہمن طبقہ اس کے لیے تیار نہ ہوا، وہ مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل کے بجائے مسلمانوں کو مغلوب کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ تقسیم کے نتیجے میں جو ہندوستان وجود میں آیا وہاں اس کا بدترین عملی مظاہرہ ہوا۔ اس کے جنم دن پر ہی ہندو حکمرانوں نے مذہبی قدامت پرستی کا مظاہرہ کیا اور اس کے بعد چند برسوں میں وہاں مسلمانوں کو تیسرے درجے کا شہری بنا کر رکھ دیا گیا۔ نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ بلکہ اچھوتوں اور سکھوں کے ساتھ جو ناروا سلوک روا رکھا گیا ہے، اس کی ایک طویل داستان ہے۔ اس کے برعکس قائداعظم نے پاکستان کے یوم پیدائش پر سیکولر انداز اختیار کیا۔ انہوں نے ریاست کو مسلمہ جمہوری اور سیکولر اصولوں کے تحت چلانے کا عملی مظاہرہ کیا جس کی تمنا وہ متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے پوری کرنا چاہتے تھے، لیکن کانگریس کے متعصب ہندو رہنماؤں نے ان کی چلنے نہ دی۔ اگر کانگریس سچ مچ سیکولر جماعت ہوتی اور قول وفعل سے اپنا سیکولر ہونا ثابت کرتی اور ہندو مسلم تضاد کو کشادہ دلی کے ساتھ تسلیم کرکے اسے سیکولر بنیادوں پر حل کرنے کی پرخلوص کوشش کرتی تو جناح اور دوسرے لیگی زعما کبھی اس سے علیحدہ نہ ہوتے اور برصغیر کی تقسیم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہندو، مسلم تضاد کو کھلے دل سے تسلیم کرکے حل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ کانگریس کا رویہ تھا جو تقسیم ہند پر منتج ہوا۔ اس لیے یہ ماننا بڑا مشکل ہے کہ پاکستان بنانے کا مقصد دراصل ''اسلامی نظام کی تجربہ گاہ'' کا حصول تھا، اس لیے جہاں تک بانی پاکستان کا تعلق ہے وہ پاکستان کو ایک سیکولر ملک ہی بنانا چاہتے تھے۔''

ان کی بات ختم ہوچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے مخالف پروفیسر صاحب جواب دینے کے لیے بے تاب ہورہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ خود گل افشانی کرتے میں نے ان کو بھی موقع دینا مناسب سمجھا؛ ان کا لب ولہجہ بھی اس دفعہ خاصا بہتر تھا۔ بولے:

''میں کوئی لمبی تقریر نہیں کروں گا، صرف ایک بیان قائداعظم کا پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کے بعد شاید کہنے کو کچھ نہیں بچے گا۔ مارچ 1944 کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

''پاکستان کے مطالبے کا محرک اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کی وجہ کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے''۔ باقی رہی یہ بات کہ قائد اعظم نے ایک ہندو ''جوگندر ناتھ منڈل'' کو وزیر قانون اور ایک احمدی کو وزیر خارجہ بنایا تھا تو گزارش ہے کہ کیا بھارت میں مولانا ابوالکلام کو وزیر تعلیم اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہ اسلامی شریعت اور دیگر علوم کی تدریس کا نظام بنا کر دیں؟ رہی کابینہ مشن (Cabinet Mission) کی بات تو یہ تجویز انگریزوں کی تھی، مسلم لیگ کی نہیں، اور اس کے نتیجے میں پاکستان کا بننا

ایک ناگزیر عمل تھا جس کو بھانپتے ہوئے نہرو نے اسے رد کر دیا تھا۔ اور پھر قائد نے بھی تقسیم ہی کو منزل قرار دے دیا تھا اور جس کے نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ (1945ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد انگریز حکومت نے ہندوستان کو مشروط آزادی کی پیشکش کی۔ اس کی تجویز لے کر اس وقت کی برطانوی کابینہ کے تین رکن ہندوستان آئے اور تمام سیاسی جماعتوں کو یہ تجاویز پیش کیں کہ ملک تین گروپوں کی ایک یونین ہو گی۔ اس میں تین محکموں (دفاع، مواصلات اور خزانہ) کا کنٹرول برطانیہ کے پاس اور باقی سب محکمے ہندوستانیوں کے پاس ہوں گے۔ اور دس برس کے بعد سارا ہندستان آزاد ہو گا اور اس یونین میں شامل تمام صوبے علیحدہ علیحدہ ہو سکیں گے۔ اس صورت میں یہ صوبے آزاد ملک بن جائیں گے۔ مسلم لیگ نے پہلے اس تجویز کو مان لیا لیکن جب کانگریس نے اس کو رد کیا تو مسلم لیگ نے بھی مسترد کر دیا۔) اور اس کے بعد لیاقت علی خان کی سربراہی میں 1949ء کی قراردادِ مقاصد (Objective Resolution) نے اس جدوجہد کو منزل پر پہنچا دیا۔ اور سیکولرازم کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔''

میرے بولنے سے قبل ہی میزبانی کے فرائض ادا کرنے والے پروفیسر صاحب نے بروقت اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کہا: ''میرے خیال میں اب اگر قریشی صاحب اپنا تبصرہ فرمائیں تو بات نکھر کر سامنے آ سکتی ہے۔''

حاکم اعلیٰ (Sovereign) کون؟

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور قدرے توقف کے بعد کچھ اس طرح سے بات شروع کی:

''حضرات یہ مخلوط بحث جو اس وقت ان صاحبانِ علم کی گفتگو کے بعد پیدا ہو رہی ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں حضرات نے جمہوریت، سیکولرازم، اقلیت، برابر کے حقوق وغیرہ کی اصطلاحوں کا مطلب اپنے اپنے نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ مثلاً جمہوریت کو لیں۔ جب ایک غیر مسلم اس کی تعریف کرے گا تو وہ یہی کہے گا اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہو گی اور اس کے اوپر کسی کی رائے نہیں تھوپی جائے گی۔ یعنی اگر اکثریت یا اکثریت کے نمائندے ہم جنس پرستی کے جائز ہونے پر راضی ہو جائیں تو یہ ان کا جمہوری حق ہے (جیسا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران نے ہم جنس پرستی کے قانون کو 2013 میں منظور کر کے کیا تھا) لیکن ایک مسلمان ریاست (جیسا کہ پاکستان) کے اراکین کو اس سے اتفاق نہیں ہو گا۔ وہ کہیں گے کہ حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) اکثریت کی رائے کو نہیں بلکہ قرآن وسنت کو حاصل ہے۔ لہٰذا اگر اراکین پارلیمنٹ کی اکثریت قرآن وسنت کی بالادستی چاہتی ہے تو یہ بھی اُن کا جمہوری حق ہے۔ مثال کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے 7 ستمبر 1974 کے دن احمدیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا اب یہ فیصلہ بھی جمہوری روایات کے مطابق ہے۔ اگرچہ یہ جمہوری فیصلہ مغرب کو پسند نہیں اور پاکستان پر آئے دن کسی نہ کسی طرح دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اس آئینی ترمیم کو ختم کیا جائے۔ جبکہ یہ فیصلہ آئین کے عین مطابق جمہوری طریقے سے کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ احمدی پارلیمنٹ کے فیصلے کو نہ مان کر آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

میں نے اگلی بات کرنے سے پہلے دونوں پروفیسر صاحبان کی طرف دیکھا، ان دونوں نے میرے آخری جملے کے بعد اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا سکیڑا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''دیکھیے جمہوریت کی تعریف یہی کی جاتی ہے نا کہ عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے سے۔ اب ظاہر ہے اگر ہم بھارت کے عوام کی بات کر رہے ہیں تو یہ بھارتی عوام کی پسند، ناپسند کی بات ہو گی اور اگر یہ پاکستان کے عوام کی بات ہو رہی ہے تو یہ پاکستانی مسلمانوں کی ترجیحات

وتر غیبات کی بات ہوگی۔ اب ایک مسلمان معاشرہ تو یہی چاہے گا کہ وہ اپنے اختیارات کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع استعمال کرے۔ ایسے کلچر اور تہذیب کو فروغ دے جو اس کے اسلامی تشخص اور امتیازات کا تقاضا ہے۔ اب اس کے تعین میں اختلافات تو ہو سکتے ہیں لیکن یہ کوئی لادینی چیز بہر کیف نہیں ہو سکتی۔ اور ان اختلافات کو اکثریت کی رائے کے اصول پر حل بھی کیا جا سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلم معاشرے کو ''قرارداد مقاصد'' کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ویسی ہی مہمل شرط ہے کہ آپ روزہ دار سے یہ حلف لیں کہ بھائی تم نے روزہ تو رکھ لیا ہے لیکن اس بات کا بھی وعدہ کرو کہ کچھ کھاؤ پیو گے نہیں۔ تم نے شادی تو کر لی ہے اب اس بات کا بھی اعلان کرو کہ کسی اور کی عورت کی طرف التفات نہیں کرو گے۔ اس لیے کسی مسلمان معاشرے کے لیے جب ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو اس میں سیکولرازم Out of question ہے۔ اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ آپ جب روزے کی بات کرتے ہیں تو کھانے پینے کا کوئی سوال نہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ کیا مسلمان ملک میں غیر مسلم بھی اسلامی شریعت کے مطابق رہیں گے تو میں آپ سے کہوں گا کہ اگر وہ کیفیت ہے جو ریاست مدینہ کے اولین دور کی ہے جس میں مسلمان، یہودی اور مشرکین اکٹھے رہتے تھے تو ریاست ''میثاق مدینہ'' کی طرز پر رہے گی یعنی ہر کوئی اپنے اپنے مذہب کے مطابق معاملات کرے گا۔ اس میں قرآنی اصول ''لکم دینکم ولی دین'' (تمہارے لیے تمہارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین) کا اصول ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ غیر مسلم ایک معاہدے کے تحت مسلم ریاست کے شہری ہوں گے۔ یہ ٹھیک وہی صورت حال ہے جو پاکستان کے ساتھ پیش آئی ہے۔ یہاں کے تمام غیر مسلم ہمارے ساتھ معاہدے میں ہیں، اسی لیے قائداعظم یہ بات کرتے تھے کہ پاکستان میں تمام اقلیتوں کے حقوق برابر ہیں اور بطور شہری حقوق کے نہ مسلمان کو ہندو پر برتری ہے نہ ہندو کو مسلمان پر۔ یہی مطلب ہے اس بات کا وقت کے ساتھ ساتھ نہ کوئی ہندو، ہندو رہے گا نہ مسلمان، مسلمان۔ البتہ ایک مسلم معاشرے میں یہ بالکل فطری عمل ہوگا کہ ان کی باگ ڈور کسی مسلمان ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔ جیسے دنیا کے تمام ملکوں میں اسی مذہب کے لوگ سربراہ مملکت بنتے ہیں جن کی وہاں اکثریت ہوتی ہے۔ سیکولر ہونے کے باوجود اب تک کوئی بھارتی وزیراعظم مسلمان نہیں بنا اور کوئی امریکی یا برطانوی یہودی یا مسلم سربراہ مملکت نہیں رہا۔

رجب طیب اَردگان اور آیت اللہ امام خمینی: ریاست کا سیکولر تشخص:

میں ذرا رکا تو سوال ہو گیا: ''یہ تو بالکل سیکولرازم والی بات ہوگئی، ایک مذہبی یا سیکولر ریاست میں پھر کیا فرق ہے؟'' یہ سوال ''جدید حلیے والے پروفیسر نے کیا تھا۔

''جناب بہت واضح فرق ہے۔ اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے مسلمان کبھی بھی یہ نہیں کہیں گے کہ اسلامی شریعت کا ہمارے قانون سے کوئی تعلق نہیں، یا ہم اپنی پارلیمنٹ کو قرآن وسنت سے بھی بالاتر مانتے ہیں، جبکہ ایک سیکولر ریاست کسی مذہبی قانون کو اپنا تو سکتی ہے لیکن اس کی بالادستی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی مسلمان ریاست کسی مصطفی کمال پاشا یا جمال عبدالناصر کے نظریات سے متاثر ہو بھی جائے تو یہ وقتی ہوگا۔ ایک وقت آجاتا ہے کہ طیب اَردگان، مرسی یا خمینی جیسے رہنما ریاست کا سیکولر تشخص ختم کر دیتے ہیں۔ تاریخ کی گواہی آپ کے سامنے ہے۔''

پروفیسر صاحب کے پاس جواب نہیں تھا یا وہ غور کرنا چاہ رہے تھے، بہر حال خاموش ہو گئے۔

لیکن اب ایک دوسرے پروفیسر نے سوال کیا:

''قریشی صاحب یہ جمہوریت، سیکولرازم اور برابر کے حقوق کی بات تو خوب سمجھ آ گئی لیکن آپ نے اقلیت کی تعریف نہیں کی۔''

''اقلیت، اکثریت کا متضاد ہے اور اس کا ایک مطلب یہ ہے کسی ملک میں ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے کم ہونا اور یہی قائداعظم مراد لیتے تھے۔ ان کے خیال میں ہندو یا عیسائی مسلمانوں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں، اس لیے وہ اقلیت ہیں۔ اس سے ان کی نہ کوئی تحقیر مراد ہے نہ تقصیر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے برطانیہ میں مسلمانوں یا سکھوں کے لیے ہندوؤں کے مقابلے میں 'اقلیت' کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیکن کچھ لوگ اس سے مراد ''ذِمی'' لیتے ہیں یعنی وہ غیر مسلم جن کو مسلمانوں نے فتح کر کے اپنا ماتحت بنایا ہو اور ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہوتی ہے۔ ان سے ایک اضافی ٹیکس ''جزیہ'' لیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب نہ پاکستان میں ایسی کوئی صورت ہے نہ دنیا کے کسی اور جمہوری ملک میں۔''

ایک مختصر وقفے کے بعد گھنے بالوں والے پروفیسر صاحب نے پوچھا:

''قریشی صاحب آپ کے خیال کے مطابق قائداعظم کا نظریہ پاکستان کیا تھا؟''

''ایک جمہوری طرز حکومت والی فلاحی ریاست!''، میں نے جواب دیا:

''آپ نے 'اسلامی' کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا؟''

''مسلم اکثریت کے معاشرے میں اس لفظ کا استعمال ''تحصیل حاصل'' ہے، یہ ایسی ہی غلطی ہے جیسے ''ماہ رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا'' یا جیسے یہ سوال کہ کیا کیمسٹری میں فارمولے ہوں گے؟ مزید یہ کہ اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہوئی ہیں۔'' ان صاحب کی تسلی اب بھی نہیں ہوئی تھی، بولے:

''آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں کہ کیا یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ ان کا نظریہ پاکستان جمہوری تھا، اسلامی نہیں!''

جمہوریت میں اسلامی تصور ہے، اسی لیے قائداعظم کا فرمان موجود ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کا نظام جمہوریت پر مبنی ہوگا کیونکہ مغرب نے اسے اب دریافت کیا ہے لیکن اسلام میں یہ تصور اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کا اشارہ سورہ شوریٰ کی اس آیت کی طرف تھا کہ ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ''۔ (مسلمانوں کا نظم حکومت مشورے کا پابند ہوتا ہے)

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''پروفیسر صاحب قائداعظم کے منہ میں اپنی بات نہ ڈالیں۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں آپ اسلام کی اپنی کوئی مخصوص تعبیر مانتے ہیں یا آپ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے، اس کا آپ کو پورا پورا اختیار ہے لیکن کہنے والے کی بات کا وہی مفہوم لینا چاہیے جو وہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔! اور قائداعظم پاکستان کو ایک ایسی جمہوری فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے جو قرآن وسنت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے اسلامی تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہو''

قائداعظم اور قراردادِ مقاصد:

میری اپنے سیکولر دوستوں سے یہ گزارش ہے کہ وہ قراردادِ مقاصد کا ایک بار مطالعہ ضرور کریں۔ یہ قرارداد 12/مارچ 1949 کو پاکستان کی اسمبلی میں اُس وقت پاس کی گئی جب تحریک پاکستان کے روحِ رواں جناب نوابزادہ لیاقت علی خان شہید وزیراعظم تھی۔ اس قرارداد کے پہلے پیراگراف پر اگر غور کیا جائے تو پاکستان میں اسلام کے سوا کسی اور نظام کی گنجائش ہی نہیں بچتی۔ اس تاریخی قرارداد کا آغاز مندرجہ ذیل تحریر سے ہوتا ہے کہ:

''اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے۔ اُس نے جمہور کے ذریعے مملکت پاکستان کو جو اختیار سونپا ہے، وہ اُس کی مقررہ حدود کے اندر مقدس امانت کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔''

اس قرارداد کے ذریعے یہ منظور کیا گیا کہ: ''مجلس دستور ساز نے جو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہے، آزاد وخودمختار پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جس کی رو سے مملکت اپنے اختیارات واقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

جس کی رو سے اسلام کے جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کا پورا اتباع کیا جائے گا۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو قرآن وسنت میں درج اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں، اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہوں۔''

یہی وہ موقع تھا جب ہمارے میزبان نے یہ نشست ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اب چائے کا سیشن شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کیونکہ اس نشست میں نظریہ پاکستان کے حوالے سے کئی سوالات اُٹھائے گئے تھے اور اسی طرح کے سوالات بعض سیاسی دوستوں اور کچھ دانشوروں کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً دہرائے جاتے ہیں تو اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کر کے قائداعظمؒ کے موقف کو وضاحت کے ساتھ نقل کیا جائے تاکہ قارئین کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

قیامِ پاکستان سے قبل قائداعظم کی نظریاتی جدوجہد :

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز 1906ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کرنے سے کیا۔ ابتدا میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ 1913 میں انہوں نے کانگریس کی رکنیت کے ساتھ ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ میں بھی شمولیت اختیار کی، اس کے بعد بھی وہ ہندو مسلم اتحاد کے نظریے پر قائم رہے۔ تاہم 1920ء میں انہوں نے کانگریس چھوڑ دی اور خود کو مسلم لیگ تک محدود کر لیا۔ پھر کچھ عرصے بعد مسلم رہنماؤں کے درمیان اختلافات کی وجہ سے انڈیا چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔ 1934ء میں آپ مسلم رہنماؤں خصوصاً علامہ محمد اقبالؒ کی کوششوں سے ہندوستان واپس آئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ اس کے بعد قائداعظم فکر اقبال کی ترویج واشاعت اور مسلم ریاست کے متعلق ان کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خطبات اور تحریروں میں مجوزہ مملکت پاکستان کے اسلامی تشخص کے بارے میں مسلسل غیر متزلزل موقف اپنائے رکھا۔ اور مسلمانان ہند کو اس کی یقین دہانی کرواتے رہے۔ ذیل میں ان کے منتخب بیانات سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

1938۔ مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب

اسلام ہمیں ایک مکمل ضابطہ عطا کرتا ہے۔ یہ محض ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ اس میں قوانین بھی شامل ہیں، فلسفہ بھی ہے اور ریاست بھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں ایسی ہر چیز موجود ہے جس کے ساتھ انسان کو صبح سے لے کر شام تک واسطہ

پڑتا ہے۔(1)

آئندہ نسلوں کے لئے اسلام کی فکر

1938۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب

جب میں دوسروں کے نقطہ نظر اور تہذیب کا احترام کرتا ہوں تو، مجھے اپنے نقطہ نظر سے محبت اور عقیدت ہے۔اور میں کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوسکتا کہ ہماری آئندہ نسلیں اسلام سے بیگانہ ہوں۔(2)

مسلمانوں کے لئے قرآن کے علاوہ ہر پروگرام کی نفی

1939۔پٹنہ میں خطاب 10 جنوری

''جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں، خاص کر ہمارے ہندو دوست کو جب ہم کہتے ہیں: یہ پرچم! اسلام کا پرچم ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم مذہب کو سیاست میں لا رہے ہیں..... یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس پر ہمیں فخر ہے۔اسلام ہمیں ایک مکمل ضابطہ فراہم کرتا ہے۔یہ محض ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ اس میں قوانین، فلسفہ اور سیاست سب شامل ہیں۔اس میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کا صبح سے شام تک کسی انسان سے واسطہ پڑتا ہے۔جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ہم اس کو جامع لفظ کے طور پر لیتے ہیں۔''(3)

اسلام کے پرچم پر قائد کا فخر

1939۔عیدالفطر کے موقع پر بمبئی سے قائداعظم کا پیغام

''مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک پڑھیں، اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کرسکتی۔''(4)

اسلام کے خادم کی طاقت

1940۔آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب

''اسلام کے خادموں کی حیثیت سے آگے بڑھو! اور لوگوں کو معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی ہر لحاظ سے منظم کردو۔مجھے یقین ہے کہ تم لوگ ایک ایسی طاقت بنو گے جسے ہر کوئی تسلیم کرے گا۔''(5)

قرآن سے رہنمائی

1941۔عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں خطاب

''میں نہ تو کوئی مولوی ہوں اور نہ مجھے دینیات پر مہارت کا دعوی ہے، البتہ میں نے اسلامی قوانین اور قرآن مجید کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں رہنمائی موجود ہے، خواہ اس کا تعلق روحانی پہلو سے ہو، معاشرے سے، یا سیاست اور معیشت سے، زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''(6)

مسلم قوم کی روح کی بقا

1941

''ہندوستان کی تقسیم اس لیے ضروری ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق معیشت، معاشرت

ثقافت، اور سیاست میں آزادانہ طور پر زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکیں، یہ ساری جدوجہد اس لیے ہے کہ اس کے پورے پورے مواقع حاصل ہوں اور مسلمان اپنے قومی عزائم کو بروئے کار لا سکیں۔ ہم جس اہم نزع میں مبتلا ہیں وہ صرف مادی فوائد کے لیے نہیں، بلکہ فی الحقیقت مسلم قوم کی روح کی بقا کے لیے ہے۔''(7)

اسلامی تعلیمات اور اقلیتوں کے حقوق

مارچ 1941

''مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو وہ اقلیتیں جو ہماری قومی سرزمین میں ہوں گی یہ دیکھیں گی کہ ہم اپنی روایات، اپنے ورثہ، فکر و عمل اور اپنی اسلامی تعلیمات کی بنا پر ان کے حق میں نا صرف عدل و انصاف بلکہ فیاضی کا معاملہ کریں گے''۔((8

دو قومی نظریہ

جون 1941ء

''جب میں کہتا ہوں ''ہماری آزادی'' اس سے میرا مطلب ہندو اور مسلمان دونوں کی آزادی ہوتا ہے جو فی الحقیقت اس ملک کی دو عظیم ترین قومیں ہیں۔ جب تک ہندو، ہندو ہیں اور مسلمان، مسلمان ہیں۔ ہندو قوم جو یہاں اکثریت میں ہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی کہ اپنی ہی مرضی، اپنے ہی مذہب، ثقافت اور نظام معاشرت کو نمایاں کرے اور مسلمانوں پر جن کی قوم مختلف ہے اور جن کی تہذیب مختلف ہے یہ چیزیں مسلط کی جائیں گی خواہ وہ اُسے برضا و رغبت قبول کریں یا جبر و اکراہ سے۔ اس لیے مسلمان چاہتے ہیں کہ جہاں وہ اکثریت میں ہوں انہیں اپنے طرز زندگی کے مطابق رہنے کا موقع ملنا چاہیے اور جہاں ہندو اکثریت میں ہوں وہ وہاں اپنے طریقہ زندگی کے مطابق رہیں۔ اسطرح دونوں قومیں اپنے اپنے مذہبی اور ثقافتی تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں گی۔''(9)

قرآن اور اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ رویہ

مارچ 1942ء

''ہندو اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ پاکستان میں عدل اور خوش معاملگی کا برتاؤ ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فیاضی کا معاملہ ہوگا۔ ہر ذمہ دار مسلمان کا یہی خیال ہے۔ مزید یہ کہ قرآن کریم نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے کہ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ہدایت دی ہے کہ ہمارے لیے ان سے بلند و بالا کوئی نہیں۔''(10)

پاکستان: مدینہ کی طرز کی ریاست

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہٰ آباد میں سوالوں کے جواب:

''یہ ایک اسلامی ریاست ہوگی جو کہ ریاست مدینہ کی طرز پر ہوگی، جہاں انسانی حقوق، مذہبی آزادی، جمہوریت اور مکمل تحمل اور برداشت، نیز تمام شہریوں کو بلاتفریق رنگ، عقیدہ، نسل، زبان، ضمیر کی آزادی کی امانت دی جائے گی۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے عیسائیوں، یہودیوں، بت پرستوں، دیگر انسانوں کو دی گئی تھی۔ عدل و انصاف، بھائی چارہ، آزادی، مساوات اور اتفاق و اتحاد کو اوّلیت و فوقیت حاصل ہوگی۔''(11)

پاکستان کا طرز حکومت قرآن کے مطابق

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس، جالندھر میں صدارتی تقریر 1943ء:

''مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرز حکومت دینے والا میں کون ہوں؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرز حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن کریم نے فیصلہ کر دیا تھا۔''(12)

ایک اللہ، ایک پیغمبر اور ایک قوم

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس، کراچی، 26 دسمبر 1943ء میں خطاب:

''وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کو یوں اکٹھا رکھتی ہے۔ جیسے وہ جسد واحد ہو، نیز ان کی اجتماعیت کی بنیاد اور ان کی کشتی کا لنگر کیا ہے؟ یہ اسلام ہی ہے، یہ عظیم کتاب قرآن مجید ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کا لنگر ہے۔ مجھے یقین ہے جوں جوں ہم آگے بڑھیں گے ہماری وحدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا ایک اللہ ایک کتاب، ایک پیغمبر اور ایک قوم۔''(13)

قائد پاکستان کے مندرجہ بالا بیانات اور مفکر پاکستان کے مندرجہ ذیل اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک امت کا تصور پیش کرنے میں یک زبان تھے۔ اُن کی تحریروں اور شاعری سے بالکل مترشح ہوتا ہے کہ وہ امت کو جسدِ واحدہ اور اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کے طور پر سمجھتے اور پیش کرتے تھے۔ امت کے نفع اور نقصان کو بھی ایک سمجھتے تھے۔ ایک قرآن اور نبی کی بات کرتے تھے لہٰذا یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ جس طرح دو قومی نظریہ کی لڑائی لڑ کر ایک ریاست وجود میں لائے ہیں۔ کیا اُس کا تشخص اسلامی کی بجائے سیکولر رکھیں گے۔؟ آیئے علامہ اقبال کے خیالات اُن کے اشعار کی روشنی میں سمجھیں:

منفعت ایک ہے اِس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اور درج ذیل شعر میں کس خوبصورتی سے اقبال ملت واحدہ کا پیغام دے رہے ہیں۔ آج ہمیں اپنا محاسبہ کرنے ضرورت ہے کہ ہم قومی اعتبار سے کس طرح ملت کا شیرازہ بکھیرنے میں مصروف ہیں۔ تاہم اقبال کے اس پیغام کو بھول گئے ہیں۔

بتانِ رنگ و خُوں کو توڑ کر مِلّت میں گم ہو جا
نہ تُورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

قرآن مکمل ضابطہ حیات

1944۔ گاندھی جی کے نام خط 17 ستمبر

''قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی

اور معاشرتی سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ یہ مذہبی رسوم سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لے کر انسداد جرائم تک، زندگی میں سزا و جزا سے لے کر آخرت کی سزا و جزا تک غرض کہ ہر قول و فعل اور ہر حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات اور مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر پیمانے کے مطابق کہتا ہوں۔''(14)

قرآن اور اسلامی دستور

1945۔ برصغیر کے مسلمانوں کے نام عید الفطر کا پیغام

''ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں بلکہ بحر اوقیانوس سے لے کر گنگا تک، جیسا کہ گبن Gibin کا کہنا ہے'' قرآن کریم کو اسلامی دستور مانا جاتا ہے، محض عقیدے کے طور پر نہیں، بلکہ دیوانی (سول) اور تعزیراتی قوانین اور ایسے قوانین جو انسانی اعمال اور جائیداد سے متعلق ہیں۔ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جاری شدہ نا قابل تغیر احکام سے نظم وضبط پاتے ہیں۔ ہر کوئی، سوائے ان کے جو جہالت کا شکار ہیں، جانتا ہے کہ قرآن مجید ہی مسلمان کا دستور حیات ہے۔ مذہبی، معاشرتی، دیوانی، معاشی، فوجداری، عدالتی غرضیکہ ہماری مذہبی رسومات سے لے کر روزمرہ کی زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، اجتماعی حقوق سے انفرادی حقوق تک، اخلاقیات سے جرائم تک، دنیاوی سزاؤں سے لے کر آنے والی زندگی کی سزا و جزاء تک کے تمام معاملات پر اس کی عملداری ہے۔''(15)

پاکستان کا مطلب: مسلم نظریہ

1945۔ فرنٹیئر کے سٹوڈنٹس کے نام پیغام

''پاکستان کا مطلب صرف آزادی اور خودمختاری نہیں بلکہ اس کا مطلب مسلم نظریہ ہے جس کا تحفظ ہر حال میں ضروری ہے اور یہ ہمارے پاس ایک قیمتی تحفے اور بڑی دولت کی شکل میں پہنچا ہے۔''(16)

پاکستان اور اسلامی قانون

1945۔ فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب

''مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ اپنے ضابطہ حیات، اپنے تہذیبی ارتقاء اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں''۔((17

قرآنی اصولوں کی پارلیمنٹ پر برتری

1945۔ پشاور میں خطاب

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور فرمائش کا مرجع اللہ کی ذات ہے اس کے لیے تعمیر کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں نہ اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے اور نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔((18

قارئین کی سہولت کے لئے قائداعظم کی 14 جولائی 1947 کی پریس کانفرنس میں ایک سوال کا حوالہ دوں گا۔

پاکستان ایک سیکولر ریاست یا مذہبی

14 جولائی 1947ء۔ کی پریس کانفرنس

سوال: پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگا یا مذہبی؟

قائداعظم: ''آپ ایک ایسا سوال پوچھ رہے ہیں جو نامعقول ہے، مجھے نہیں معلوم کہ مذہبی ریاست سے کیا مراد ہے؟ ایک نمائندے نے کہا: مذہبی ریاست سے مراد ایسی ریاست ہے جہاں صرف ایک ہی مذہب کے لوگ مثال کے طور پر مسلمان مکمل شہری ہوں گے اور غیر مسلم مکمل شہری نہ ہوں۔

قائداعظم: پھر تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ میں نے اب تک کہا، وہ بلخ کی پیٹھ پر پانی پھینکنے کے مترادف ہے، (یعنی کہ تمہیں میری بات ابھی تک سمجھ ہی نہیں آئی)۔ جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہم نے تیرہ سو سال قبل جمہوریت سیکھی تھی۔''(19)

تہذیب اور ثقافت۔ پاکستان کی بنیاد

11 اگست۔ 1947ء

''مملکت خداداد پاکستان میں آپ چاہے عبادت کے لئے گرجا گھر میں جائیں یا مسجد میں یا آپ کسی بھی عبادت گاہ میں جائیں، آپ مکمل آزاد ہیں۔ آپ چاہے کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں، برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم تہذیب وثقافت کے بنیادی اصولوں پر اس ملک کی بنیاد رکھ رہے ہیں جس میں ہر شہری کو تحفظ حاصل ہے۔''(20)

نوٹ:..... ''کچھ لوگ حضرت قائداعظم کی آئین ساز اسمبلی میں اس تقریر سے یہ دلیل لیتے ہیں کہ حضرت قائداعظم ایک سیکولر پاکستان کا نظریہ رکھتے تھے، اسلامی ریاست کا نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم نے یہ الفاظ اُس دور میں وسیع پیمانے پر ہونے والے ہندو مسلم فسادات اور اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر پاکستان سے ہندو اقلیت کے انخلا کو روکنے کے لئے کہے تھے۔ قائداعظم کی ایک اسلامی مملکت کے حق میں درجنوں تقاریر کے برخلاف فسادات کے تناظر پر مبنی ایک تقریر کو سیکولرازم کی دلیل بنانا بالکل غلط ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کے لئے کبھی بھی ''سیکولر سٹیٹ'' کے الفاظ نہیں کہے۔

اسلام کے اساسی اصول

1948ء۔ کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب

''اسلام محض رسوم، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لیے ایک ضابطہ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی اپنے افعال واعمال حتیٰ کہ سیاست، معاشیات اور دوسرے شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا ہے۔ اسلام سب انسانوں کے لیے انصاف، رواداری، شرافت، دیانت اور عزت کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ صرف ایک خدا کا تصور اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسلام میں انسان، انسان میں کوئی فرق نہیں ہے، مساوات، آزادی اور اخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں۔''

محسن اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں نجات

درحقیقت قائداعظمؒ اسلامی جمہوری ریاست کا قیام چاہتے تھے انہوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا تصور رہا ہے، میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز اُن سنہرے اصولوں کی اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقنن اعظم حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں عطا فرمایا ہے، لہٰذا ہمیں ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیے۔''(21)

پاکستان۔اسلام کی تجربہ گاہ

1948۔اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب

''اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''(22)

قائداعظم کا یہ بیان ان کے اس نظریہ کی کھل کر عکاسی کر رہا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ .....قائداعظمؒ کے آئیڈیل

مارچ ۱۹۴۸ء میں اپنی ایک اور تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا

''میں نے مسلمانوں اور پاکستان کی جو خدمت کی ہے وہ اسلام کے ادنیٰ سپاہی اور خدمت گزار کی حیثیت سے کی ہے اب پاکستان کو دنیا کی عظیم قوم اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے آپ میرے ساتھ مل کر جدوجہد کریں۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک ایسی مملکت بن جائے کہ ایک بار پھر دنیا کے سامنے فاروق اعظم کے سنہری دور کی تصویر عملی طور پر کھنچ جائے، خدا میری اس آرزو کو پورا کرے۔''(23)

اس کے علاوہ بھی قائداعظمؒ کے متعدد اقوال اور تقاریر مل جائیں گی جن سے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ نہیں بلکہ ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانے کے خواہشمند تھے۔

قائداعظم کے مندرجہ بالا بیانات کا دیانت دارانہ تجزیہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اور اُن کے رفقا کار پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔

پاکستان کے نظریاتی تشخص کو تبدیل کرنے کے لئے ہمارے سیکولر بھائی خوامخواہ قائداعظم کی 11 اگست کی صرف ایک تقریر کو جواز بناتے ہوئے اُن کی سینکڑوں تقریروں وتحریروں کی نفی کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کا اسلام سے متعلق ایک انجانا سا خوف ہے۔ حالانکہ انہوں نے اسلامی حکومت کا ثمر ابھی تک دیکھا ہی نہیں ہے کیونکہ پوری ''اسلامی'' دنیا میں کہیں بھی ''اسلامی'' نظام تو رائج ہی نہیں ہے۔ اگر صحیح معنوں میں کہیں اسلام رائج ہو جائے تو غربت کا خاتمہ ہو جائے گا، جرائم کی بیخ کنی ہوگی، وقت کا حکمران ہر وقت اپنے مواخذے کے لئے تیار ہوگا۔ اقلیتیں کلی طور پر محفوظ ہوں گی۔ جب یورپ میں مسلمان داخل ہوئے تو اسلامی نظام ہی کی وجہ سے تقریباً 750 سال تک اسپین قابل فخر مسلم ریاست رہی۔ اور یورپ نے اِس سے خوب استفادہ کیا جبکہ برطانیہ برصغیر پر دو صدیوں سے زیادہ قابض نہ رہ سکا۔

ہمارے یہ دوست آئے روز مُلا اور مدرسے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ یہی معاشرے میں بگاڑ کا سبب ہیں۔ بادی النظر میں یہ دوست گویا اسلام کی نفی کر رہے ہوتے ہیں کہ اسلام آج کے مادی دور میں فٹ نہیں ہو سکتا۔ اِن دوستوں سے

میں کہوں گا خود دینی تعلیم حاصل کرو بچوں کو دینی تعلیم دو۔ اگر مُلا صحیح کام نہیں کر رہا تو خود مدرسے کو چلا کر آج کے دور کے مطابق کر لو۔ لیکن خواہ مخواہ مُلا اور مدرسے کو موردِ الزام مت ٹھہراؤ۔ جن مغربی ممالک (مثلاً برطانیہ) نے اسلام کے رفاحی نظام اور انسانی حقوق وغیرہ کو اپنایا وہ آج کل کامیاب ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان جسے اسلام کے نام پر مدینہ کی طرز کی ریاست بنانے کے لیے بنایا گیا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی شہادت کے فوراً بعد ملک کا نظریاتی قبلہ تبدیل کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں اور دنیا ایک اسلامی ریاست کا تجربہ دیکھنے سے محروم ہوگئی۔

آیئے ہم اس انجانے خوف سے نکلیں اور قائداعظم کے مندرجہ ذیل فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کی قدر کریں۔ اور ایک قوم بن کر اسے ترقی کی طرف گامزن کریں۔

"Pakistan not only Means Freedom and Independence but the Muslim ideology, which has to be preserved, which has come to us as a precious gift and Treasure".

آیئے ہم دوسری اقوام کے ساتھ بھی اپنے باہمی روابط کو قائداعظم کے ارشاد کی روشنی میں بڑھائیں۔ ایک دوسرے کے اقدار کو سمجھتے ہوئے اور اپنے اندر رواداری اور برداشت کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے اکٹھے رہنے کا پیغام پھیلائیں۔

"While I respect the philosophy and culture of others, I love and adore my own and can never agree to the coming generations being lost to Islam".

اگر ہم قائداعظم کے ارشادات کے مطابق مسلم نظریے کو ایک قیمتی تحفہ سمجھتے ہوئے محفوظ نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کی اقدار کو نہیں سمجھیں گے، تو ہمارے اندر رواداری اور برداشت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بقول اقبال ہنگامہ فردا کے لائق ہی نہ رہیں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگرسوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

ادارہ احیائے ملتِ اسلامیہ (تشکیلِ نو) (1947-1952)

Department of Islamic Reconstruction

میرے حلقۂ اربابِ علم و دانش میں کئی دوست جس طرح کے لائف سٹائل میں رہ رہے ہیں وہ ہمیشہ مولوی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل وہ بادی النظر میں اپنی زندگی کے طور طریقوں میں اس قدر محو ہیں کہ وہ اسلامی طرزِ زندگی کو اپنے لیے ایک چیلنج اور خطرہ سمجھتے ہیں۔ اور وہ اکثر اس بات پر بضد نظر آتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کو ایک سیکولر ملک کے طور پر دیکھا تھا نہ کہ ایک اسلامی جمہوری مملکت کے طور پر۔

میری اس تحقیق کے دوران ایک چیز سامنے آئی کہ 1947ء میں جب قائداعظمؒ گورنر جنرل تھے اور نوابزادہ لیاقت علی خان وزیراعلیٰ تھے تو اُن کے دست راست جناب نواب افتخار حسین ممدوٹ جو کہ وزیراعلیٰ پنجاب تھے نے جناب علامہ محمد اسد کو دعوت دی کہ وہ ادارہ احیائے ملتِ اسلامیہ قائم کریں اور اُس کی سربراہی بھی قبول کریں۔ علامہ محمد اسد

بتاتے ہیں کہ مرکزی حکومت اُس وقت اپنی خارجہ پالیسی کی طرف زیادہ متوجہ تھی اس لیے یہ کام نواب افتخار ممدوٹ کے سپرد کیا گیا۔اس کام کے لئے باقاعدہ Islamic Reconstuction کے نام سے ایک وزارت بھی بنائی گئی جو کہ تحریک آزادی کے ایک اہم رکن سردار شوکت حیات خان کے حوالے کی گئی۔اِس ادارے کا باقاعدہ بجٹ بھی منظور کیا گیا۔علامہ محمد اسد ایک نومسلم تھے۔آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔لیکن عرب ممالک میں کام کرنے کی وجہ سے اسلام سے بہت متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔1932ء میں ہندوستان آئے اور علامہ محمد اقبالؒ کی رہنمائی میں اپنی فکر کو مزید اُجاگر کیا۔پاکستان بننے کے بعد 1948ء میں انہیں سفارتی مشن پر عرب ممالک میں بھیجا گیا۔بعد میں مراکش میں طویل قیام کیا۔اندلس میں فوت ہوئے اور غرناطہ میں دفن کیے گئے۔

بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ(1949 تا1954) کا قیام:

قارئین کی یاددہانی کے لئے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریک پاکستان کے صفِ اوّل کے قائدین اور حکومت پاکستان کے اوّلین ذمہ داران ریاست کے اسلامی تشخص کے بارے میں کسی قسم کے تذبذب کا شکار نہ تھے۔بلکہ پاکستان کے اسلامی تشخص کے بارے میں ایک واضح پروگرام رکھتے تھے۔لہٰذا یہی وجہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان اور نوابزادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کے زمانے میں پاکستان کے اسلامی تشخص کو نکھارنے کے لئے بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ(1949 تا1954) قائم کیا گیا۔جس میں اُس وقت کے جید علما کرام علامہ سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، پروفیسر عبدالخالق، مولانا ظفر احمد انصاری اور مفتی جعفر حسین مجتہد شامل تھے۔((24

دستورِ اسلامی کے لئے علمائے کرام کے متفقہ بائیس نکات:

بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ کی کوششوں سے جنوری 1951ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں پاکستان بھر سے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے 31 علما نے دستورِ اسلامی کے لئے ایک 22 نکات پر مشتمل دستاویز متفقہ طور پر تیار کی اور تمام علما نے اُس پر دستخط بھی ثبت کئے۔اس دستاویز کے تیار ہونے سے یہ تاثر بھی زائل ہوتا ہے کہ علما کرام کسی دستورِ اسلامی پر متفق نہیں ہوتے۔اس تاریخی دستاویز کے بائیس نکات درج ذیل ہیں۔

(1).....اصل حاکم تشریعی وتکوینی حیثیت سے اللہ ربُّ العٰلمین ہے۔

(2).....ملک کا قانون کتاب وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

تشریحی نوٹ:۔اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں تو اس کی تشریح ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

(3).....مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ اُن اصول وضوابط پر ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

(4).....اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلامی کے احیا واعلا اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم

کا انتظام کرے۔

(5).....اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رِشتہ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت و جاہلیت کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے اُبھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ کا انتظام کرے۔

(6).....مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی، جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(7).....باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں، یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادے کا حق۔

(8).....مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقع صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

(9).....مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(10).....غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود و قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق چلانے کا حق حاصل ہوگا۔

(11).....غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن شہری حقوق کا ذکر دفعہ 7 میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

(12).....رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(13).....رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(14).....رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

(15).....رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ دستور کو کلاً یا جزءاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(16).....جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اُسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔
(17).....رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔
(18).....ارکان وعمال حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون وضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔
(19).....محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تا کہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔
(20).....ایسے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول ومبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔
(21).....ملک کے مختلف ولایات واقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔
(22).....دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔((25

پاکستان پر بیرونی اثر ورسوخ اور اُس کے نقصانات:

آج کل ایک اور مسئلہ زیر بحث ہے کہ پاکستان اب ''الباکستان'' بنتا جا رہا ہے۔ اور مثالیں دی جاتی ہیں کہ پاکستان میں آرمی آج کل سعودی عرب کے زیر اثر ہوتی جارہی ہے کہ اس کے آپریشنز کے نام عربی زبان میں رکھے جارہے ہیں جیسا کہ ضربِ عضب اور ردُّ الفساد وغیرہ اور پھر یہ کہ جنرل (ریٹائرڈ) راحیل شریف کا 41 ممالک کے فوجی اتحاد کا سربراہ بننا بھی اِس چیز کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان کے اندر سعودی اثر ورسوخ بہت بڑھتا جارہا ہے۔ میری نظر میں تو پاکستان ہمیشہ بیرونی اثر ورسوخ سے متاثر رہا ہے۔ اور اسی لیے کوئی آزادانہ داخلہ وخارجہ پالیسی نہ بنا سکا۔ اور معاشی پالیسیاں بھی دوسروں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے ناقص رہیں جس کی وجہ سے ملک عزیز خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا۔

فارسی زبان نے برصغیر پر انتہائی گہرا اثر چھوڑا اور یاد رہے کہ ایران میں اور افغانستان کے کچھ حصوں کی زبان بھی فارسی ہے۔ یہاں تک کہ سر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال جیسے عظیم شاعر بھی فارسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اسرارِ خودی، پیامِ مشرق، رموزِ بے خودی جیسی شاہکار کتب فارسی زبان میں ادبی منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں علامہ اقبال کی کلیات بھی شائع ہو چکی ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ بھی فارسی زبان میں ہے بلکہ لفظ پاکستان خود فارسی زبان سے لیا گیا ہے۔ بلکہ پاکستان کی قومی زبان ''اُردو'' عربی اور فارسی زبان کا مجموعہ ہے۔ اور مزید یہ کہ پاکستان کے تمام دینی مدارس کے نصاب میں فارسی زبان کے عظیم شاعر شیخ سعدیؒ کی تین کتابیں گلستان، بوستان اور کریما آج بھی شامل نصاب ہیں۔ اُن کتابوں میں ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا درس ہے۔ گویا علاقائی صورتِ حال اور وقت کے ساتھ ساتھ زبان، کلچر اور تہذیب پر بیرونی اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن من حیث القوم ہمیں مضبوطی سے اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کے ساتھ جڑے رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ پاکستان کے اندر راہِ نجات، راہِ راست، شیر دل وغیرہ جیسے آپریشن بھی ہوتے رہے ہیں تو پھر یہ شور کیوں ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایرانی لابی خوامخواہ ہی اس کو ایک ایشو بنا کر

اٹھا رہی ہے۔ میں یہاں سعودی عرب کی وکالت نہیں کر رہا بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پاکستانی عوام کو حقیقت پسندانہ سوچ کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور مل کر مملکت خداداد پاکستان کو بیرونی اثر ورسوخ چاہے وہ سعودی ہو یا ایرانی اس سے باہر لانا چاہیے۔

ایرانی اثر ورسوخ:

ایک وسیع حلقے کی رائے یہ ہے کہ ایران کا اثر رسوخ پاکستان میں اسلامی نظریاتی اداروں کے راستوں میں رکاوٹ کا باعث بنا۔ اِسی لیے ایرانی جاسوسی اداروں نے پاکستان میں ایرانی سفارت خانے کے اندر اپنے ملٹری اتاشی کی بیوی ناہید افغامی کو استعمال کیا۔ مختصراً یہ کہ ناہید افغامی نے اُس وقت کے پاکستان کے پہلے سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کو اپنے حسن کا اسیر کیا اور اپنے خاوند ایرانی اتاشی کرنل افغامی سے علیحدگی اختیار کر لی اور کرنل سکندر مرزا سے شادی کر لی۔ 1956ء میں اسی سکندر مرزا کو پاکستان کا پہلا صدر بنوایا گیا۔ اور ناہید افغامی خاتونِ اوّل قرار پائیں۔

اِسی خاتون اوّل کو پاکستان کے بعد میں بننے والے صدر جنرل محمد ایوب خان سلیوٹ کیا کرتے تھے۔ شاید ہمارے سیکورٹی کے اداروں کو گہری نیند نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔

یاد رہے کہ سکندر مرزا مشرقی پاکستان کے گورنر جنرل بھی رہے اور بعد میں گورنر جنرل غلام محمد کی علالت پر عارضی گورنر جنرل بنے اور اِس کے بعد یہ مستقل گورنر جنرل بن گئے اور اپنے وزیر اعظم کے طور پر چودھری محمد علی کو مقرر کیا پھر گورنر جنرل عہدے کو صدر میں تبدیل کر دیا گیا۔

یہ سکندر مرزا ہی تھے جنہوں نے سیاست اور دین کو علیحدہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور عملی طور پر لیاقت خان شہید کے دور میں قائم کئے گئے اسلامی نظریاتی اداروں کو غیر فعال کر دیا کہ اس کے حکومت میں آنے کے بعد اِن اداروں کی کارکردگی کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ انہی سکندر مرزا نے 1958ء میں تمام اسمبلیاں تحلیل کر دیں اور جنرل ایوب خان کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گویا پاکستا-ن کے سیاسی اور نظریاتی نظام کی بساط لپیٹ دی گئی۔ قدرت کا انتقام دیکھیے کہ یہ صاحب پاکستان کے صدارتی ہاؤس سے نکل کر لندن کے ایک ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں محصور ہو گئے اور یہیں فوت ہو گئے۔ پاکستان کے صدر یحییٰ خان نے سکندر مرزا کو پاکستان میں تدفین کی اجازت نہ دی جبکہ ایرانی حکومت نے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے میت کو ایران منگوایا اور حکومتی پروٹوکول کے ساتھ تدفین کی۔

ایرانی اثر ورسوخ والے افغامی خاندان کے علاوہ ایک اور خاندان یعنی اصفہانی فیملی بھی پاکستان کے سیاہ وسفید کی مالک رہی ہے۔ میری مراد جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی دوسری بیوی محترمہ نصرت بھٹو ہے۔ جن کا خاندان ایران سے تھا۔ ان کے دادا نے نجف (عراق) میں تعلیم حاصل کی اور ایران کے آیت اللہ مقرر ہوئے۔ جنہوں نے اپنے صاحبزادے مرزا محمد کو کاروبار کی طرف لگا دیا، نصرت اصفہانی انہی کی بیٹی تھیں۔ اور بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ کی حیثیت سے خاتونِ اوّل بنیں۔ یاد رہے نصرت اصفہانی (بھٹو) ناہید افغامی (مرزا) کی کزن تھیں۔ اس اعلیٰ سطح کی سازش کو مختلف طریقوں سے جاری رکھا جا رہا ہے اور غیر محسوس طریقے سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی حلقوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً پاکستان کے سیکیورٹی اداروں کو اِس کا سختی سے نوٹس لے کر سدِ باب کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اِس اگلی قسط میں پھر ایک کردار اصفہانی خاندان سے ڈھونڈا گیا۔ میری مراد فرح ناز اصفہانی کی

ہے جو کہ مشہور ''میمو گیٹ'' سکینڈل کے کردار اور پاکستان کے امریکہ میں اس وقت کے سفیر حسین حقانی کی اہلیہ تھیں۔فرح ایک واحد MNA تھیں جو کہ زرداری صاحب کے ساتھ قصر صدارت میں مقیم رہیں۔یہ وہی سفیر ہیں جنہوں نے ہزاروں کی تعداد میں امریکی ''کرائے کے قاتلوں'' کو بغیر ضروری کاغذات حاصل کیے ویزے لگا کر دیئے اور اسلام آباد ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان کو اِن امریکیوں کی غیر قانونی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے 2011ء میں ریمنڈ ڈیوس کی طرف سے آئی ایس آئی کے دو اہل کاروں کو گولی مار کر دہشت گردی پھیلانے کا واقعہ ہی کافی ہے۔اس صورتِ حال کا ہمارے سیکیورٹی کے اداروں نے جوانمردی سے مقابلہ کیا اور انتہائی مشکل سے ان کرائے کے قاتلوں کو کنٹرول کیا اور ملک چھوڑنے کا واضح پیغام دیا۔ہمارے اداروں کو چاہیے کہ کچھ غیر روایتی طریقے بھی استعمال کرنے پڑیں تو اِس صورتِ حال کو روکنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھیں۔((26

یہاں ہمیں یہ بات بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ 1979ء میں ایرانی انقلاب کے فوراً بعد ''تحریک نفاذ فقہ جعفریہ ''جیسی تنظیمیں بنائی گئیں اسی طرح 1990ء میں اس کا ایک عسکری وِنگ ''سپاہِ محمد'' کے نام سے بنایا گیا اور ایرانی انقلاب کو پاکستان میں برآمد کرنے کا اعادہ کیا گیا تو ریاست پاکستان اور کچھ عالمی قوتوں کو ایران کا راستہ روکنے کی فکر لاحق ہوگئی۔ چنانچہ مزاحمتی تنظیمیں بھی تخلیق کی گئیں۔جیسا کہ 1985ء میں انجمن سپاہِ صحابہ بنائی گئی جس کو بعد میں سپاہِ صحابہ پاکستان کے نام سے پکارا جانے لگا۔اس جماعت کی قیادت کو راستے سے ہٹا دیا گیا جس کا الزام ایران کی مدد سے چلنے والی تنظیموں پر لگایا گیا۔جس کی بنا پر کچھ لوگوں نے 1996ء میں سپاہِ صحابہ سے الگ ہوکر ''لشکر جھنگوی'' کے نام سے ایک تشدد پسند گروپ بنایا۔جس پر الزام لگا کہ تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ اور سپاہِ محمد کی لیڈر شپ کو راستے سے ہٹانے میں مصروف ہیں۔اور یہ سلسلہ جس کو پاکستان اور ایران کی حکومتوں کی سرپرستی حاصل تھی، کسی نہ کسی اعتبار سے اب تک جاری ہے۔ اور عام عوام جو کہ باہمی رواداری اور امن وسلامتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، شیعہ، سنی فسادات کی نذر ہوگئے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اس تجزیے کو شیعہ سنی تناظر میں نہ دیکھا جائے بلکہ پاکستان میں بیرونی اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان پر کوئی بیرونی حملہ ہوتا ہے جس کا اغلب امکان بھی ہے۔ہمیں بھارت کی Cold Start Doctrine جو کہ پاکستان پر اچانک حملہ آور ہونے کے لئے تیار کی گئی ہے جس میں اُسے اسرائیل اور امریکہ کی مدد حاصل ہے کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔کسی بھی ناگہانی صورتِ حال کے پیدا کرنے والے کسی سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم شیعہ ہو یا سنی؟ اور نہ ہی ایران یا سعودیہ پاکستانی عوام کو بچانے کے لئے آئیں گے بلکہ پاکستانی عوام اور فوج ہی ہوگی جو ایک دوسرے کا دفاع کریں گے۔اس ملک عزیز کی زمینی اور نظریاتی سرحدوں کا دفاع کرنے کی ذمہ داری ہماری ہی ہے اور ہمیں ہی نبھانی ہے ۔اگر کوئی بھی عمل اس مملکت خداداد کے مفاد سے متصادم ہو چاہے اُس کا محرک سعودی عرب ہو یا ایران، ہمیں اس کا حصہ بننے کے بجائے اُس کا سدباب کرنا چاہیے۔حالیہ دنوں میں بھارت کا ایران کے شہر چاہ بہار میں بندرگاہ کا شروع کرنا اور اسی شہر سے بھارتی جاسوس اور دہشت گرد کلبھوشن یادیو کے دہشت گرد نیٹ ورک کا آپریٹ ہونا پاکستانیوں کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہیے۔پاکستان کی عوام کے خلاف سازشوں کا جال کوئی بھی ملک بنے ہمیں چاہیے کہ ایسے ملک

کو نہ صرف خبردار کریں بلکہ اپنی عوام کے اندر شعور اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتے ہوئے پاکستانیت کو اجاگر کریں۔ وگرنہ پاکستانی قوم اندرونی طور پر کمزور ہوجائے گی اور جب قوم اندرونی تضادات اور کمزوری کا شکار ہوجاتی ہے تو وہ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔

افغان جہاد اور نئی امریکی ڈاکٹرن:

قیام پاکستان سے لے کر روس کے خلاف افغان جہاد کی کامیابی تک اور اُس کے بعد ایشیا کی مادی ترقی نے (بالخصوص چائنا) پاکستان کی اسٹریٹیجک پوزیشن میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے خلاف امریکہ بھارت کے گٹھ جوڑ سے کئی پالیسیاں برسر پیکار ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ جس پر بھارت اور امریکہ کبھی خوش نہیں رہے۔ اس وقت مندرجہ ذیل پالیسیاں زور شور سے جاری ہیں اور اُن پر مزید کام ہو رہا ہے۔

* AF-PAK DOCTRINE
* THE COLD START DOCTRINE
* 4TH GENERATION WARFARE DOCTRINE (4GW)
* 5TH GENERATION WARFARE DOCTRINE (5GW)

لہٰذا امریکہ نے اپنی (AF-PAK DOCTRINE) افغانستان اور پاکستان کے حوالے سے نئی جنگی حکمت عملی تیار کر لی ہے اور اس جنگ کو پاکستان کے اندر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گویا پاکستان کو افغانستان، صومالیہ، عراق، لیبیا اور شام کی طرح پتھر کے زمانے میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ اس پر بہت کام ہوا۔ اور پاکستان کے شمال سرحدی علاقوں اور بلوچستان کے اندر انارکی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ہوئی لیکن عوام، علما، سیاست دان، فوج اور میڈیا نے مل کر اس سازش کا جوانمردی سے مقابلہ کیا لیکن یہ امریکی ڈاکٹرن شاید ٹرمپ انڈیا سے مل کر خام بدہن پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ اسرائیل اس کو ٹیکنیکل سپورٹ دے رہا ہے۔ بھارت اپنی پہلے سے طے شدہ جنگی حکمتِ عملی (THE COLD START DOCTRINE) کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امریکہ اور اسرائیل کی مدد سے پاکستان کے بارڈر پر اپنا فوجی انفرا سٹرکچر زور وشور سے تیار کر رہا ہے۔ بھارت کی کوشش ہے کہ سندھ کو پاکستان سے کاٹ کر گوادر تک پہنچا جائے اور (CPEC) کے پورے منصوبے کو الٹ دیا جائے۔ تجزیہ نگار لکھتے ہیں کہ:

The Cold Start doctrine is intended to allow India's conventional forces to perform holding attacks in order to prevent a nuclear retaliation from Pakistan in case of a conflict.

صدر اوباما کے دور میں ایڈورٹائیزنگ پر خرچ کرنے کے لیے 51 ملین امریکی ڈالر کا بجٹ رکھا گیا۔ خبردار حلقوں کے مطابق ظاہر طور پر تو یہ رقم پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے مختص کی گئی تھی۔ دراصل پس پردہ مقصد یہ تھا کہ میڈیا کے لوگ خرید کر پاکستان کے مختلف اداروں اور عوام میں بدگمانی پیدا کی جائے جس سے ایک بڑی خلیج پیدا کر کے ریاست کے مختلف ستونوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا جائے جس سے انارکی میں مزید اضافہ ہوگا تجزیہ نگار اس ڈاکٹرن کو پاکستان کے خلاف ملٹری کے 4TH GENERATION WARFARE کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ ڈاکٹرن عراق اور لیبیا میں کافی کامیاب رہی۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم CLASH OF CIVILATION کے نظریات کا پرچار کر کے مسلم مخالف (ISLAMOFOBIA) احساسات کو ہوا دینا بھی 4TH GENERATION

WARFARE ہی کا حصہ ہے۔اور امریکہ میں صدر ٹرمپ کو کامیابی ملنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اور ان کی ٹرمپ ازم بہت جلد دنیا کو ایک عالمی جنگ کی طرف دھکیل دے گی۔ * 5TH GENERATION WARFARE DOCTRINE (5GW) ایک ایسا جنگی حربہ ہے جو کہ Non-Contact warfare (بغیر کسی براہِ راست انسانی رابطہ کے) کے طور پر جانا جاتا ہے اُس کی تازہ مثال 9/11 کے بعد افغانستان پر امریکی ڈرون کے حملے ہیں۔

پاکستان میں جمہوری، قومی، فوجی یا ٹیکنو کریٹس کی حکومت؟

پاکستان میں میڈیا نے غیر ملکی 4th Generation Warfare ڈاکٹرن کی وجہ سے ایک عجیب وغریب ہیجان خیز کیفیت پیدا کر دی ہے۔یہ وہی ڈاکٹرن ہے جس کے لئے امریکہ نے میڈیا کے لئے کئی ملین ڈالر وقف کیے ہوئے ہیں۔آئے روز سیاستدانوں اور فوج کے معمولی اختلاف الرائے کو ایک سنگین قومی مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔سیاستدانوں کو عدلیہ کے ساتھ ٹکراؤ کی صورتِ حال میں پیش کیا جاتا ہے۔ایسے تجزیات سامنے لائے جاتے ہیں کہ جیسے سیاسی حکومت آج گئی اور کل گئی۔اس میں سیاستدانوں کی اپنی نااہلیاں اور بے قاعدگیوں کا بھی عمل دخل ہے اور دوسرے ادارے بھی اپنی حدود سے آگے نکل جاتے ہیں۔برطانیہ، فرانس وغیرہ میں بھی کئی وزراء مالی بے قاعدگیوں یا دیگر غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن وہاں یہ کوئی نہیں کہتا کہ ''فوج آئی کہ آئی'' بلکہ قانونی حکمرانی کا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔سسٹم مضبوط ہے اُس کے تحت فیصلے ہوتے ہیں اگر کوئی سیاستدان کسی بے قاعدگی یا بے ضابطگی میں ملوث پایا جاتا ہے تو وہ سیاست سے باہر ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں صورتِ حال مختلف ہے یہاں میڈیا کے ذریعے پیپلز پارٹی کی پچھلی حکومت سے متعلق ایسی سنسنی خیز خبریں نشر ہوتی تھیں کہ ان کی جمہوری طریقے سے منتخب شدہ حکومت آج گئی اور کل گئی۔جناب آصف زرداری صاحب سے متعلق مائنس وَن فارمولا زبان زدِ عام تھا نتیجتاً ایک منتخب وزیراعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی صاحب کی عدلیہ کے ذریعے نااہلی کا فیصلہ لے لیا گیا پھر یہی صورتِ حال ایک اور جمہوری طریقے سے منتخب وزیراعظم جناب میاں محمد نواز شریف کی عدلیہ کے ذریعے نااہلی کے بعد پیدا ہوئی۔اور جس طرح پہلے وزرائے اعظم کے خلاف مقدمات بنتے رہے اِسی طرح اب میاں نواز شریف صاحب کے خلاف بھی مقدمات کی بھرمار ہے۔

اِن سے پہلے بھی کئی سیاستدانوں پر مقدمات تھے، جنہیں جیلوں میں بھیجا اور وہ ایک NRO کے تحت باعزت بری ہو گئے۔اور ''ملک کی لوٹی ہوئی رقم واپس لانے کی فکر'' کسی کو یاد نہ رہی۔نہ ہی عوام کو اور نہ ہی خواص کو۔یہ بات تو طے ہے کہ پاکستان میں عملی طور پر فوج کی ''ہاں'' کے بغیر کوئی چیز آگے نہیں بڑھتی تو کیوں نہ اس حقیقت کو مان کر ایک اور سمجھوتہ کر لیا جائے اور فوج کو ایک لیگل رول دے کر اس پورے سیٹ اپ کو تحفظ دیا جائے۔اور ملک کو ترقی کی طرف گامزن کیا جائے۔(اب یہاں سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ ملک ترقی کی طرف گامزن ہوگا یا نہیں؟) جس ملک میں اس طرح کی غیر یقینی صورتِ حال ہوگی تو ملکی ترقی کے منصوبے کیسے تیار ہوں گے۔؟ منصوبے شروع کون کرے گا؟ تکمیل کون کرے گا؟ اور کیسے ہوگی؟ بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال نہیں ہوگا تو سرمایہ کاری کیسے آئے گی؟

اکثر قومی حکومت قائم کرنے کے مطالبات سامنے آتے ہیں۔کبھی فوج کو دعوت دی جاتی ہے کہ فوراً ''کرپٹ'' سیاستدانوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر حکومت سنبھال لے۔یہ تمام چیزیں پہلے آزمائی جا چکی ہیں اور

ناکام ہو چکی ہیں۔ کیونکہ کرپشن ایک ایسا ناسور ہے جو کہ پاکستان کے ہر شعبے میں سرایت کر چکا ہے۔ چاہے فوج ہو یا سیاست دان، انتظامیہ ہو یا عدلیہ، کرپشن دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کے اخلاقی ڈھانچے کو تباہ کر رہی ہے۔ جو لوگ ملک کے ساتھ مخلص اور دیانت دار ہیں اُن کو کونے میں لگا دیا جاتا ہے اور ان کی شہرت کو داغدار کرنے کے لیے کئی جتن کئے جاتے ہیں۔ تو اس کے لئے کیوں نہ ایک جرأت مندانہ اقدام اُٹھایا جائے اور اس دفعہ فوج، پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ متفقہ طور پر ایک ٹیکنو کریٹس کی حکومت لانے کا منصوبہ بنائیں۔

قارئین میں ایک جمہوری ملک میں رہتا ہوں اور ہمیشہ جمہوری اداروں کی قدر کرتا ہوں اور جمہوریت کے اعلیٰ ایوانوں میں اربابِ اقتدار و اختیار کے ساتھ مستقل ڈائیلاگ میں رہتا ہوں لہٰذا فوج کے اشتراک کے ساتھ حکومت بنانا میرے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے لیکن کوئی اور حل بھی تو نظر نہیں آتا۔ اب بھی اگر جمہوری ادارے اور فوج مل کر جمہوریت کو اصلی معنوں میں چلنے دیں تو میرا تجویز کردہ فارمولا ردی کی ٹوکری میں پھینکا جا سکتا ہے۔ اس نئی حکومت کا سیٹ اپ کچھ اس طرح ہونا چاہیے لیکن بہر حال اس کو مکمل پروگرام کی شکل دینے کے لئے کافی کام کرنا ہوگا:

ٹیکنو کریٹس کا ورکنگ گروپ:

☆ اس ورکنگ گروپ کے لیے پوری دنیا سے 50 پاکستانی ٹیکنو کریٹس اکٹھے کیے جائیں جو کہ مختلف شعبوں میں مکمل مہارت رکھتے ہوں۔

☆ اور جو اس پوزیشن کے امیدوار ہوں ان کا پروفائل حکومتی ویب سائیڈ پر ڈالا جائے تا کہ امیدواروں کے ماضی کو اچھی طرح کھنگالا جا سکے اور انکا تقرر غیر سیاسی بنیادوں پر 15 سال کے لیے کیا جانا چاہیے۔

☆ ان کے منصوبے مختصر، وسطی اور لمبی مدت یعنی 5، 10 اور 15 سالہ عرصے کے لیے ہونے چاہیں۔ مندرجہ ذیل چار منصوبوں کو ترجیحی اور جنگی بنیادوں پر ایک ساتھ شروع کرنا ہوگا۔

1۔ انرجی:

ملکی معاشی استحکام کے لئے یہ بات از حد ضروری ہے کہ سب سے پہلے انرجی (بجلی گیس اور تیل وغیرہ) کے بحران کے حل کا منصوبہ بنایا جائے۔ جب تک انڈسٹری کو بجلی، گیس، تیل نہیں ملے گا تو انڈسٹریل ترقی کیسے ہوگی؟ لوگ پاکستان میں سرمایہ کاری کیوں کریں گے۔؟ جب نئی انڈسٹری نہیں لگے گی تو بے روزگاری اور غربت کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ اور معیشت کا پہیہ کیسے چلے گا؟

2۔ تعلیم:

جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں پاکستان کے نظام تعلیم کی مختلف تہوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جا چکا ہے سوسائٹی Polarisation کا شکار ہو کر دو انتہاؤں میں بٹ چکی ہے۔ لہٰذا قوم کو ایک جامع اور مربوط تعلیمی منصوبہ دیا جائے جس سے قوم کے مختلف طبقوں کے درمیان خلیج کو عبور کرنے کی کوئی ترکیب کی جا سکے۔ سوسائٹی کی پولا رائیزیشن کو ختم کیا جائے۔ اس کے لیے برطانیہ اور ترکی کے نظام تعلیم کو بھی سٹڈی کیا جا سکتا ہے۔

3۔صحت:

پاکستان میں غربت، بے روزگاری، غیر معیاری خوراک وادویات کی دستیابی، اقربا پروری، سفارش، دہشت گردی، انتہاپسندی اور لاقانونیت نے پوری قوم کو نفسیاتی اور جسمانی طور پر بیمار کر کے رکھ دیا ہے اسی طرح صحت کے ڈیپارٹمنٹ میں اہل ٹیکنو کریٹس کا ایک سیٹ اپ قائم کیا جائے۔

4۔قومی وقار:

سوسائٹی میں اجتماعی اور قومی وقار و ذمہ داری کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے ایک طویل مدتی جامع حکمت عملی تیار کی جائے۔ وگرنہ قومی اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر آئے روز ہم جس جگ ہنسائی کا نمونہ بنتے ہیں وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اب بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

ہوگئی رُسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

تمام وزارتوں کو ختم کر دیا جائے۔ صرف محکمے ہوں۔ اور یہ ٹیکنو کریٹ اپنے اپنے محکمے کے سربراہ ہوں۔ پروٹوکول پر مکمل پابندی ہو۔

مانیٹرنگ گروپ:

ٹیکنو کریٹس کے ورکنگ گروپ کی کارکردگی کو جانچنے کے لئے ایک مانیٹرنگ گروپ بنایا جائے جس کے ممبران متعلقہ ڈیپارٹمنٹ سے متعلق معلومات رکھتے ہوں اور پروجیکٹ کی کارکردگی رپورٹ مانگنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ لہٰذا مانیٹرنگ گروپ میں سیاستدانوں، آرمی، عدلیہ اور انتظامیہ کی طرف سے نمائندگی ہونی چاہیے۔

تمام پراجیکٹ انٹرنیٹ پر ایک مرکزی میکنزم کے تحت منسلک ہوں اور بین الاقوامی معیار کے آڈیٹرز سے سہ ماہی پراگرس رپورٹ بمعہ بجٹ لمحہ بہ لمحہ عوام کے لیے (24) چوبیس گھنٹے موجود ہونی چاہیے۔

❀❀❀

مرقع تصاویر

مصنّف کی قومی اور بین الاقوامی
سرگرمیوں پر مشتمل تصویری جھلکیاں

انگریزی زبان کی ضرب المثل ہے کہ:

"A picture is worth a thousand words"

یعنی ایک ــــــ تصویر، ہزار الفاظ کی منظر کشی کرتی ہے۔

لہٰذا مصنف کی قومی، بین الاقوامی معاملات پر مشتمل سرگرمیوں، پاکستان و اسلام کے لیے لابنگ اور عالمی قیام امن کے لیے انتھک کوششوں کی لاکھوں اہم تصاویر میں سے چند تصویروں کو منتخب کر کے ایک جگہ کر دیا گیا ہے،

تاکہ قارئین کو کتاب کی مندرجات اور اس کی اشاعت کے مقاصد سمجھنے میں آسانی ہو۔اس لیے انہیں پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

1- اعلیٰ سطح کی مقتدر شخصیات سے قومی اور بین الاقوامی معاملات پر مبنی ملاقاتیں۔

2- اعلیٰ سطح کی مختلف مذہبی شخصیات کے ساتھ مکالمہ پر مبنی ملاقاتیں۔

3- بین الاقوامی توجہ طلب معاملات پر کانفرنسوں کی صدارت پر مشتمل منظر نامے۔

4- تحقیقی، تعلیمی اور ملی تناظر میں غیر ملکی اسفار۔

5- امریکی افواج عراقیوں کو ''جمہوریت'' اور ''انسانی حقوق'' کا سبق دیتے ہوئے۔

ملکہ برطانیہ کے دستخط ہمیشہ خط کے آغاز میں ہوتے ہیں

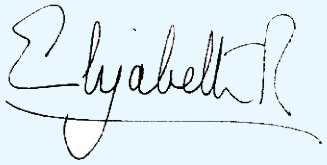

Elizabeth the Second, *by the Grace of God of the United Kingdom of Great Britain and Northern Ireland and of Her other Realms and Territories Queen, Head of the Commonwealth, Defender of the Faith and Sovereign of the Most Excellent Order of the British Empire to Our trusty and well beloved Toaha Bashir Zulgarnain Qureshi Esquire*

Greeting

Whereas *We have thought fit to nominate and appoint you to be an Ordinary Member of the Civil Division of Our said Most Excellent Order of the British Empire*

We do *by these presents grant unto you the Dignity of an Ordinary Member of Our said Order and hereby authorise you to have hold and enjoy the said Dignity and Rank of an Ordinary Member of Our aforesaid Order together with all and singular the privileges thereunto belonging or appertaining.*

Given *at Our Court at Saint James's under Our Sign Manual and the Seal of Our said Order this Thirty-first day of December 2009 in the Fifty-eighth year of Our Reign.*

By the Sovereign's Command.

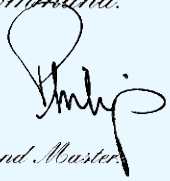

Grand Master

Grant of the Dignity of an Ordinary Member of the Civil Division of the Order of the British Empire to Toaha Bashir Zulgarnain Qureshi, Esq.



ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم سے بکنگھم پیلس میں ایک تقریب کے بعد الوداعی ملاقات کرتے ہوئے۔ 2010ء



مصنّف اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے ساتھ انٹرپرینول کانفرنس 2012ء کے موقع پر



اس وقت کے وزیرِاعظم پاکستان جناب سید یوسف رضا گیلانی کے ساتھ بھارت اور پاکستان کی کشیدہ صورتِ حال کو معمول پر لانے کے لئے گفتگو کرتے ہوئے 2010ء



سابق صدر پاکستان جنرل (ر) پرویز مشرف کے ساتھ پاک بھارت تعلقات پر بات چیت کرتے ہوئے

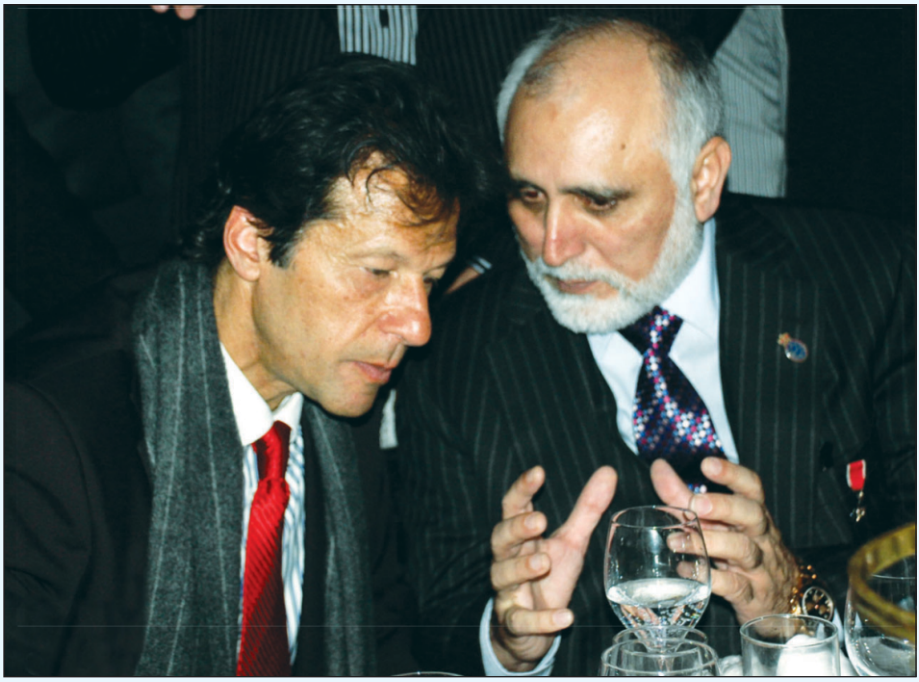

تحریک انصاف پاکستان کے چیئرمین جناب عمران خان کے ساتھ ملک کو درپیش مسائل کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔لندن 2011ء



پاکستان کی قومی اسمبلی کے سپیکر جناب اسد قیصر کے ساتھ برطانوی پارلیمنٹیرینز کی طرف سے پاکستان کی اقلیتوں کے حقوق پر جاری کردہ ایک گمراہ کن رپورٹ پر گفتگو کر رہے ہیں۔



افغانستان اور پاکستان کے تعلّقات کی بہتری کے لئے دورۂ افغانستان کے دوران
جناب عبداللہ عبداللہ CEO افغانستان کے ساتھ الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے۔15 دسمبر 2017ء
ساتھ جناب ایز دعلی پروجیکٹ ڈائریکٹر CRSS کھڑے ہیں



جمعیت علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ مشرق وسطیٰ کی صورتِ حال پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے 2014ء



مصنف، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے ساتھ اپنی پہلی کتاب ''میرا جہاد''، مشرق وسطیٰ میں بدامنی و''قیام امن اور اقوام عالم'' کے کردار پر نئی کتاب لانے سے متعلق تبادلہ خیال کرتے ہوئے۔ 2014ء



محترمہ چندریکا کمارا تونگا (سابق صدر سری لنکا) کے ساتھ سارک اور ایشیا میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کسی متفقہ لائحہ عمل بنانے پر بات چیت کرتے ہوئے۔ کنگز کالج لندن 2012ء

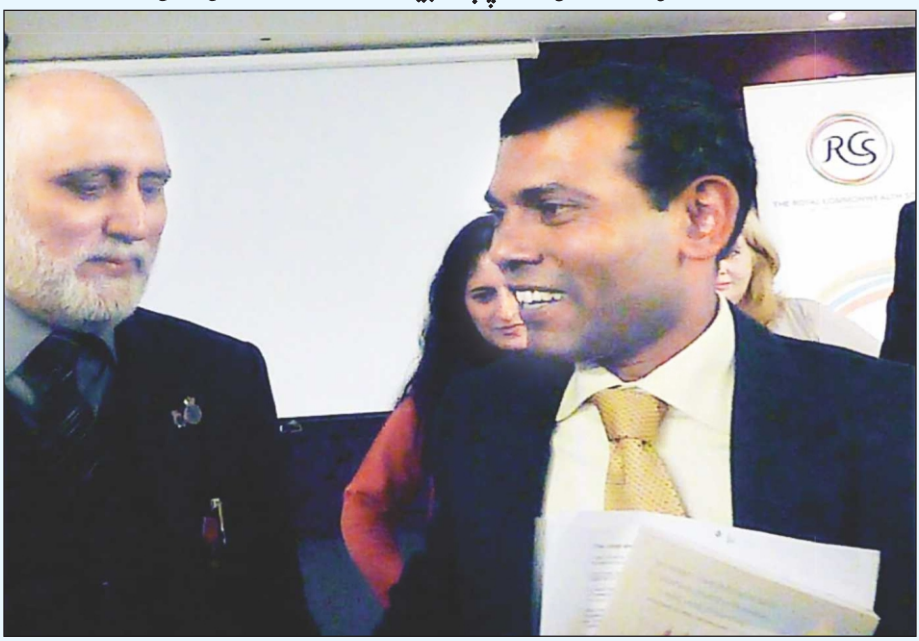

مالدیپ کے صدر محمد نشید کے ساتھ، انتہا پسندی کو ختم کرنے، مالدیپ اور پاکستان کے درمیان تعلقات مضبوط کرنے کے حوالے سے بات چیت کرتے ہوئے۔ لندن 2012ء



موجودہ برطانوی وزیراعظم تھریسامے کے ساتھ ''برطانوی ایشیائی خواتین کو تعلیم کے ذریعے
ملکی ترقی میں اہم کردار'' کے موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے۔لندن 2012ء



مصنف،سوڈان کے سابق صدر فیلڈ مارشل جناب عبدالرحمٰن سوارالذھب کے ساتھ 2012ء



برطانیہ میں تعینات نئے امریکی سفیر مِتھیو بارزن اپنی رہائش گاہ پر مصنف کو خوش آمدید کہتے ہوئے



برطانیہ میں تعینات افغانستان کے سفیر جناب محمد داؤد یار، امریکی سفیر لوئس بی سوزمن اور اُن کی اہلیہ مارجری سوزمن کے ہمراہ۔ ان کی رہائش گاہ پر



موجودہ آرچ بشپ آف کینٹر ابری جناب جسٹن ویل بی کے ساتھ مصنف، پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے۔ لیمبتھ پیلس، 2015ء



مصنّف، امریکہ کے 1984ء اور 1988ء کو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے امریکی صدارتی امیدوار اور ایک معروف و بااثر مسیحی رہنما ریورنڈ جیسی جیکسن کو لندن میں خوش آمدید کہتے ہوئے اور قیامِ امن کے لئے دونوں ابراہیمی مذاہب کو مل کر کام کرنے پر گفتگو کر رہے ہیں۔



چیئرمین سینیٹ محمد صادق سنجرانی سے اُن کے دفتر میں ملاقات، ملک کی خودمختاری کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والی غیر ملکی قوتوں کے تعاقب اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ پر بات چیت۔



مصنف، سید نیر بخاری سینٹ چیئرمین اور ہائی کمشنر پاکستان برائے برطانیہ عمران مرزا۔لندن



خیبر پختونخواہ کے وزراء مصنف کے ساتھ فرڈ سیکرٹریٹ کے تعلیمی شعبوں میں تعاون کے لئے منعقد کی گئی کانفرنس میں



BZUاور فرڈ کے زیرِ اہتمام دسویں عالمی کانفرنس ''انتہا پسندی، تعلیم اور کردار سازی'' کے موقع پر مصنّف، ڈاکٹر ظفر اللہ خان وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر اکرم رانا چیئرمین شعبہ اسلامیات، قیوم یونارابرٹسن (کنوینئر ایل بی ایف این) اور ایلن ویسٹن کے ساتھ۔ پاکستان 2010ء



مصنّف ''آفٹر میتھ آف 9/11 دی عرب سپرنگ'' کے موضوع پر کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے، آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک یہودی پروفیسر ایوی شلیم خطاب کر رہے ہیں۔ ساتھ جناب اینڈریو ہیوڈ، جناب زیڈ یوخان، پروفیسر جاناتھن فرائر اور فلپ لنکارڈ بیٹھے ہیں۔ فرڈ سیکرٹریٹ لندن، ستمبر 2012ء





مصنف، انٹر پرینول کانفرنس 2012 کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے جس سے بل کلنٹن نے بھی خطاب کیا



بائیں سے دائیں: مصنّف، فرڈ کے زیر اہتمام کانفرنس ''انتہا پسندی کے خاتمے میں تعلیم کا کردار'' کے موقع پر کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے۔ میتھیو کولنز کیٹ ہوئی ممبر پارلیمنٹ، خطاب کرتے ہوئے، پروفیسر ڈاکٹر ظفر اللہ وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، جناب شوکت اشفاق ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ پاکستان، ایڈنبرا یونیورسٹی کے بل تھامسن، لندن پروبیشن سروسز کی لزڈکسن اور الرسالہ ٹرسٹ کے مولانا مقصود گنگات۔ لندن 2009ء



مصنّف اپنے دفتر میں، انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کے لئے Rehabilitaion Model کی تفصیلات بتانے کے بعد برطانیہ کے سینئر افسران ولیم نائے، پارل موریسن اور ایف آئی اے پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل افسران طارق پرویز اور طارق کھوسہ۔ لندن 2007ء



مصنف، کیٹ ہوئی ممبر پارلیمنٹ، پروفیسر اکبر ایس احمد برطانیہ کے لئے پاکستان کے ہائی کمشنر کے ساتھ
کانفرنس ''مقامی آبادی کی ترقی میں مساجد کا کردار''۔ لندن 2000ء



مصنف: ''تہذیبوں کے درمیان مکالمہ'' کے موضوع پر کانفرنس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے، جبکہ سٹیج پر ڈاکٹر انڈریو فرانسز (بشپ ملتان)، قائدِ حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن، وفاقی وزیر اعجاز الحق، سید فخر امام، سابق وزیر خارجہ پاکستان شاہ محمود قریشی اور کمانڈر میٹرو پولیٹن پولیس لندن بھی موجود ہیں۔ ملتان پاکستان 2006ء



کانفرنس ''دہشت گردی کے خاتمے میں مذاہب کا کردار'' کے موقع پر مصنف صدارتی خطاب کرتے ہوئے جبکہ سٹیج پر کونسل لیڈر ٹام فرینکلن اور بیرسٹر تھامسن (تاریخ دان) ریورینڈ جیفری ول کوکس اور کیٹ ہوئی ممبر پارلیمنٹ اور نومسلم جرنلسٹ ایوان رِڈلی جن کو طالبان نے گرفتار کیا تھا موجود ہیں۔لندن جنوری 2002ء



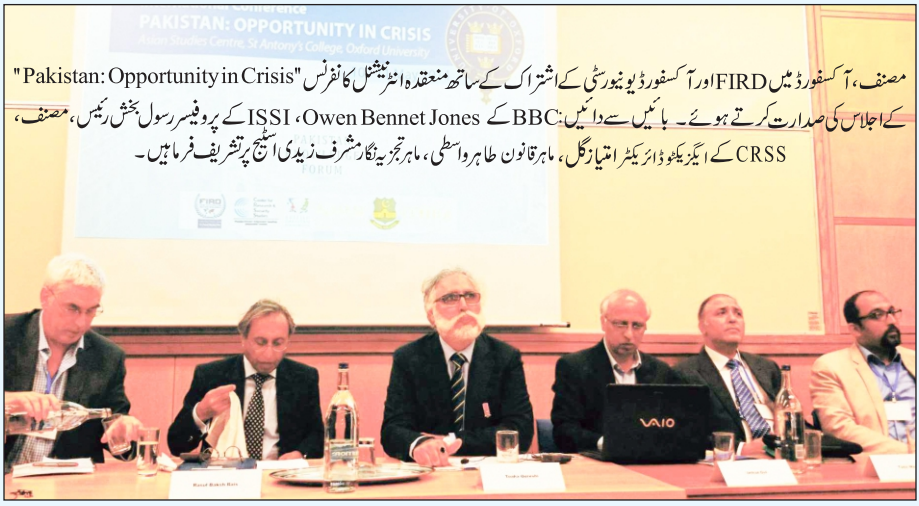

مصنف، آکسفورڈ میں FIRD اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اشتراک کے ساتھ منعقدہ انٹرنیشنل کانفرنس "Pakistan: Opportunity in Crisis" کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے۔ بائیں سے دائیں: BBC کے Owen Bennet Jones، ISSI کے پروفیسر رسول بخش رئیس، مصنف، CRSS کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر امتیاز گل، ماہر قانون طاہر واسطی، ماہر تجزیہ نگار مشرف زیدی اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔



انٹرنیشنل کانفرنس برائے لیگل ایجوکیشن کراچی میں مصنف صدارتی خطبہ دیتے ہوئے۔ دسمبر 2015ء



افغانستان کی نیشنل اسمبلی کے سپیکر جناب عبدالرؤف ابراہیمی کے ساتھ افغانستان اور پاکستان کے بہتر تعلّقات کے لئے Beyond Boundaries III Track 1.5/II ڈائیلاگ میں شرکت مصنّف کے بائیں طرف سابقہ آئی جی جناب شعیب سڈل، جناب رانا افضل خان ایم این اے اور محترمہ شازیہ مری ایم این اے



مصنف عالمی کانفرنس ''فیوچر آف پاکستان'' کے موقع پر صدارتی خطاب کرتے ہوئے سٹیج پر موجود دائیں سے بائیں، بشپ الیگزینڈر جان ملک، (لاہور) جنرل سید اطہر علی، (سابق سیکرٹری دفاع پاکستان) لارڈ قربان حسین، ڈاکٹر فاروق ستار (وزیر برائے سمندر پار پاکستانی) اور پروفیسر اسٹیفن کوہن (بروکنگز انسٹیٹیوٹ) پارلیمنٹ ہاؤس میں۔لندن 2012ء



فرڈ سیکرٹریٹ میں ''فیوچر آف پاکستان کانفرنس'' کے موقع پر مصنف کے بیٹے سعد محمود شرکاء اور مہمان مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، جبکہ سٹیج پر (دائیں سے بائیں) پروفیسر رابن بروک سمتھ، جنرل سید اطہر علی، پروفیسر سٹیفن کوہن، پروفیسر اینا ٹول لیون، ڈاکٹر فاروق ستار اور سینیٹر وقار خان موجود ہیں۔لندن 2012ء



مصنف، ''نیشنل لیگ ایجوکیشن کانفرنس'' جوڈیشل اکیڈمی ذوالفقار علی بھٹو یونیورسٹی آف لاء کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں انتہا پسندی، برطانیہ پاکستان قانونی موازنہ، اعلیٰ تعلیمی معیار کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے سٹیج پر شاہ رکھوڑو (وزیر تعلیم، سندھ) سابقہ چیئرمین الیکشن کمیشن جسٹس حامد خان اور دیگر بھی موجود ہیں۔ 2013ء



CRSS کی جانب سے قانون کی حکمرانی اور انسدادِ دہشت گردی کے موضوع پر سیمینار 21 اپریل 2014۔ اسلام آباد



مصنف پشاور میں مختلف مدارس کے طلباء اور اساتذہ سے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے سے متعلق خطاب کرتے ہوئے



ختم نبوت مرکز لندن میں 7 جولائی 2005ء کے لندن خودکش دھماکوں کے بعد تمام سیاسی پارٹیوں کے پارلیمنٹیرین، پولیس اور مختلف مذاہب کے سرکردہ افراد کی ''سولیڈیریٹی کانفرنس'' کی صدارت کرتے ہوئے



ختم نبوت مرکز لندن میں بین المذاہب ہم آہنگی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے



مصنف کے ساتھ سینئر بشپ آف چرچ آف پاکستان اقلیتوں کے تحفظِ حقوق کے بارے میں مذاکرات کرنے کے بعد گروپ فوٹو۔ دائیں سے بائیں: عمر محمود قریشی، بشپ جان سموئیل فیصل آباد، بشپ حمفری پیٹرز پشاور، بشپ عرفان جمیل لاہور، مصنف طٰہٰ قریشی، بشپ سموئیل آزر تیارائے ونڈ، چرچ آف پاکستان کے سربراہ، ریورنڈ رانا خان، بشپ صادق دانیال کراچی، بشپ ارمل شہ سابق بشپ پشاور۔ (آکسفورڈ 2014ء)



یونیورسٹی آف لاہور، معاشرے میں تعلیم کے فروغ اور انتہاپسندی کے خاتمے پر سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے



سیمینار ''پاکستان کی قانون سازی میں خواتین کا کردار'' کے موقع پر ڈاکٹر زیڈ۔ یو خان، ڈاکٹر نفیسہ شاہ، (ایم این اے، چیئرپرسن این ایچ سی ڈی)
کیٹرینا رابرٹسن (کنوینیر ایل بی ایف این) اور آسیہ نثار (ایم این اے بلوچستان) کے ساتھ۔ فرڈ سیکرٹریٹ لندن 8 مئی 2012ء



اقلیتوں کے تحفظ کی آگاہی کے لئے مصنف کے ساتھ ایک وفد پاکستان کے دورے پر (دائیں سے بائیں)
مسٹر گل، مسز کیٹر یونا رابرٹسن، مصنف، بشپ لاہور عرفان جمیل، ریورنڈ رانا خان سابقہ بشپ لاہور، ایلیگزانڈر جان ملک اور عمر قریشی



پرل کانٹی نینٹل لاہور میں Interfaith Peace Seminar کے موقع پر مصنف کی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی،
مولانا عبدالخبیر آزاد نے صدارت کی اور اس میں تمام مذاہب اور مسالک کے اکابرین نے شرکت کی۔(2023)





عالمی تنظیم ''پیس ون ڈے'' کی شراکت سے اقوام متحدہ کے ''انٹرنیشنل ڈے آف پیس'' کے موقع پر Google کے لئے اسلام میں امن کا پیغام دیتے ہوئے، جبکہ جرمی گیلے (پیس ون ڈے) اور کیٹ ایڈم (وار چائلڈ) بھی موجود ہیں۔



راولپنڈی کے ایک چرچ میں ڈاکٹر وائن بوک، ایلین ویسٹن، اے آر ٹینکو اور ریورنڈ محبوب کے ساتھ امن کی بحالی کے لئے پودا لگا رہے ہیں



14 اگست 2016ء کو یوم آزادی کے موقع پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر طاہر امین، شوکت اشفاق ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ پاکستان، پروفیسر ڈاکٹر اشرف خان اور سینئر پروفیسرز صاحبان کے ہمراہ



سیمینار: ''بین المذاہب ہم آہنگی'' کے موقع پر مصنف، وفاق المدارس عربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ قاری محمد حنیف جالندھری، پاکستان رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمن کے ساتھ جہاں شیعہ، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے وفاقوں کے قائدین بھی موجود ہیں۔ لاہور۔ پاکستان



شیخ زاید اسلامک سنٹر، یونیورسٹی آف پنجاب میں ''مذہبی ہم آہنگی اور آئین پاکستان'' کے موضوع پر علمی مذاکرہ۔ڈائریکٹر جنرل اوقاف ڈاکٹر طاہر رضا بخاری، ڈاکٹر کلیان سنگھ، پاسٹر امجد نیامت، پروفیسر ڈاکٹر ٹونی ولیم اور ڈاکٹر محمد عبداللہ کی شرکت۔(2023)



مصنف، کشمیر کانفرنس لندن میں شریک۔اس کے ساتھ دائیں سے بائیں سر جیر الڈکاف مین ممبر پارلیمنٹ، سید ابن عباس ہائی کمشنر پاکستان، مشتاق لاشاری چیئرمین تھرڈ ورلڈ سولیڈیریٹری، ڈاکٹر وکٹوریہ سکوفیلڈ، لارڈ نذیر احمد اور لارڈ قربان حسین پارلیمنٹ کے اندر۔لندن 2015ء



نیشنل کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹر (NCOC) کے دورے کے بعد مصنف اپنی کتاب ''قیام امن اور اقوام عالم''
میجر جنرل آصف گورایہ کو پیش کرتے ہوئے اور بریگیڈئر شاہد محمود ہمراہ کھڑے ہیں



ڈپٹی ہائی کمشنر برائے پاکستان ڈاکٹر فیصل عزیز احمد کے ساتھ عالمی جنگوں میں اتحادی افواج کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے تعاون پر روشنی ڈالنے کے بعد ایک یادگار پر پھول چڑھاتے ہوئے۔



مصنف، برطانوی چیف آف ڈیفنس سٹاف سر جنرل ڈیوڈ رچرڈز کے ساتھ پاکستان کے معاشی اور سیاسی استحکام کے بارے میں اُن کی سرکاری رہائش گاہ کینز ٹنگٹن پیلس میں گفتگو کرتے ہوئے، صوفہ پر CRSS کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر امتیاز گل، لیڈی کیرولائن رچرڈز اور لندن میں پاکستان کے ایکٹنگ ہائی کمشنر عمران مرزا



دائیں سے بائیں: مصنف کے صاحبزادے عمر محمود قریشی، معروف بزنس مین جناب حسن بخاری، برطانوی چیف آف ڈیفنس سٹاف
سر جنرل ڈیوڈ رچرڈز، مصنف، اے آر وائی کے سربراہ سلمان اور پاکستانی ہائی کمشنر عمران مرزا



NUST ٹرسٹ فاؤنڈیشن UK کے ٹرسٹی کے طور پر تقرری کے بعد 2020 میں NUST کے دورے کے درمیان ریکٹر لیفٹیننٹ جنرل نوید زمان مصنف کو NUST کی یادگار پیش کر رہے ہیں۔



نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پاکستان کے ریکٹر لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ جاوید بخاری سے اسلام آباد کیمپس میں NUST ٹرسٹ فاؤنڈیشن UK کی سرگرمیوں اور پسماندہ طلبا کی مدد کے بارے میں بات کرنے کے لیے بات چیت کرتے ہوئے



لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ جاوید بخاری، ڈاکٹر رضوان ریاض اور ٹرسٹیز ماریہ قادری، اسرار احمد، عون علی سید کے ساتھ ساتھ عمر محمود اور کرنل عمران ملک کے ساتھ لندن میں (FIRD) کے دفاتر میں نسٹ ٹرسٹ فاؤنڈیشن یو کے کا آغاز۔



نسٹ، اسلام آباد میں نسٹ کے ریکٹر لیفٹیننٹ جنرل جاوید بخاری سے میری ملاقات کے بعد ان کی ٹیم کے ساتھ ایک تصویر۔

(بائیں سے دائیں): ذیشان، ماریہ قادری، پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق گوندل، لیفٹیننٹ جنرل جاوید بخاری، کرنل عمران ملک اور مہتاب احمد۔



طٰہٰ قریشی ایم بی ای، صدر پاکستان جناب عارف علوی کو اپنی تصنیف My Journey From Chak 444 to Buckingham palace پیش کرتے ہوئے



لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید محمود بخاری، جناب طٰہٰ قریشی ایم بی ای اور صدر پاکستان جناب ڈاکٹر عارف علوی
کے ساتھ قصرِ صدارت میں ملاقات کرتے ہوئے۔20 دسمبر 2022ء



مصنف اور مولانا محمد حنیف جالندھری نے وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ وہ پاکستانی سفارت خانوں کو مضبوط بنائیں
تاکہ ملک کے خلاف کام کرنے والی قوتوں کے جھوٹے بیانیے کا تدارک کیا جاسکے۔



اقلیتوں کے حقوق اور بین المذاہب ہم آہنگی پر گفتگو کے بعد وزیر مذہبی امور اور بین المذاہب ہم آہنگی
پیر ڈاکٹر نور الحق قادری کو اپنی کتابیں ''قیامِ امن اقوامِ عالم'' پیش کرتے ہوئے۔



نسٹ کیمپس اسلام آباد میں نسٹ ٹرسٹ فاؤنڈیشن یو کے کی نسٹ کے پرورریکٹر میجر جنرل جہانگیر خان کے ساتھ



لندن میں NUST ٹرسٹ فاؤنڈیشن UK کے فنڈ ریزرایونٹ کا اہتمام کیا جس میں اہم مہمان شامل تھے: لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ جاوید بخاری، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر رضوان ریاض، لندن میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر ڈاکٹر فیصل عزیز احمد، کموڈور ذیشان نبی ڈیفنس اتاشی، جوزف ایم بینگ چیئر آف الشہادہ، ہاؤسنگ ایسوسی ایشن لندن، توصیف احمد میئر آف لیوشم، شاہد عظیم، عرفان محمد



Beyond Boundaries III Track 1.5/II کے پراجیکٹ کی پاکستان۔افغانستان جوائنٹ کمیٹی (PAJC) کے اجلاس کی کابل میں صدارت کرتے ہوئے (15 دسمبر 2017ء) جس میں دونوں اطراف سے پارلیمنٹ کے اراکین نے شرکت کی۔



مصنف افغانستان کے CEO جناب عبداللہ عبداللہ کو احمد کا ملتانی سوہن حلوہ پیش کرتے ہوئے ساتھ جناب رانا افضل خان وزیر مملکت برائے خزانہ اور جناب شعیب سڈل سابقہ آئی جی



برطانوی آرمی کے چیف آف سٹاف جنرل سر والز مصنف کو افغانستان میں تعلیم کے فروغ کے لئے
پروگرام ''ایک دوستانہ کرکٹ میچ'' میں مہمان خصوصی کے طور پر خوش آمدید کہتے ہوئے



مصنف کی سربراہی میں ''فیوچر آف پاکستان'' کے عنوان سے کانفرنس میں آرچ بشپ آف کینٹر ابری جناب ڈاکٹر راون ولیم کے ساتھ۔ شرکاء دائیں سے بائیں: سعد محمود قریشی، ریونیڈ رخان، پروفیسر سٹیفن کوہن، کینونر رابٹس، ڈاکٹر راون ولیم، مصنف اور مولانا مفتی محمد اسلم امیر جمعیت علما برطانیہ، ڈاکٹر زیڈ یوخان
ریورنڈ ٹیمی، مولانا عبدالشکور لیمبتھ پیلس۔2012ء



لیبر پارٹی کے ڈپٹی لیڈر ٹام واٹسن ممبر پارلیمنٹ اور روزینہ خان ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ
برطانیہ میں دائیں بازو کی تنظیموں کی بڑھتی ہوئی مسلمانوں کے خلاف نفرت کے موضوع پر تبادلہ خیال

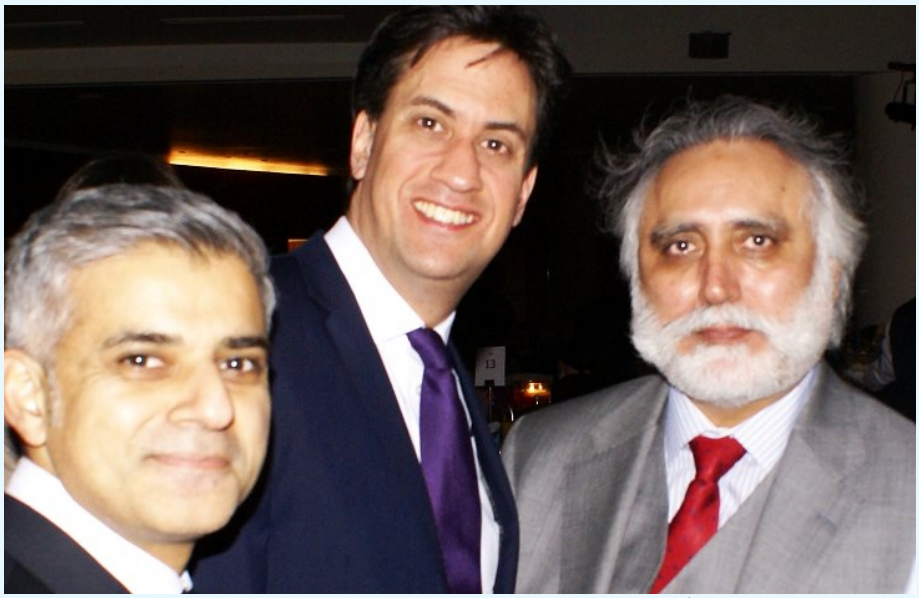

مصنف، لیبر پارٹی کے سربراہ ایڈملی بینڈ اور شیڈو وزیر انصاف اور موجودہ میئر آف لندن صادق خان کے ہمراہ

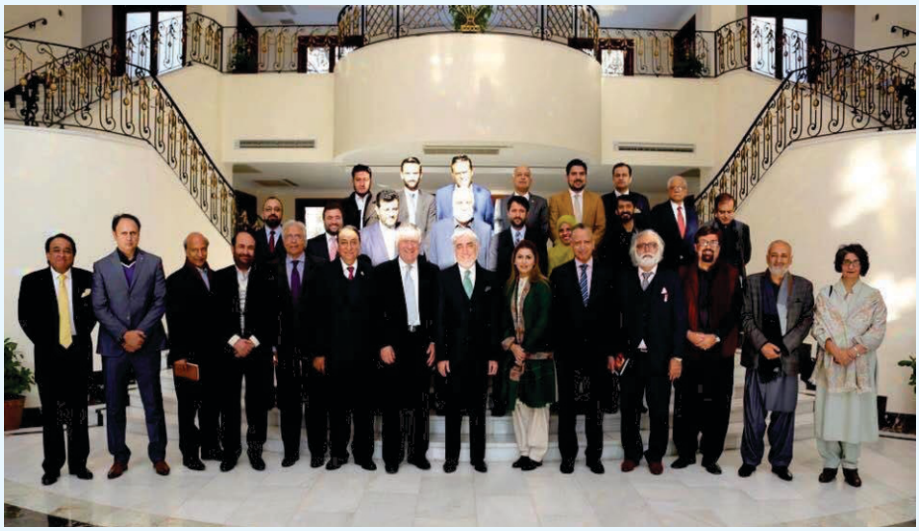

مصنّف کا افغانستان کے CEO جناب عبداللہ عبداللہ اور Beyond Boundaries III Track 1.5/II
پراجیکٹ کی ''پاکستان۔افغانستان جوائنٹ کمیٹی'' (PAJC) کے اراکین کے ساتھ گروپ فوٹو۔



نسٹ، اسلام آباد میں نسٹ کے ریکٹر لیفٹیننٹ جنرل جاوید بخاری سے میری ملاقات کے بعد ان کی ٹیم کے ساتھ ایک تصویر۔
(بائیں سے دائیں): ذیشان، ماریہ قادری، پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق گوندل، لیفٹیننٹ جنرل جاوید بخاری، کرنل عمران ملک اور مہتاب احمد۔



شیخ الحدیث وروحانی رہنما حضرت مولانا قاری محمد حنیف صاحب اور مصنف اپنے دفتر میں امریکی سفارت کاروں
کے ساتھ بین الاقوامی صورتِ حال کو ڈائیلاگ سے حل کرنے کیلئے ایک سیمینار میں شریک ہیں



پاکستان میں تعینات برطانوی ہائی کمشنر ایڈم تھامسن کے ساتھ جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کے سلسلے میں بات چیت کرتے ہوئے۔لیمبتھ پیلس،لندن 2013ء





اسرائیل میں "**حیفا**" کی سیاسی اور بزنس کمیونٹی کے ساتھ ایک میٹنگ سے فراغت کے بعد





غیر مسلموں کے ساتھ تعلّقات کو بہتر بنانے کے لئے مصنّف برطانیہ کے سرکاری سکولوں میں طلباو طالبات اور اساتذہ کو اسلام سے متعلّق آگاہ کرتے ہوئے



اسلام آباد میں ہمارے دوست حسن بخاری صاحب کے ہاں افغانستان میں اُن یتیم بچوں کے ساتھ جن کے والدین شہید ہو چکے ہیں



ہفتہ پارلیمنٹ اور ہفتہ بین المذاہب کے تحت Engaging Faith Communities with British Democracy کے موضوع پر پارلیمنٹ کے اندر ایک اجلاس کے موقع پر شرکا کے ساتھ لی گئی گروپ فوٹو



آرمی پبلک سکول پشاور میں 150 معصوم بچوں کو دہشت گردی کا نشانہ بننے پر علماء، ماہرین تعلیم، سیاست دان اور صحافیوں نے انتہا پسندی کے خاتمے اور پاکستان میں امن قائم کرنے کے لئے سیمینار منعقد کیا جس کی مصنف صدارت کر رہے ہیں۔



دائیں سے بائیں: ورلڈ مسلم فورم کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری، جمعیت علماء اسلام برطانیہ، لندن کے امیر مفتی خالد محمود، لارڈ جان ایلڈرڈائس مصنّف، مسٹر ٹم فیرن ممبر پارلیمنٹ، مسٹر ایڈورڈ ٹلر ایس ممبر پارلیمنٹ، ریشم کوتیکما ڈائریکٹر فرڈ عمر محمود قریشی، کونسلر ڈونالٹس۔



یو کے پی سی سی آئی کی طرف سے اسرائیل کے دورے پر مصنف
فلسطینی سکارف پہنے ہوئے بیت المقدس میں دو اسرائیلی فوجیوں کے ہمراہ



اسرائیل میں مسلم اور یہودی وفد کے ہمراہ دریائے اُردن کا نظارہ کرتے ہوئے۔ دریا کے اسرائیلی کنارے پر کھڑے ہو کر
سامنے دوسرے کنارے کو دیکھ رہے ہیں جہاں سے مسلم ملک اُردن شروع ہوتا ہے۔ جو صاف نظر آ رہا ہے۔





انٹرنیشنل کمیونٹی اینگیجمنٹ پروگرام شمالی آئرلینڈ کے موقع پر: عیسائیت کے دوفرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان اختلافات کے زمینی حقائق اور ان کے حل اور آئرش ری پبلک آرمی نامی شدت پسند تنظیم جسے برطانیہ نے دہشت گرد تنظیم قرار دیا ہوا ہے، کے انتہا پسندی میں ملوث کارکنوں کی ازسرِ نو کردار سازی پر بات چیت کے لئے شمالی آئرلینڈ کے مطالعاتی دورے پر۔ آئرلینڈ 2012ء



لندن اسمبلی میں ''نفرت پر مبنی جرائم'' سے متعلق کانفرنس میں انتہا پسندی اور
دہشت گردی کی وجوہات میں نفرت کے کردار پر بات چیت کرتے ہوئے



مصنف، ڈیپارٹمنٹ فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کی وزیر جسٹن گرینگ کو سکاٹش (سکارف)
پہناتے ہوئے ہمراہ عرفان جمیل بشپ آف لاہور، کیٹرونا رابرٹسن اور عمر قریشی



CRSS کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر امتیاز گل، لیفٹیننٹ جنرل (ر) سید محمد امجد ڈی جی احتساب بیورو، طارق فاطمی
سینئر بیوروکریٹ، الف اعلان کے ڈائریکٹر مشرف زیدی، گل بینا بلال اور دیگر سفارتکاروں کے ہمراہ، اسلام آباد



CRSS اور فورمین کرسچین کالج لاہور کے تعاون سے ''ریاست، مذہب اور جمہوریت'' کے متعلق سیمینار
پروفیسر سعید شفقت، مصنف، انڈونیشیا سے ڈاکٹر جولی اور ڈاکٹر احمد بھی موجود ہیں



بیت المقدس میں اینگلیکن آرچ بشپ آف یروشلم جناب سہیل دوانی (جو کہ فلسطین، اسرائیل، اردن، شام اور لبنان کے عیسائیوں کے سربراہ ہیں)، بشپ آف اینگلیکن ڈاکٹر رچرڈ چیتھم، عمر قریشی اور کرسچین مسلم فورم کے شیخ ابراہیم موگر امصنّف کے ساتھ



مصنف، مسجد اقصیٰ میں امام حضرت شیخ ولید سیام کے ساتھ



اسرائیل میں یہودیوں کی مرکزی عبادت گاہ ''دیوارِ گریہ'' کے ساتھ یہودی ربائی کے ساتھ دلچسپ مکالمہ کرنے کے بعد



شامی مہاجرین کے معذور بچوں اور ان کے والدین کے ساتھ، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور ندیم خان صاحب کے ہمراہ 2017



ترکی میں شامی مہاجرین کے لئے روٹیاں پکانے والی مشین پر آٹا گوندھتے ہوئے



شامی مہاجرین کے ایک خاندان کے ساتھ





طٰہٰ قریشی کی چیئرمین ہائر ایجوکیشن کمیشن ڈاکٹر مختار احمد کے ساتھ ملاقات اس موقع پر
مولانا محمد حنیف جالندھری، محمد رفیق طاہر اور ڈاکٹر اشتیاق گوندل بھی موجود۔(2023)



مصنف، مہمان خصوصی کی حیثیت سے کرناٹکہ کے وزیر داخلہ شری شیکھر اور ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ

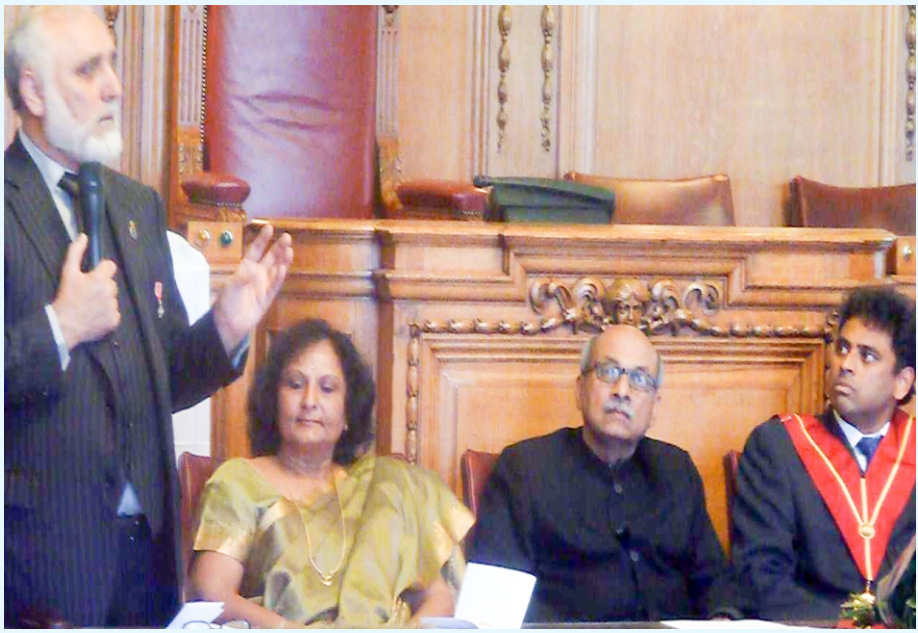

لیمتھ ٹاؤن ہال لندن میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ''ممکنہ پچاس سالہ امن معاہدہ'' کے بارے میں تفصیلات سے گفتگو کرتے ہوئے جبکہ ڈاکٹر شری پربھارکر، چانسلر کے ایل ای یونیورسٹی بھارت اور میئر ڈاکٹر نیراج پٹیل بھی موجود ہیں۔لندن 2011ء



امریکہ کے بے گھر افراد کی منہ بولتی تصاویر





برطانیہ کے بے گھر افراد کی منہ بولتی تصاویر



برطانیہ میں غریب اور بے روزگار لوگ چیرٹی کی طرف سے بنائے گئے فوڈ بنک سے کھانا لینے کے لئے سڑک پر کھڑے ہیں



عراق پر قبضہ کے بعد ابوغریب جیل کے اندر امریکی فوجی عراقیوں کو ''انسانی حقوق اور جمہوریت'' کا سبق دے رہے ہیں





عراق پر قبضے کے خلاف برطانوی عوام لاکھوں کی تعداد میں باہر نکل کر احتجاج کرتے ہوئے برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کو جھوٹا اور خونی قرار دیتے ہوئے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے گرفتار کر کے جیل بھیجا جائے۔



ایک بے بس فلسطینی جمال الدرّۃ اپنے بچے کی جان بچانے کے لئے اسرائیلی فوجیوں کو واسطے دے رہا ہے



اور پھر اُس بچے محمد بن جمال الدرّۃ کو اسرائیلی فوجیوں نے گولی مار کر شہید کر دیا اور جمال الدرّۃ بیچارہ نفسیاتی مریض بن گیا 20 مئی 2013ء



افغانستان پر قبضہ کے بعد مسلمان قیدیوں کے ساتھ گوانتاناموبے جیل میں امریکی فوجیوں کا غیر انسانی سلوک

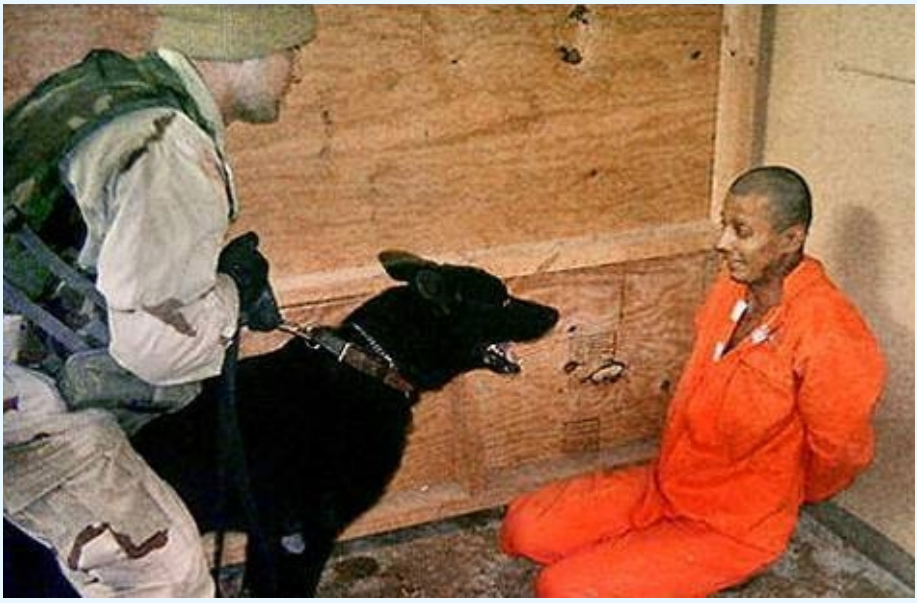

عراق پر قبضہ کے بعد ابوغریب جیل کے اندر امریکی فوجی عراقیوں کو ''انسانی حقوق اور جمہوریت'' کا سبق دے رہے ہیں

پانچواں باب:

جدید ترکی: اَردگانی فراست کا مظہر

2 نومبر 2017ء کے پہلے ہفتے ترکی کے استنبول ایئرپورٹ پر اترتے ہی زندگی میں یہ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ پاکستانی قوم سے بھی کوئی غیر ملکی من حیث القوم محبت کرنے والا موجود ہے۔ایئرپورٹ کی چاق و چوبند امیگریشن ٹیم انتہائی محبت اور احترام کے ساتھ آنے والوں کا استقبال کرتی نظر آئی۔ میں کیونکہ بغیر کسی ویزے کے ترکی پہنچا تھا لہٰذا ویزا کی درخواست دینے کے لئے کاؤنٹر پر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ 20 ڈالر جمع کرائیں اور اُسی وقت بغیر کسی درخواست کے ویزا حاصل کریں۔ میرے خیال میں یہ پراسس 3 منٹ میں مکمل ہوگیا اور میرے کارواں محترمی و مکرمی مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب زید مجدھم سے جا ملا جو کہ میرا امیگریشن ڈیسک کے ساتھ ہی انتظار کر رہے تھے۔اس سفر میں حضرت قاری صاحب کے فرزند ارجمند مولانا احمد حنیف بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انتہائی دلچسپ نوجوان ہیں اور اُمت کے درد کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اس اچانک سفر کا انتظام حضرت قاری صاحب اور جناب ندیم خان صاحب نے کیا تھا۔ ندیم خان صاحب خبیب فاؤنڈیشن پاکستان کے چیئرمین ہیں، انتہائی وضع دار اور زیرک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اُمت کا درد رکھتے ہیں۔ہم ابھی ایئرپورٹ پر ہی تھے تو جناب ندیم صاحب کا فون آیا کہ اُن کے نمائندے جناب سید عاطف گردیزی صاحب ائرپورٹ پر موجود ہیں اور وہ ہمیں لے کر اندرون ملک پرواز کرنے والے ائیر پورٹ پر لے کر پہنچیں گے جہاں پر ندیم خان صاحب ہمارے ساتھ مل کر ترکی کے شہر ''غازی انتب'' کا فضائی سفر کریں گے۔ راستے میں میری نشست جناب ندیم صاحب کے ساتھ ہی تھی۔لہٰذا کافی سیر حاصل معلوماتی گفتگو ہوئی۔اس سفر میں ہمارے ساتھ ایک انتہائی جاذب شخصیت کے مالک جناب مفتی شاہ منصور صاحب زید مجدھم بھی تھے۔

سفر کے اہم ترین مقاصد:

یہ سفر سیر و تفریح کی غرض سے قطعاً نہیں تھا بلکہ ترکی اور پاکستان کے موجودہ حالات میں پوزیشن اور شامی مہاجرین کے مسئلے کو سامنے رکھ کر دونوں ممالک کو مزید قریب لانے کی غرض سے ایک مستقل لائحہ عمل بنانے کے لئے مختلف اداروں اور افراد سے ڈائیلاگ کرنا تھا۔لہٰذا اس سفر کے اہم ترین مقاصد میں چند حسب ذیل ہیں۔

☆.....ترکی پر شام کے مہاجرین کا بہت زیادہ بوجھ بڑھ گیا ہے۔لہٰذا افغان مہاجرین کی دیکھ بھال سے پاکستان نے جو سبق سیکھا ہے اُس کو ترکی کے اربابِ اقتدار و اختیار کے ساتھ زیر بحث لا کر آئندہ آنے والے حادثات سے بچنے کی تدبیر کی جائے۔

☆.....مہاجرین کے ساتھ کام کرنے والی تنظیموں بالخصوص IHH سے ملاقات کر کے صورتِ حال کی سنگینی کا جائزہ لیا جائے۔اور پاکستانی عوام کی توجہ اِس طرف مبذول کروانے کے لئے لائحہ عمل بنایا جائے۔

☆.....شام کے مہاجرین سے ملاقات کر کے اُن کی زبانی ضروریات کو سمجھا جائے اور ایک مربوط نظام کے تحت وسائل کو

جوڑا جائے۔

☆.....عوام سے عوام کے میل ملاپ کے ذریعے معاشرے کی بہتری کے لئے کام کرتے ہوئے دونوں ممالک کی عوام کو مزید نزدیک لایا جائے۔

☆.....تعلیمی اداروں کو آپس میں ایک نظام کے تحت منسلک کیا جائے چاہے وہ اور مختلف تعلیمی اور تربیتی پروگرام ترتیب دیئے جائیں (دینی، دنیاوی یا ٹیکنیکل تعلیم کے ہوں۔)

☆.....دونوں ملکوں میں فکری نشستوں کا اہتمام اور ریسرچ کے معیاری مراکز بنائے جائیں۔

☆.....اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے حکومت سے حکومت تک کے تعلقات کو مزید بہتر بنایا جائے۔

☆.....تجارت سے متعلقہ کاروباری حضرات کو دونوں ممالک کے وفود کا تبادلہ کروانے کے لئے اپنے اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لایا جائے۔

☆.....بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے اہتمام کے لئے کوئی منصوبہ بنایا جائے۔

☆.....برطانیہ، ترکی اور پاکستان سے ایسے اداروں کا ایک ورکنگ گروپ بنایا جائے جو کہ سوشل، تعلیمی، دینی اور سیاسی میدانوں میں قلیل المدتی، وسط المدتی اور طویل المدتی پروگرام ترتیب دے۔ حضرت قاری صاحب زید مجدہم کو اللہ نے ہمت، جذبہ، امت کا درد اور فراست سے نوازا ہے۔ پاکستان میں بھی جامعہ خیر المدارس کے مہتمم ہونے کے علاوہ کئی تعلیمی اداروں کی ذمہ داری انہی کے سپرد ہے۔ پھر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نظامت کا کام بھی انھی کے ذمہ ہے اس پر طرہ یہ کہ ملکِ عزیز جس پریشان کن اور افراتفری کی صورتِ حال سے گذر رہا ہے وہاں اہل سنت کی نمائندگی اور دیگر مسالک کے باہم ڈائیلاگ کا کام بھی قاری صاحب ہی کے حصے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے عوام کی ترجمانی اور امت کی راہنمائی بھی موصوف انتہائی احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں اللہ مزید ہمت دے۔

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُسکو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

ان کی معیت میں یہ پانچ روزہ سفر نہ صرف تاریخی لحاظ سے انتہائی معلوماتی بنا بلکہ ترکی کی روایات، ثقافت اور مذہبی رواداری کو سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ یقینی طور پر شام کے مہاجرین کی مشکلات کو دیکھ کر ربِ ذوالجلال کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستانی قوم کو ان مشکلات سے دوچار نہیں کیا۔

ترکی۔ مشرق اور مغرب کا ایک انتہائی حسین امتزاج:

ترکی مشرقی یورپ اور مغربی ایشیاء کے ملاپ کے ساتھ قدیم یونانی، فارسی، رومی، بازنطینی اور سلطنت عثمانیہ کی ثقافت کو بھی جوڑے ہوئے ہے۔ اگرچہ استنبول تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے لیکن ترکی کا دارالخلافہ انقرہ ہے۔

ترکی کا بارڈر شام، ایران، عراق، یونان، آذر بائیجان، جارجیا، بلغاریہ اور آرمینیا کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کا رقبہ (783562) سات لاکھ تراسی ہزار پانچ سو باسٹھ مربع کلومیٹر ہے یعنی جرمنی سے ڈبل ہے اور فرانس سے زیادہ ہے جبکہ پاکستان کے تقریباً برابر ہے۔

ترکی کی آبادی تقریباً 8 کروڑ یعنی 80 ملین کے قریب ہے جبکہ پاکستان کی آبادی تقریباً 21 کروڑ کے قریب ہے (یعنی تقریباً 210 ملین ہے)۔

استنبول کی تاریخی حیثیت:

اب ہمارا قیام استنبول میں تھا۔ استنبول کی ایک اپنی تاریخی حیثیت ہے۔ اس کا پرانا نام قسطنطنیہ (Constantinople) ہے اور حضور ﷺ کی ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق اس شہر کو فتح کرنے والے کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ 1453ء میں ترک شہر ''برصہ'' کے ایک 21 سالہ نوجوان سلطان محمد فاتح نے اس شہر کو اُس وقت فتح کیا جس وقت سپر طاقتیں روس اور امریکہ نہیں بلکہ روم اور فارس ہوا کرتی تھیں۔ سلطان محمد کے ایک معتبر جرنیل آغا حسن نے ترکی کا جھنڈا رومن سلطنت کے ایک مضبوط ترین قلعے پر لہرایا۔ جس کو آج قلعہ سلطان محمد فاتح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اس قلعہ کا محاصرہ کرنے کے لئے بڑی حکمت اور دانائی سے کام لیا گیا کہ اونچے نیچے پہاڑوں پر پھٹے بچھائے گئے پھر ان پر چربی لگا کر چکنائی پیدا کی گئی تاکہ کشتیاں ان پھٹوں پر سے پھسلا کر سمندر میں اتاری جاسکیں۔ تب جا کر کہیں سلطان کو قلعے کے آس پاس فوجیں پہنچانے کا موقع ملا۔ یہاں میزبانِ رسولؐ سیدنا ابوایوب انصاریؓ کا مزار مبارک موجود ہے جس کی ہمیں زیارت نصیب ہوئی۔

استنبول 1453ء سے 1922ء کے سقوط تک خلافت عثمانیہ کا دارالخلافہ رہا۔ یہ ساتویں صدی قبل المسیح میں یونانیوں کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد 196 قبل المسیح میں رومیوں کے قبضے میں چلا گیا اور 330ء تک یہ بائزن ٹائم (Byzantium) کہلاتا رہا۔ مغربی دنیا کا یہ بہت بڑا شہر قسطنطنیہ بھی کہلایا اور بازنطینی سلطنت (مشرقی روم کی سلطنت) کا دارالخلافہ رہا۔

استنبول کا ایک پینو راما منظر:

تاریخی جزیرہ نما استنبول کا پینو راما منظر دیکھیں تو باسفورس کے جنوبی داخلے سے مغرب کی طرف بحر مرمرہ کو سیدھا دیکھتے ہوئے بائیں سے دائیں نیلی مسجد (Blue Mosque)، آیا صوفیہ (Hagia Sophia) اور تبرکات کی جگہ توپ کاپی پیلس (Topkapi Palace) محلات اور قسطنطنیہ کے سمندر کی طرف دیواریں بھی نظر آتی ہیں۔ بالکل بائیں طرف گلاٹہ ٹاور (Golata Tower) بھی گولڈن ہارن سے آگے نظر آتا ہے۔ باسفورس کے ملاپ پر شمال کی طرف استنبول کے پرانے حصے کو ابھی تک ترک حکومت نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اس کی دیواریں ابھی تک محفوظ ہیں۔ کئی تاریخی مقامات کی حکومتی سرپرستی میں دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک یورپین سائیڈ پر ہے اور دوسری ایشین سائیڈ پر ہے گویا کہ مشرق اور مغرب کا ایک انتہائی حسین امتزاج دنیا کو ڈائیلاگ کی دعوت دے رہا ہے۔ یورپین سائیڈ کی طرف بہت سارے تاریخی مقامات ہیں مگر یہاں صرف آیا صوفیہ (Hagia Sophia)، (Topkapi Museum) ٹوپ کاپی میوزیم (جہاں پر حضور ﷺ اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے تبرکات انتہائی سلیقے اور منظم طریقے سے رکھے گئے ہیں) یہاں آ کر ہم نے صرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار مبارک، نیلی مسجد اور پینو راما مرکز دیکھا اور استنبول کی ایشین سائیڈ پر ہمیں سیدنا یوشع بن نونؑ کے مزار پر ہی حاضری کی توفیق بھی ملی۔

انتہائی خوبصورت پینو راما مرکز (Panorama centre)

ترکی کی حکومت نے ایک انتہائی خوبصورت پینو راما مرکز (Panorama centre) بنا رکھا ہے جہاں مختلف ممالک کے سیاح اور ترکی کے سکولوں کے بچے آتے ہیں۔ جن کو 3D میں جنگ کا پورا منظر دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح ترکی کے مسلمانوں نے استنبول کے لئے قربانیاں دے کر مسلمانوں کو عزت بخشی اور اسلام کی بقاء کی جنگ لڑی گئی۔

دورانِ سفر میں ذاتی طور پر ندیم خان صاحب، مفتی شاہ منصور صاحب اور عاطف گردیزی صاحب سے معلومات لے کر خوب استفادہ کرتا رہا اور اپنے ایمان کو گرماتا رہا۔ یہ زندہ قوم کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنی نوجوان نسل کو اپنے آباء واجداد کی قربانیوں سے متعلق آگاہ رکھے اور ترکی نے اپنی نوجوان نسل پر واضح کر دیا ہے کہ یہ زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ لسانِ نبوت سے نکلی ہوئی بشارتوں کا جزیرہ ہے۔

پاکستان میں ترکی جیسا ایک پینو راما مرکز:

میری تجویز ہے کہ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اسی طرح کا ایک پینو راما سنٹر لاہور میں بھی بنائے۔ جس میں 1947ء اور 1965ء کے حالات کو 3D میں پیش کر کے پاکستانی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور قربانیوں سے متعلق مستقل آگاہ رکھا جائے۔ سکولوں اور کالجوں پر اس جگہ کا دیکھنا لازم قرار دیا جائے مگر اس کو کاروباری طریقے سے نہیں نظریاتی طریقے سے چیرٹی کی طرز پر چلایا جائے۔

نیلی مسجد (Blue Mosque)

اِس تاریخی مسجد کو ''سلطان احمد مسجد'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ استنبول کے وسط میں واقع ہے۔ یہ 1601ء اور 1616ء کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اس پراجیکٹ کا آئیڈیا سلطان احمد اوّل نے دیا تھا۔ اس کو نیلی مسجد اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی اندرونی ڈیکوریشن نیلے رنگ کی انتہائی خوبصورت ٹائیلوں سے کی گئی ہے۔

رات کی تاریکی میں اِس کے پانچ بڑے گنبدوں 8 چھوٹے گنبدوں اور 6 میناروں پر نیلی روشنیاں ایک دلربا منظر کا سماں پیش کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ مسجد آیا صوفیہ کے نزدیک واقع ہے۔ 2006ء میں اِس مسجد کا کیتھولک عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ بینیڈکت XVI نے بھی دورہ کیا جس سے اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طیب اَردگان کی فراست:

استنبول کو ایک جدید شہر بنانے میں اس وقت کے میئر جناب رجب طیب اردگان (Recep Tayyab Erdgon) 1994ء سے 1998ء تک کے دور میں ان کی انتھک محنت اور فراست کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اپنی فراست کا لوہا منواتے ہوئے یہ ترکی کے وزیراعظم کے عہدے تک جا پہنچے اور اپنی صلاحیتوں کو 2003ء سے 2011ء تک منوایا۔ جذباتی طریقہ کار نہیں، بلکہ حکمت اور دانائی سے کام لے کر اسلامائزیشن کا عمل جاری رکھا اور قوم کو تیار کرتے رہے۔ پھر یہی اردگان یورپ کے واحد اسلامی ملک کے 2014ء میں صدر بن گئے۔ ان کی اسلامی اقدار، اسلام کے دفاع سے متعلق انتہائی واضح موقف، امت مسلمہ کی مشکل حالات میں مدد، فلسطینیوں اور روہنگیوں اور شامی مہاجرین کی حمایت،

ان کی اہلیہ کا سکارف پہننا یورپ کو ایک آنکھ نہیں بھا تا لیکن انہوں نے اپنے ہمسایوں بالخصوص آرمینیا اور کردوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ دفاعی اور معاشی لحاظ سے ملک کو مضبوط کیا۔ صنعتی اعتبار سے ملکی ترقی کو یورپ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور ترکوں نے اپنی اسلامی ثقافت کو نہ صرف سنبھال کر رکھا ہوا ہے بلکہ اسے مزید مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔

ناکام فوجی انقلاب ''مجھے کیوں نکالا''

اور پھر گولانی سازش ہار گئی، اَردگانی فراست جیت گئی۔ 15 جولائی 2016ء کے ناکام فوجی انقلاب پر گرفتار باغیوں نے یہ انکشاف کیا کہ اس بغاوت کے پیچھے فتح اللہ گولن اور ان کی تنظیم تھی جو کہ CIA سے ہدایات لے رہی تھی۔ اس انقلاب کو روکنے کے لئے بلند یلدرم صاحب نے قوم کو آواز دی اور قوم نے بھی لبیک کہا اور لمحوں کے اندر عوام سڑکوں پر نکل آئی۔ فوجی ٹینک بے بس نظر آئے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار کے سامنے ایک تباہ شدہ کار کا ڈھانچہ شیشے کے فریم میں لگایا گیا ہے اور اس کو ایک یادگار کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ ''ہم تمہیں بھولے نہیں اور نہ ہی کبھی بھولیں گے۔'' عوام نے باہر نکل کر اپنے وزیر اعظم کو واپس دفتر میں عزت واحترام کے ساتھ وزیر اعظم کی کرسی پر بٹھایا۔ وہاں ایک منتخب وزیر اعظم کو یہ نہیں کہنا پڑا کہ ''مجھے کیوں نکالا'' ترکی کے لوگوں سے اکثر یہ سنا گیا کہ ''گولانی سازش ہار گئی اور اردگانی فراست جیت گئی'' سیکولرازم ہار گئی اور اسلامی جمہوریت جیت گئی۔ کاش کے پاکستان میں بھی عوام اور سیاستدانوں کے درمیان ایسا مضبوط رشتہ استوار ہوتا کہ منتخب وزرائے اعظم اس طرح اقتدار سے محروم نہ کیے جاتے۔

بلند یلدرم ایک مردِقلندر:

استنبول میں ہماری ملاقات IHH کے مرکزی صدر ایک مردِقلندر جناب بلند یلدرم (Buland Yaldirim) سے ہوئی۔ ان کے انڈر 200 ملین ڈالر کا بجٹ ہے لیکن کوئی پروٹوکول نہیں۔ انتہائی سادہ طبیعت کے مالک لیکن انتہائی زیرک اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ جونہی ہماری گفتگو شروع ہوئی انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ لوگ انتہائی کام کی بات کر رہے ہیں تو فوراً سٹاف کو کہا کہ فلاں فلاں صاحب کو بھی میٹنگ میں فوراً بلا لو۔ پاکستان کا نام انتہائی محبت اور احترام سے لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''پاکستان انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اسلامی دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ پاکستان ہماری ضرورت ہے اور ہم مل کر اس کی ترقی کریں گے۔''

IHH Human Relief Foundation ترکی کی سب سے بڑی چیرٹی ہے جو کہ پچھلے 25 سال سے صحت، تعلیم، ترقیاتی، انسانی حقوق کے علاوہ کئی اور سوشل اور کلچرل پراجیکٹس پر ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں کام کر رہی ہے۔ IHH کئی ایسے ممالک میں کام کرتی ہے جہاں سیلاب زدگان اور زلزلہ سے متاثرین کے لئے خوراک، ادویات اور رہائش کا انتظام کرتی ہے۔ مزید یہ کہ یتیموں کے مراکز بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ وہی چیرٹی ہے جو مئی 2010ء کو غزہ میں گھرے ہوئے مظلوم و بے بس فلسطینیوں کی مدد کے لئے ''فریڈم فلوٹیلا'' (Freedom Flotilla) کے نام سے سامان خوردونوش سے بھرا ہوا ایک جہاز لے کر گئی تھی اور اسرائیلی فوجیوں نے ظلم وتشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور بین الاقوامی قوانین وانسانی حقوق کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے اُن کے 9 رضا کار شہید کر دیئے تھے اور ترکی نے اپنی قومی غیرت وحمیت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے اسرائیل میں اپنا سفارتخانہ بند کر دیا تھا اور اپنے سفیر کو واپس بلا لیا تھا اور اسرائیل کے سفیر کو ترکی سے باہر نکال دیا تھا۔ یاد رہے کہ IHH، 2010، 2011 اور 2015 میں ایسے بحری جہاز لے جا کر بین الاقوامی برادری کی توجہ اسرائیلی مظالم کی طرف مبذول کروا چکی ہے۔ فریڈم فوٹیلا کولیشن (Freedom Fotilla Coalition) میں کینیڈا، اٹلی، نیوزی لینڈ، ملائیشیاء، ساؤتھ افریقہ، سپین، ناروے، سویڈن، امریکہ اور آسٹریلیا کے بڑے ادارے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً 70 کے قریب پوری دنیا سے تنظیمیں اس میں شامل ہیں۔

IHH نے پاکستان کے لئے کنگ عبداللہ فاؤنڈیشن کی مدد سے ''خبیب فاؤنڈیشن'' کے صدر جناب ندیم خان صاحب کی ذاتی کاوشوں سے 8 سٹیٹ آف دی آرٹ موبائل کلینک مہیا کئے ہیں جس کے اندر آپریشن تھیٹر تک موجود ہیں (X-Rays، Examinationa Room) لیبارٹری، فارمیسی اور جنریٹر تک کی سہولتیں موجود ہیں اور یہ پورا کلینک کسی بھی طرح یورپی معیار سے کم نہیں ہے اور یہ سولر پاور سے چلتا ہے۔ ایک کلینک کی قیمت تقریباً ایک ملین ڈالر ہے۔ اور اس کو چلانے کا 5 سال کے لئے خرچ بھی دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ IHH 2003، سے لے کر اب تک پاکستان میں 15 ملین یورو تک خرچ کر چکے ہیں۔

اس ملاقات کے موقع پر میر کارواں حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب نے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی موجودہ سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی صورت حال کا مختصراً تعارف کروایا اور کہا کہ خلافت عثمانیہ نے برصغیر کے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ آپ کے کام کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور آپ پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

جناب بلند یلدرم نے کہا کہ میں ایک سٹرٹیجی بنا کر آپ کو بھیجوں گا۔ پھر اس کے بعد ایک پلان اور ورکنگ پیپرز بنا کر اکٹھے کام شروع کریں گے۔

راقم الحروف نے گفتگو کے دوران اپنے اداروں ''فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ'' اور ''سکول آف اکنامکس اینڈ لاء'' کی طرف سے IHH کے ساتھ مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی اور ان کے سٹاف کے لئے کئی کورسز کے وظائف کا بھی اعلان کیا جس کا جناب بلند یلدرم نے سن کر خوشی کا اظہار کیا اور شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم باہمی مشاورت سے ایک کثیر الجہتی اور کثیر المقاصد تعلیمی منصوبہ بنائیں گے جس سے امت کو ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

خلافتِ عثمانیہ کے دور میں وزارت معارف کی یاد تازہ:

ہماری میٹنگ ترکی کے ایک بہت بڑے ادارے ''معارف'' کے ایشیاء کے انچارج جناب ندیم کایا سے ہوئی۔ یہ ادارہ 15 جولائی 2016ء کے جناب طیب اردگان کی جمہوری حکومت کے خلاف ناکام فوجی انقلاب کے بعد معرض وجود میں آیا۔ اس کے سرپرست خود طیب اردگان ہیں۔ اس ادارے کو حکومت عثمانیہ کے دور میں وزارت معارف کی یاد کو تازہ کرنے اور فتح اللہ گولن کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو حکومتی سرپرستی میں لانے کے لئے بنایا گیا ہے اور قوم کی ایک مشترکہ سوچ کو تیار کرنے میں بھی اس کے تھنک ٹینک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے مفکروں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ معارف کے انچارج جناب ندیم کایا صاحب انتہائی صاحب علم اور بڑی ہی نپی تلی گفتگو کرنے والی شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امت کو اپنی عظمت رفتہ ریسرچ اور ڈویلپمنٹ سے بحال کرنی ہوگی۔ صحابہ نے قرآن وسنت کے مطابق سائنس کو دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ الجبرا مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں نے

1001 ایجادات کیں لیکن پچھے 600 سال میں کوئی بھی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا گیا۔ آیئے! امت کی ایک سوچ کو ڈویلپمنٹ کریں۔ انہوں نے بڑے درد کے ساتھ یہ بات کہی کہ مدارس کو اپنے اوپر سے یہ الزام دھونا ہوگا کہ یہ بمبار پیدا کر رہے ہیں وگرنہ ہمارا مذہبی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم پاکستان میں کاروباری حضرات کو آفر کرتے ہیں کہ وہ سکول بنائیں۔ ہم ان کے کرایہ دار بننے کی ضمانت دیں گے۔

راقم الحروف کی توجہ انہوں نے اس طرف مبذول کروائی کہ ہم معارف کو برطانیہ سے مسلم اساتذہ دیں اور ترکی میں ان کے اساتذہ کو برطانیہ کے معیار کی ٹریننگ دیں۔ پاکستان، ترکی، صومالیہ، مالی اور دوسرے مسلمان ممالک سے اساتذہ کو برطانیہ لاکر ان کو ٹریننگ دیں۔ ترکی میں ان ہاؤس (In-House) ٹریننگ بھی دیں۔ معارف کیلئے کوالٹی سٹینڈرڈ بنانے کے لئے ہماری مدد کریں۔

ترکی میں درس وتدریس:

حضرت شیخ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے اس وقت موجود آخری شاگرد ڈاکٹر امین سراج صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باوجود امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت کے لئے مسجد فاتح میں اپنی وقیع علمی خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔ ان کے ایک دوست جناب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے اجل تلمیذ اور ایک علمی شخصیت بقیۃ السلف، فضیلۃ الشیخ محمد العوامہ دامت برکاتہم العالیہ کی زیارت کے لئے استنبول کے مضافاتی علاقے میں ان کے گھر حاضر ہوئے جہاں حضرت والا نے حضرت قاری محمد حنیف جالندھری صاحب زید مجدہم کو اجازتِ حدیث عطا فرمائی۔ حضرت مدینہ شریف میں چالیس سال تک قیام کے بعد جناب طیب اردگان کی خصوصی دعوت پر ترکی میں درس وتدریس کے کام کے لئے منتقل ہو چکے ہیں۔

وفد نے معہد الامام ابی حنیفہ کا دورہ بھی کیا یہ مدرسہ ایک بہت بڑے سیاحتی پارک کا حصہ ہے۔ یہاں پر مقامی کونسل کے دفاتر بھی ہیں، لوگوں کے لئے تفریح گاہیں بنی ہوئی ہیں اس کے مہتمم ایک شامی مہاجر حضرت الشیخ رضوان کحیل سے ملاقات کے علاوہ طلبا اور اساتذہ سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ وہاں حضرت قاری صاحب کا ایک مفصل بیان بھی ہوا۔

ترکی کے انصار اور شامی مہاجرین:

ترکی میں مہاجرین کی مدد کے لئے انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد حقیقی معنوں میں انداز ہوا کہ ترکی کے مسلمان امت کو جسد واحدہ سمجھ کر صحیح طور پر انصار مدینہ والا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی ہر چیز مہاجرین کے لئے قربان کر رہے ہیں۔ محلوں کے محلے مہاجرین کے حوالے کئے ہوئے ہیں۔ اور پرائیویٹ اداروں اور حکومت کی پارٹنرشپ میں مہاجرین کی فلاح وبہبود، تعلیم وتربیت اور ملازمت جیسے کثیر المقاصد پروجیکٹس شروع کر رکھے ہیں۔ جس میں IHH اور خبیب فاؤنڈیشن پاکستان انتہائی اہم اور مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

دارالیتامیٰ (Orphan City) اور پاکستانی جھنڈے:

اس کے علاوہ ہم IHH کے زیر اہتمام دارالیتامیٰ (Orphan City) کو دیکھنے گئے۔ اس کو مسلمان ممالک کی مختلف تنظیموں نے مل کر بنایا ہے اور یہ بھی ایک سٹیٹ آف دی آرٹ شاندار منصوبہ ہے جو کہ 400 کنال کی وسیع اراضی پر محیط ڈبل سٹوری خوبصورت اور پختہ مکانوں پر مشتمل ایک بین الاقوامی معیار کا پراجیکٹ ہے۔ یہاں تقریباً

1000 شامی یتیم بچوں کی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ بچوں کے لئے ایک سکول کا بھی انتظام احاطے کے اندر کر دیا گیا ہے۔ جو کہ ''خنیب فاؤنڈیشن'' کے زیر اہتمام ہے۔ اس کا نام ''شام پاکستان سکول'' رکھا گیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ''خنیب فاؤنڈیشن'' اور IHH نے اپنے تمام پروجیکٹس پر جگہ جگہ پاکستان کے جھنڈے لگائے ہوئے ہیں۔ اِن مراکز میں بچوں کو طبی سہولت بھی مرکز کے اندر دی جاتی ہے اور نفسیاتی علاج کے لئے خصوصی ڈاکٹرز کا انتظام بھی ہے ڈاکٹروں کی رائے میں ایک علیحدہ نفسیاتی علاج کے مرکز کی ضرورت ہے۔ جہاں Post Traumatic Stress Disorder(PTSD) یعنی کسی صدمے کے بعد جب بچہ ایک سخت ذہنی دباؤ میں آ جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے ایک خصوصی ٹیکنیک کے ذریعے اپنے بچوں کو صدمے سے نکالنے کے لئے انتظام کی ضرورت ہے۔ اس احاطے کے اندر 50 کنال پر مشتمل زیتون کا باغ بھی ہے جو کہ نہ صرف اس مرکز کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس کے مالی فوائد سے مرکز کو اعانت ملتی ہے اس مرکز کے سامنے کھڑے ہو کر ہم با آسانی شام کے پہاڑ اور ان کے اوپر بنے شامیوں کے مکانات کو دیکھ سکتے تھے۔

ریحانلی میں LOGISTIC CENTRE IHH کے ایک بہت بڑے گودام کو بھی دیکھا، جہاں ہزاروں ٹن خوراک اور دیگر ضرورت کا سامان سٹور کیا گیا ہے مرکز کی سڑکیں کشادہ اور پارک انتہائی خوبصورت ہیں۔

اس سفر میں ہمارا شانلی اورفہ جانا بھی ہوا۔ ریحانلی کے اندر خنیب فاؤنڈیشن کے تعاون سے چلنے والے ایک وومن ووکیشنل سنٹر کو بھی دیکھا جہاں پر عورتوں کو سلائی کا کام سکھا کر روزگار کے قابل بنایا جا رہا تھا۔ یہاں 30 بیوائیں کام کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھیں یہ ایک دن میں انتہائی اعلیٰ معیار کے 100 کے قریب خوبصورت لباس تیار کر لیتی ہیں۔

ہم جب استنبول سے ترکی کے ایک سرحدی شہر ''غازی انتب'' ہوائی جہاز کے ذریعے پہنچے تو کھانے کے بعد سیدھے ہوٹل آرام کے لیے پہنچ گئے۔ پھر علی الصبح ایک انتہائی آرام دہ بزنس کلاس گاڑی کے ذریعے ''کلِس'' پہنچے جو کہ ترکی کا سرحدی شہر ہے اور شام کے سرحدی شہر ازاز (AZAZ) اور حلب (HALAB) کے ساتھ ملتا ہے، یہاں پر خنیب فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چلنے والی روٹی بنانے کی فیکٹری کا دورہ کیا جو کہ ایک دن میں ایک لاکھ اسی ہزار روٹیاں بنا سکتی ہے۔

یہاں پر سڑک کے ذریعے ریحانلی (REYHANLI) کا سفر کیا جہاں پاکستان کے لیے دیئے گئے موبائل کلینکس دیکھے۔

غازی انتب، اورفہ، کلِس، انطاکیہ اور ریحانلی کے سفر کو حضرت مفتی شاہ منصور صاحب زید مجدہم نے دلچسپ بنائے رکھا کہ اللہ نے اُنکو علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اُن کا اہل علم و اہل اللہ دونوں کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق ہے۔ جسکا ہم نے مفتی صاحب کی رفاقت کی وجہ سے خوب استفادہ کیا۔

ترکی میں مقدس مقامات کی زیارات

سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار شریف پر حاضری:

کلِس (KILIS) سے ریحانلی جاتے ہوئے سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار شریف پر حاضری کی توفیق بھی ملی اور کچھ وقت دعا میں گذارا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنکے متعلق آتا ہے کہ ایران سے ماں کی اجازت لے کر شام کی

طرف حصولِ علم اور تزکیہ نفس کے لیے نکلے، تیس سال کے بعد جب واپس آئے تو ماں نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے پانی مانگا جب پانی لے کر ماں کے پاس پہنچے تو انکی آنکھ لگ چکی تھی ساری رات ماں کے سرہانے سخت سردی میں کھڑے رہے صرف اس انتظار میں کہ ماں کی آنکھ کھلے تو پانی پیش کر سکیں۔ سبحان اللہ۔ ریحانی کے ساتھ شام کا شہر ادلب لگتا ہے ادلب اور حلب کا ذکر قیامت سے متعلق احادیث میں آیا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا ایوب علیہ السلام کے مزار پر حاضری:

اور فہ کے شہر میں پہنچ کر ہم اُس مقام پر گئے جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اللہ نے اپنی قدرت سے وہاں پانی کی ندی بہادی جو آج کل مکمل ایک نہر کے نظام میں تبدیل کر دی گئی ہے اور جن لکڑیوں سے آگ جلائی گئی تھی وہ اس پانی میں مچھلیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ابھی بھی ہزاروں کی تعداد میں اس نہر کے اندر مچھلیاں اچھلتی، کودتی اور یَانار کونی بردًا وَّ سَلَام علی ابراھیم کا مظہر بن کر پیغام توحید دے رہی ہیں۔ پھر اس کے بعد سیدنا ایوب علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی اور اس کنوئیں سے پانی پیا جس سے اللہ نے سیدنا ایوب علیہ السلام کو بیماری سے شفاء بخشی تھی۔ اس کے بعد ہم حطائی کے شہر انطاکیہ بھی گئے جہاں حضرت حبیب نجارؓ جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابعی تھے کا مزار شریف ہے۔ ان کے متعلق سورہ یٰسین میں 17 (29-13) آیات نازل ہوئی ہیں۔

❀❀❀

چھٹا باب:

انتہا پسندی اور دہشت گردی، حقیقت و اسباب

یورپ میں انتہا پسند رویے اس وقت تیزی سے پھیل رہے ہیں بلکہ اب تو انتہا پسند تنظیموں کی وہاں بھرمار ہے پہلے اُن کا کوئی سیاسی وجود یا نمائندگی نہیں ہوتی تھی لیکن اب وہ لوکل کونسلوں سے لے کر یورپین پارلیمنٹ تک اپنے نمائندے منتخب کروا چکے ہیں۔ ہالینڈ، فرانس، برطانیہ اور جرمنی جیسے ملکوں میں تو باقاعدہ مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر غیر ملکی مہاجرین کے خلاف انتہائی تشدد پسندانہ رویوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آئے روز یہودیوں کی قبروں کی بے حرمتی، مسلمانوں کی عبادت گاہوں پر دہشت گردانہ حملے اور مسلمانوں پر تیزاب پھینک کر زخمی کرنے کے واقعات معمول بنتا جا رہا ہے۔ بلکہ جو مسلمانوں کے ہمدرد ہوتے ہیں اُن کے خلاف بھی پرتشدد کارروائیاں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ جیسا کہ بریڈفورڈ سے برطانوی رکن پارلیمنٹ Joe Cocks کو دن دیہاڑے بھرے بازار میں فائرنگ کر کے صرف اس لیے ہلاک کر دیا گیا کہ وہ کمیونٹی کے تمام گروہوں کو جوڑ کر رکھنا چاہتی تھیں اور مسلمانوں کے جائز حقوق سے متعلق بات کرتی تھیں اور دائیں بازو کے انتہا پسند گوروں کو امن کا درس دیتی تھیں۔ برطانیہ میں یورپ سے اخراج (BREXIT) کے ریفرنڈم میں کامیابی کے بعد کئی غیر ملکیوں پر قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں اور اب ڈونلڈ ٹرمپ کے صدر بننے کے بعد مغربی انتہا پسند تنظیموں کے وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ امریکی ریاستیں پینسلوینیا، نیویارک، ورجینیا، واشنگٹن، اوہائیو، نیوجرسی، تقریباً ہر امریکی ریاست (چار کے علاوہ) میں مسلمانوں اور اُن کی عبادت گاہوں پر حملے ہو رہے ہیں۔

CNN کی 7 اگست 2017 کی رپورٹ کے مطابق جنوری سے جولائی 2017 تک ہر مہینے میں نو (9) مساجد کو نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ IED (Improvised Explosive Devices) استعمال کر کے دھماکے کیے جا رہے ہیں جس سے مسلمانوں میں دہشت پھیلائی جا رہی ہے۔ برطانیہ میں ایک مسلمان کی طرف سے چاقو کے حملے کو امریکی صدر کی طرف سے فوراً دہشت گردی قرار دے دیا گیا اور اُس کی چند لمحات میں بھرپور مذمت کر دی گئی لیکن 12 اگست 2017ء کو امریکہ کی ریاست ورجینیا کے شہر Charlottesville میں امریکی گوروں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف بمعہ اسلحہ کے ریلیاں نکالی گئیں اور پرتشدد مظاہروں میں ایک خاتون اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور کئی لوگ زخمی ہو گئے لیکن اڑتالیس گھنٹے تک امریکی صدر کی طرف سے کوئی مذمتی بیان نہ آیا اور امریکی صدر مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے اس واقعہ کو دہشت گردی قرار نہ دیا گیا اور نہ اُس کی مذمت کی گئی اور وہ مذمت کرتے بھی کیوں ایسے واقعات و حالات امریکی صدر کے اسلام مخالف بیانات کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں، اگرچہ بعد میں سیاسی اور میڈیا کے دباؤ کی وجہ سے ایک بیان امریکی صدر کو دینا پڑا جبکہ انتہا پسند پھر بھی صرف اور صرف مسلمان کو ہی گردانا جا رہا ہے اور اس وجہ سے مسلمان نوجوان یہ سمجھتا ہے کہ اُس کو مذہب کی بنیاد پر تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اس کے مذہب کی دیدہ و دانستہ طور پر تضحیک کی جا رہی ہے۔

مسجد کی حفاظت پر معمور غیر مسلم محافظ:

یہاں ہمیں مسلمان نوجوان کے منفی رویے کو بھی سامنے رکھنا ہوگا کہ وہ کس طرح اپنے اندر نفرت کا الاؤ جلائے ہوئے ہے۔ اور اس نفرت کی آگ میں سب کو (مسلم اور غیر مسلم) راکھ کرنے پر تیار ہے۔ ایک مسلمان نوجوان چاقو کے ساتھ ایک پولیس آفیسر پر حملہ کردے جو کہ (عوام کے تحفظ کے لیے اپنی ڈیوٹی پر مامور ہے) یا معصوم سویلین راہ گیروں پر گاڑی چڑھادے یہ عمل کونسی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟ لہٰذا ہمیں خود احتسابی کرنی ہوگی۔ صرف مذمت نہیں بلکہ عملی طور اپنے رویوں میں تبدیلی لانی ہوگی اور باہر نکل کر اس فتنے کا مقابلہ کرنا ہوگا یہاں یہ یاد رہے کہ یہ غیر مسلم سویلین گورے تھے جنہوں نے عراق کے اوپر جنگ مسلط کرنے کے خلاف ملین مارچ نکالے اور لندن شہر کو جام کر کے رکھ دیا۔

میرے ذاتی تجربے میں یہ بات آئی کہ جب ہماری مسجد کے نمازی جولائی 2005 کے ناکام خودکش دھماکوں میں ملوث پائے گئے تو خطرہ تھا کہ ہماری مسجد پر حملہ ہوجائے گا۔ جب یہ افواہ پھیلی تو ہمارے علاقے کے چار غیر مسلم رہائشی ڈنڈے لے کر ہماری حفاظت کے لیے مسجد کے سامنے کھڑے ہوگئے اور پولیس نے بھی بڑی سرعت کے ساتھ اپنا حفاظتی حصار قائم کرلیا۔ اور مسجد اور نمازیوں کی حفاظت کی۔ ایسا نہیں جس طرح بھارتی حکومت نے بابری مسجد کو شہید ہونے دیا۔

لہٰذا درج ذیل سطور میں ہم انتہا پسندی کی حقیقت اور اُس کی وجوہات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

انتہا پسندی دراصل ایک ہمہ جہتی سوچ کا نام ہے۔ کسی خاص نظریے یا فلسفے کو اپنا لینا انتہا پسندی نہیں، لیکن آدمی اگر اس بات پر بضد ہوجائے کہ صرف اس کی رائے اور نظریہ ہی درست ہے اور اس کے علاوہ باقی تمام آرا باطل ہیں اور سب کو اسی کی رائے پر عمل کرنا چاہیے یا دوسرے نقطہ نظر کے حامل افراد کو سننے پر تیار نہ ہو اور وہ اس بات کے لیے کوشاں ہو کہ دوسری رائے رکھنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تو یہ سارے رویے انتہا پسندی میں شمار ہوں گے۔ انتہا پسندی کے مقابلے میں اعتدال کا رویہ بھی تو ہے۔ یہ اعتدال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو معتدل امت اور اسلام کو معتدل مذہب قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا ہے''۔

امام شافعی نے اسے بہت خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے:

''میں اپنی رائے کو درست سمجھتا ہوں لیکن اس میں غلطی کے امکان کو تسلیم کرتا ہوں اور میں دوسروں کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں لیکن اس میں صحت کے امکان کو رد نہیں کرتا۔''

انتہا پسندی ایک غیر فطری رویے کا نام ہے بلاوجہ رخصت کی راہ اختیار نہ کرنا جب کہ وہ پسندیدہ ہو یا دین کو مشکل بنانا، اپنے آپ کو عقل کل بنالینا، دوسروں کی رائے کو رد کردینا، دین کو غیر فطری لوازمات سے بوجھل بنادینا۔ یہ سب چیزیں انتہا پسندی میں داخل ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے جو آدمی کو ہر کام میں اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ فطرت کا مطالبہ میانہ روی ہے، یہی وجہ ہے کہ انتہا پسندانہ رویے کبھی اسلام کا مقصود نہیں رہے۔ اور خیر القرون کا سارا دور اِس اعتدال پر قائم رہا اور شدت وغلو کی نفی کرتا رہا جمع قرآن اور زکوٰۃ وغیرہ جیسے امور میں شخصی رائے کو مسلط نہیں کیا گیا۔ اسلام میں قرآن کی رو سے انتہا پسندی کے لیے 'غلو' اور 'تشدید' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

انتہا پسندی کی نفی قرآن کے آئینے میں:

اللہ رب العالمین نے اپنے کلام مبارکہ میں واضح طور پر انتہا پسندی کی نفی فرمائی ہے۔ اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ اسلام ایک میانہ رو اور اعتدال پسند دین ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ(1)

''کہو اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا۔ اور درست راستے سے بھٹک گئے۔''

یہی مضمون سورۃ النساء میں اسی طرح بیان ہوا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ.....(2)

''اے اہل کتاب دین میں غلو کرنے سے بچو۔''

رہبانیت ایک غیر فطری عمل ہے اور بلاشبہ انتہا پسندی کے باب میں جگہ پاتا ہے۔ رہبانیت کو اسلام میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ ...(3)

''ان لوگوں نے رہبانیت ایجاد کی ہم نے اسے ان پر فرض قرار نہیں دیا تھا۔''

قرآن نے حد سے تجاوز کرنے والوں پر بار بار تنقید کی ہے۔ سورہ الاعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ(4)

''اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

قریب قریب یہی چیز سورہ مائدہ میں بھی بیان کی گئی ہے۔ ''حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں''۔(5)

انتہا پسندی کی نفی سیرت رسول کے آئینے میں:

سیرت رسول کا ایک ایک لمحہ انتہا پسندانہ جذبات و عزائم کی نفی کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی انتہا پسندانہ جذبات کو تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ. فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ ...(6)

''دین آسان ہے اور جو انتہا پسندی کا رویہ اپنائے گا تو وہ مغلوب ہو جائے گا پس سیدھی اور میانہ روی کی راہ اپناؤ اور بشارت حاصل کرو اور صبح اور شام اور رات کے کچھ حصہ میں مدد حاصل کرو۔''

امام احمدؒ نے مسند میں، امام نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں اور امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم دین میں غلو کرنے سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ غلو ہی کے باعث ہلاک ہوئے۔''.....(7)

اسی طرح ایک اور جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔(8)

''آسانیاں پیدا کرو اور مشکل نہ بناؤ اور لوگوں کو خوش خبری دو تنفر نہ کرو''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بزرگ صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، پر اس وقت خفگی کا اظہار کیا جب انہوں نے نماز پڑھاتے وقت سورہ بقرہ کی قرات کی اور کسی نمازی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے معاذ تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو۔ آپ نے ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے ان کلمات کو تین بار دہرایا''۔(9)

اسی طرح آپ نے ایک دفعہ امام پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دلوں میں اکتاہٹ پیدا کرتے ہیں جو لوگوں کی امامت کرے اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہیے اس لیے کہ اس کے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند لوگ ہوتے ہیں۔''(10)

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

''اپنے آپ کو اتنے ہی عمل کا ذمہ دار بناؤ جس کی طاقت اور سکت رکھتے ہو۔ اس لیے کہ اللہ نہیں اکتا تا مگر تم اکتا جاؤ گے۔ بے شک اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل کیا جائے چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو''۔(11)

انتہا پسندی اور شدت کا رویہ جہاں بھی آئے گا وہاں ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہوگی اور دیگر حقوق لازم بھی متاثر ہوں گے۔ کیونکہ جہاں اسراف کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کے پہلو میں کوئی حق ضرور ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ تک یہ خبر پہنچتی ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ عبادات میں بہت زیادہ مشغول ہو گئے ہیں تو آپؐ نے ان سے سوال کیا:

''تم دن میں روزے رکھتے ہو اور رات کو نمازیں پڑھتے ہو؟'' عرض کی: ''جی ہاں! رسول اللہ'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، سوؤ بھی اور جاگو بھی اس لیے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے''۔(12)

انتہا پسندی کے نقصانات:

جب اسلام نے انتہا پسندی سے روکا ہے تو یہ بلاوجہ نہیں ہے اس کی اپنی خرابیاں ہیں جو معاشرتی ڈھانچے کو متاثر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

1 انتہا پسند رویوں سے معاشرے میں علم وفکر کی ارتقاء پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ جب ایک فریق اپنی رائے پر انتہا

پسندی کا لیبل لگاتے ہوئے ''اَنَا الْحَقُّ'' کی صدا بلند کرتا ہے تو وہ اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ اس پر علمی تنقید ہو۔ نہ ہی وہ کبھی اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ اس کی رائے میں غلطی ہو سکتی ہے چنانچہ ایک سمت گیر قسم کی ساکن صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جو ایک معاشرے کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں ہوتی۔

2۔ انتہا پسندی کی وجہ سے معتدل رویے پروان نہیں چڑھ سکتے۔ یورپ ایک دور میں اسی انتہا پسندی کا شکار تھا جب وہاں یہ تصور عام تھا کہ سوئی کے نکے سے اونٹ تو گزر سکتا ہے مگر ایک دولت مند آدمی کبھی جنت میں نہیں جا سکتا۔

3۔ شدت پسندی سے معاشرے کے اندر بے زاری کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت کی نماز میں امام کی لمبی قرأت کو رسول اللہ نے پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ رغبت سے نماز پڑھیں اور بے زاری یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔

4۔ انتہا پسندی سے باہمی احترام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔

5۔ انتہا پسندی سے فرقہ واریت پھیلتی ہے۔ اور معاشرے کی اجتماعیت متاثر ہوتی ہے۔

6۔ انتہا پسندی کے جذبات اگر اہل علم میں در آئیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسند علم بتدریج جاہلوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ اور یہ نقصان محض نقصان ہی نہیں بلکہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مثلاً مختلف علمی کام ہو رہا ہو اور ان ڈھیر سارے علمی مراکز میں باہم نقد و تحسین اور تبادلہ خیال کا کوئی ذریعہ یا رابطہ موجود نہ ہو، کوئی ایسا فورم ایسا ڈھانچہ اور ایسا نظام نہ ہو جہاں ہر ایک کی رائے کو پرکھا جائے اور ناقص رائے کو ترک کر کے بہتر رائے اختیار کر لی جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ریسرچ اور تحقیق کا کام ماند پڑ جائے گا۔ ہر گروہ اگر خود کو ہی معیار حق قرار دے کر باقی سب کا ابطال کر دے تو مسند علم بالآخر ویران ہو جاتے ہیں۔

7۔ انتہا پسندی معاشرے کی ایک صحت مند سوچ کے لیے بھی بڑی نقصان دہ ہے۔ جب کوئی معاملہ اعتدال میں نہ رہے تو وہ بے شمار مشکلات کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر سارا وقت عبادات میں صرف کیا جانے لگے تو معاملات متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر معاملات ہی کو وقت دیا جائے اور عبادات کو ترک کر دیا جائے تو یہ بھی ایک غلط اقدام ہو گا۔ آدمی پر مختلف طرح کے حقوق ہوتے ہیں مختلف فرائض ہوتے ہیں جو اسے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی کسی ایک کام کو چاہے وہ دعوت دین کا کام ہی کیوں نہ ہو اتنا زیادہ وقت دے کہ وہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہ کر سکے اور اس کو علم ہی نہ ہو کہ گھر کے روحانی ماحول پر کیسی نقب لگ چکی ہے۔

8۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس نظریے میں انتہا پسندی در آئی وہ نظریہ تغیرات زمانہ کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ عالمی جنگیں اِسی انتہا پسندی کا شاخسانہ تھیں۔ دوام صرف اعتدال ہی کو حاصل ہوا۔ افراد کو بھی اس باب میں کوئی شاخسانہ حاصل نہیں ہے۔ اگر کوئی فرد فضول خرچی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا انجام افلاس و غربت ہے۔ چنانچہ جس طرح کنجوسی کو منع کیا گیا ہے اسی طرح فضول خرچی کو بھی رد کر دیا گیا ہے اور حکم ہے کہ اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔

9۔ انتہا پسندی جہاں بھی ہو گی نقصان دہ ہو گی۔ مذہبی عبادات میں ہو گی تو عبادات بوجھل ہو جائیں گی اور ان میں تسلسل نہیں رہے گا۔ عبادات میں عدم توازن کا رویہ اپنایا جائے تو اس میں تسلسل باقی نہیں رہتا اور آدمی دوسرے راستے اختیار کر لیتا ہے۔ عبادت چاہے تھوڑی ہی کیوں نہ ہوں تسلسل کے ساتھ کی جانی چاہئیں۔

10۔ اسلام کے حوالے سے اگر انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا گیا تو اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ دین سے بیزار ہو جائیں۔

11۔ شدت پسندی کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اختلافات جو عام طور پر محض فکری اختلاف رائے میں ہوتے ہیں وہ فکری اختلاف سے بڑھ کر فرقہ واریت اور تعصّباتی گروہ بندی پر آن ختم ہوتے ہیں اور نوبت باہم نزاع تک پہنچ جاتی ہے۔

انتہا پسندی کی ایک بڑی وجہ:

انتہا پسندی کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ دین کا صحیح علم نہ ہونا ہے۔ جب دین کا مکمل علم نہیں ہوتا یا فکری یا گروہی تعصب غالب آجاتا ہے تو پھر اس سے انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ امام ابو اسحاق شاطبیؒ نے اس کی وجوہات کے بارے میں لکھا۔

''جب ناقص علم رکھنے والے لوگ زمانہ کی وجہ سے علما کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں تو وہ خود کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں اور کسی دوسرے کی رائے کو اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہیں سے انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے''۔

اسلام تو ایک معتدل مذہب ہے جو اپنے وابستگان کو بہترین امت کے نام سے پکارتا ہے اور ان کو اعتدال میں رہنے کا حکم دیتا ہے۔

پاکستان میں انتہا پسندی:

کیونکہ انتہاء پسندی ایک کثیر الجہتی گلوبل مسئلہ ہے اور اس کی وجوہات بھی کثیر الجہتی ہیں اور اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں ایسے لیا ہوا ہے جس طرح کسی بڑے اژدھے نے بکری کے بچہ کو دبوچ رکھا ہو، مشرق ہو یا مغرب، پاکستان ہو یا ہندوستان بے انتہاء افراد اور گروہ اس مکروہ فعل میں ملوث ہیں۔ آج اگر ہم اپنے معاشرے پر ایک نگاہ دوڑائیں تو: انتہا پسندی کا ایک ظہور اختلاف رائے پر عدم برداشت سے پیدا ہوا۔ سارا معاشرہ انتہا پسندی کی دلدل میں دھنستا نظر آتا ہے۔ تمام شعبہ ہائے زندگی اس کی لپیٹ میں ہیں۔ میانہ روی کا عنصر روز بروز کم پڑتا جارہا ہے۔ اہل مذہب کی انتہا پسندی اس حد تک شدید ہوچکی ہے کہ اختلاف رائے برداشت کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ جہاں اختلاف رائے پیدا ہوا وہاں کفر کے فتاویٰ تقسیم ہونا شروع ہوگئے چنانچہ ہر ایک گروہ کے نزدیک صرف وہ ہی حق پر ہے اور دوسرے تمام گروہ باطل قوتوں کے ایجنٹ ہیں۔ اختلاف رائے میں اتنی شدت پسندی در آئی کہ بڑے بڑے علمائے کرام اور بزرگان بھی اس ''فتنہ'' سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ مسند علم پر فائز لوگ انتہا پسندی کے جذبات سے مغلوب ہوکر بسا اوقات وہ کچھ کہہ ڈالتے ہیں کہ معاشرے میں فساد کا ایک مستقل دروازہ کھل جاتا ہے۔ آئے دن کے فرقہ وارانہ جھگڑے، مساجد، امام بارگاہوں اور اقلیتوں کی عبادت گاہوں، سکولوں، ہسپتالوں اور سماجی اداروں کے دفاتر پر حملے اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح گھریلو تشدد، غیرت کے نام پر خواتین کا قتل عام اور مذہبی بنیادوں پر ان کی حق تلفی کی روایات انتہا پسندی ہی کی پیداوار ہیں۔

انتہا پسندی کا دوسرا ظہور اس طرح ہوا ہے کہ دین پر عمل درآمد مشکل ہوگیا ہے۔ دین میں بعض چیزیں لازم ہیں، بعض اختیاری جنہیں مستحب بھی کہتے ہیں۔ اختیاری امور کو لازم قرار دیا جاتا ہے۔ جس سے دین پر عمل درآمد مشکل ہوتا جا

رہا ہے۔ایک عام آدمی جب دین کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام اس کے بس سے باہر ہے اور اس طرح وہ دین سے دور ہو جاتا ہے۔

انتہا پسندی کا تیسرا ظہور سماجی دائرے میں ہے۔ ہم اپنے باہمی تعلقات میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے اختلافات پر سخت موقف اپنا کر ایک دوسرے سے تعلقات منقطع کر لیتے ہیں، شادی بیاہ کے معاملے میں ایک دوسرے سے ملنا چھوڑ دیتے ہیں۔سماجی تقریبات کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں اور انسانی وحدت کو مجروح کرتے ہیں۔راہ چلتے وقت معمولی باتوں پر جھگڑوں میں پڑ جاتے ہیں جو کہ کبھی کبھار قتل اور فساد کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔انہی انتہا پسند اور متشددانہ رویوں کے بدولت ہی مسلمان مسلمانوں کے خلاف نفرتوں کے بیج بوتے ہیں۔دوسرے مذاہب اور نظریوں سے متعلقہ افراد کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ان انتہا پسندانہ رویوں کی وجہ سے آج کا مسلمان دنیا میں تنہا ہو رہا ہے۔کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں اگر مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے اور ان کے مسائل میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو اس کی وجہ صرف ہماری جذباتیت، بے روح قسم کے بلند بانگ دعوے اور کمزوری ہے۔ہم اپنی ناکامیوں کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں اور اپنی تاریخ کے سنہری دور کے قصے یاد کر کے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ ہمارے اندر کا انسان اور وہ احساس جو کسی عمل کے لیے محرک بنتا ہے، شاید مر چکا ہے۔ہم محنت سے جی چراتے ہیں اور ہر لمحے شارٹ کٹ کی تلاش میں اپنے گھر کو سنوارنے کی سوچ سے عاری ہیں۔ہمیں یہ پتہ ہی نہیں کہ جب تک ہم کمزور ہیں تب تک اپنے قریب ترین لوگوں کی مدد تک بھی نہیں کر سکتے۔یہ سب انتہا پسندی کے شاخسانے ہیں۔اور انسانی انا کو غیر ضروری اہمیت دینے کے نتائج ہیں۔حالانکہ دنیا میں ایک دوسرے کا لحاظ رکھ کر ہی معاشرے کو متوازن بنایا جا سکتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب رویوں میں اعتدال پیدا کیا جائے۔

انتہا پسندی کا چوتھا ظہور سیکولر طبقے میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔یہ سیکولر طبقہ مذہبی لوگوں سے اس حد تک نفرت کرتا ہے کہ ان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔نتیجے کے اعتبار سے یہ انتہا پسندی مذہبی انتہا پسندی سے کسی طور پر کم نہیں۔ہمارا پاکستانی سیکولر طبقہ اخبارات اور رسائل اور ٹی وی پروگرامز پر بیٹھ کر انسانی حقوق کی بات کرتا ہے جب کہ علما اور مدارس کے طلبا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ علما اور مدارس کے طلبا بھی انسان ہیں اور معاشرے کا ایک اہم ترین جز ہیں اور اُن کے بھی برابر کے حقوق ہیں اکثر یہ حضرات اس کا برملا اظہار کرتے نظر آتے ہیں ''ملاء کو ختم کرو اور مدارس کو بند کرو یا گورنمنٹ کی تحویل میں لے لو اور مدارس کے طلبا کو کمپیوٹر کی اور ٹیکنیکل تعلیم دینا شروع کرو'' پھر اس کے ردِعمل میں علما اپنی توانائیاں اپنے دفاع میں خرچ کرتے نظر آتے ہیں جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مدرسہ ایک واحد ایسا انسٹی ٹیوشن ہے جس کے فارغ التحصیل کو کام کی ضمانت ہے جبکہ ہمارے یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل کام کی تلاش میں در بدر کے دھکے کھا رہے ہوتے ہیں یہ مدارس ہی ہیں جو کہ پورے ملک میں ایک ایسا خیراتی نیٹ ورک چلا رہے ہیں جہاں بچوں میں خواندگی کی شرح کو بڑھایا جا رہا ہے گویا کہ ناخواندگی کو ختم کرنے کا حکومتی ٹارگٹ حاصل کرنے میں مدارس معاون ثابت ہو رہے ہیں اور نہ صرف تعلیم مہیا کی جاتی ہے بلکہ اُن کے سر پر چھت، جسم پر کپڑے اور خوراک مفت میں مہیا کی جاتی ہے۔جس پر حکومت پاکستان کو ان کا ممنون و شکر گزار ہونا چاہیے اور انہیں جدید خطوط پر چلانے کے لئے نہ صرف تجاویز دیں بلکہ عملی طور پر تعاون کریں اور ان کا قومی اور بین الاقوامی یونیورسٹیوں سے الحاق کروائیں۔مجھے تو نظر نہیں آتا کہ کوئی بھی حکومت اتنے

بڑے فلاحی اور تعلیمی منصوبے کو اپنی تحویل میں لے کر کامیابی سے چلا سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے کنٹرول سے چلنے والے تعلیمی اداروں کی حالتِ زار ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا مدارس کو قومی تحویل میں لینے کی کوئی بھی مہم کامیاب نہیں ہو سکے گی بلکہ اُلٹا بداعتمادی زیادہ بڑھے گی اور قوم افراتفری کا شکار ہوگی۔

لہٰذا میری اپنے دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ فرقہ وارانہ، علاقائی تعصّبات سے تقسیم قوم کو مزید تقسیم کر کے دو انتہاؤں کا حصہ نہ بنیں بلکہ سوسائٹی کو Depolarise کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ خیر القرون کے دور میں مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ یہ رویہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک کافر بڑھیا کے گھر جا کر جھاڑو دے آتے تھے اور آج مسلمان مسلکی اختلاف کی وجہ سے دوسرے مسلمان کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔

انسدادِ دہشت گردی کا قومی ادارہ

نیکٹا ایکشن پلان کے بیس (20) نکات

پاکستان آرمی سکول پشاور میں دہشت گردوں کے حملے کے بعد 150 کے قریب بچوں اور اساتذہ کی اندوہناک خبر آتے ہی پوری قوم نے متحد ہو کر اس ''شر'' کا مقابلہ کرنے کا اعادہ کیا۔ سیاستدان، فوج، میڈیا، مذہبی اور غیر مذہبی حلقے تمام اس بات پر متفق تھے کہ بہت ہو گیا، اب اس کا جواب دینے کا وقت ہے لہٰذا آرمی اور سیاستدانوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس کے نتیجے میں ایک 20 نکاتی ایکشن پلان بنایا گیا جس کے کچھ مثبت نتائج بھی نکلے لیکن ابھی بھی قوم دہشت گردی کے چنگل سے باہر آنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ 20 نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1:.....دہشت گردی کے کیسوں میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی سزا پر عمل۔
2:.....آرمی کے زیر اہتمام سپیشل ٹرائل کورٹ، جن کی مدت 2 سال ہوگی۔
3:.....تشدد پسند تنظیمیں اور مسلح گینگز کو ملک میں کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔
4:.....نیکٹا کو مزید مضبوط کیا جائے گا۔
5:.....نفرت، انتہا پسندی، فرقہ واریت اور عدم برداشت پھیلانے والے اخبار اور رسائل کے خلاف سخت ایکشن۔
6:.....دہشت گردوں اور اُن کی تنظیموں کے فنڈ کو روکنا۔
7:.....کالعدم تنظیموں کو نئے سرے سے کام کرنے کو روکنے کی یقین دہانی۔
8:.....انسدادِ دہشت گردی (Counter Terrorism) فورس کا قیام۔
9:.....مذہبی ناانصافیوں کے خلاف مؤثر ایکشن۔
10:.....مدارس کی رجسٹریشن اور ان کو ایک نظم میں لانا۔
11:.....الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر دہشت گردوں اور دہشت گردی کی تنظیموں کو ہوا دینے والوں پر پابندی۔
12:.....فاٹا میں انتظامی اور ترقیاتی اصلاحات، جس میں مہاجرین کی واپسی سرفہرست ہوگی۔
13:.....دہشت گردوں کے مواصلاتی نظام کا مکمل خاتمہ۔
14:.....دہشت گردی سے متعلق سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال کے خلاف اقدامات۔
15:.....پنجاب میں تشدد بالکل برداشت نہیں ہوگا۔

16:.....کراچی میں آپریشن کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا۔
17:.....بلوچستان کی حکومت کو تمام سٹیک ہولڈرز کے ساتھ بات چیت کرنا اور معاملات کو درست کرنے کا مکمل اختیار دیا جانا۔
18:.....فرقہ وارانہ دہشت گردوں کے ساتھ سختی سے نپٹنا۔
19:.....افغان مہاجرین کے مسئلے کے ساتھ نپٹنے کے لیے ایک جامع پالیسی بنانا جو کہ مہاجرین کی رجسٹریشن سے شروع ہوگی۔
20:.....کریمینل جسٹس سسٹم کی اصلاح اور بہتری کرنا۔(13)

20 Points of NACTA Action Plan

National Counter Terrorism Authority

1. Implementation of death sentence of those convicted in cases of terrorism.
2. Special trial courts under the supervision of Army. The duration of these courts would be two years.
3. Militant outfits and armed gangs will not be allowed to operate in the country.
4. NACTA, the anti-terrorism institution will be strengthened.
5. Strict action against the literature, newspapers and magazines promoting hatred, extremism, sectarianism and intolerance.
6. Choking financing for terrorist and terrorist organizations.
7. Ensuring against re-emergence of proscribed organizations.
8. Establishing and deploying a dedicated counter-terrorism force.
9. Taking effective steps against religious persecution.
10. Registration and regulation of religious seminaries.
11. Ban on glorification of terrorists and terrorist organizations through print and electronic media.
12. Administrative and development reforms in FATA with immediate focus on repatriation of IDPs.
13. Communication network of terrorists will be dismantled completely.
14. Measures against abuse of internet and social media for terrorism.
15. Zero tolerance for militancy in Punjab.
16. Ongoing operation in Karachi will be taken to its logical end.
17. Balochistan government to be fully empowered for political reconciliation with complete ownership by all stakeholders.
18. Dealing firmly with sectarian terrorists.
19. Formulation of a comprehensive policy to deal with the issue of Afghan refugees, beginning with registration of all refugees.

20. Revamping and reforming the criminal justice system.

بھارت میں انتہا پسندی:

برطانیہ کے خلاف آزادی کی تحریک میں آل انڈیا کانگریس نے اپنی سیکولر شناخت کو برقرار رکھا اور جمعیت علما ہند جیسی تنظیموں کو اب تک اپنے ساتھ ایک اتحادی جماعت کے طور پر رکھا ہوا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی نظر نہیں چرائی جا سکتی کہ اُس وقت بھی کئی مسلم سیاسی رہنماؤں اور علما کرام نے اِس ''سیکولر'' شناخت کو چیلنج کیا اور دو قومی نظریے کے تحت مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت دو علیحدہ ریاستیں قیام میں آئیں۔

بھارت میں آزادی کے فوراً بعد ایک متعصّبانہ قومیتی رنگ ابھر کر سامنے آیا جس کی وجہ سے علیحدگی پسند تحریکوں نے بھارت میں جنم لیا۔ چاہے وہ آسام کے علیحدگی پسند ہوں یا تحریک آزادی کشمیر ہو یا خالصتان کی تحریک ہو۔ روز بروز بھارت کا ایک انتہا پسندانہ چہرہ صاف اُبھر کر سامنے آ رہا ہے۔

بھارت کا یہ نام نہاد دعویٰ کہ ''بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے'' کی قلعی کھل کر یوں سامنے آتی ہے کہ اِس وقت تقریباً 60 سے زیادہ علیحدگی پسند تحریکیں بشمول پنجاب، آسام، مَنی پور، ناگالینڈ، بنگال، اڑیسا، بہار، آندھرا پردیش،

مدھیا پردیش، مہاراشٹرا، جموں کشمیر وغیرہ جیسی ریاستوں میں چل رہی ہیں۔

17 کے قریب بڑی تحریکیں آزادی کی جنگ لڑ رہی ہیں جن کے پاس اپنے عسکری گروہ بھی موجود ہیں۔ اِن میں آسام میں 30 سے زیادہ باغی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ جن کا 162 اضلاع پر کنٹرول ہے۔ بھارت میں سات ریاستیں (اروناچل پردیش، منی پور، آسام، ناگالینڈ، تری پورہ، میزورم، مگھالیا) جن کو سات بہنیں بھی کہا جاتا ہے۔

Seven Sisters states (Arunachal Pradesh, Assam, Meghalaya, Manipur, Mizoram, Nagaland and Tripura)

یہ سات ریاستیں ہیں جن کو باغی تحریکوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ناگالینڈ کے باغیوں کی تحریک بھارت کی حکومت کے لئے حقیقی معنوں میں ایک خطرہ ہے۔ اس کے ہاتھوں سینکڑوں بھارتی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ آسام میں بھی 30 سے زیادہ تحریکیں علیحدگی کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں کئی تنظیمیں بھارتی قبضے کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

پنجاب میں سکھوں کی کئی تنظیمیں اس وقت مصروفِ جنگ ہیں کہ سکھوں کے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کر کے اُس کے تقدس کو پامال کیا گیا۔ 1992ء میں بابری مسجد کو شہید کر کے بھارت کی ہندو انتہا پسندانہ مہم جوئی سامنے آئی۔ 2002ء میں گجرات کے مسلم کش فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کی شہادت اور اربوں روپے مالیت کی جائیدادوں کا نقصان ہندوانہ انتہا پسندی کا پرچار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

دلت (اچھوت) اور تامل کمیونٹی کے لوگوں پہ ظلم کی کہانیاں علیٰحدہ چلتی ہیں۔ گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کے بعد اُس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی پر حملہ ایک سکھ نے کیا اور جان سے مار دیا۔ اسی طرح ایک تامل خاتون نے راجیو گاندھی پر خودکش حملہ کر کے مار دیا اور اس سے پہلے ایک انتہا پسند ہندو نتھو رام نے گاندھی جی کو قتل کر دیا تھا۔

کشمیر میں آٹھ لاکھ فوج جس بے دردی سے بوڑھوں، عورتوں، مردوں اور بچوں اور طلبا و طالبات پر ظلم روا رکھے ہوئے ہیں اُس پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

بھارت میں جہاں دلت کمیونٹی پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ وہاں مسلمان اور مسیحی برادری بھی ہندوؤں کے ظلم کا شکار ہو رہی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق 2015ء میں روزانہ ایک حملہ اقلیتی افراد پر ہندو انتہا پسندوں کی طرف سے ہوا۔ 2014ء کی نسبت 2015ء میں اقلیتوں پر حملوں میں 20% اضافہ ہوا ہے۔

1998ء سے بھارتیا جنتا پارٹی (BJP) کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہندو انتہا پسندی نے بھارت کو ایک نئے موڑ پر لا کے کھڑا کر دیا ہے۔

BJP کے پہلے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی راشٹریا سوائم سیوک سنگ (Rashtriya Swayamsevak Sangh) جیسے پیرا ملٹری اور انتہا پسند گروپوں سے نہ صرف میل ملاپ رکھتے تھے بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے تھے۔ یاد رہے کہ RSS پر برطانوی راج کے دوران بھی پابندی تھی۔ 1948ء میں پھر مہاتما گاندھی کے قتل کرنے پر اِس تنظیم پر پابندی لگائی گئی۔ تیسری بار 77-1975ء کی ایمرجنسی میں اور چوتھی بار 1992ء میں بابری مسجد کے مسمار کرنے پر۔ لیکن بھارت کی بدقسمتی کہ اِسی تنظیم کے زیر اثر اور گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی وزارت میں 2002ء کو مسلمانوں کی کھلے عام نسل کشی کی گئی۔

RSS کے ساتھ بجرنگ دل Bajrang Dal اور VHP وِشنو ہندو پریشاد (Vishnu Hindu Parishad) بھی سب سے بڑھ کر مذہبی اور نسلی منافرت پیدا کر کے مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کی نسل کشی میں شریک ہیں۔

اب BJP قومی سطح پر سرکاری طور پر (HinduTwa) ہندوتوا کا پرچار کر کے انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیموں کی سرپرستی کر رہی ہے۔ BJP مختلف تعلیمی اداروں، نیشنل بک ٹرسٹ، نیشنل فلم ڈویلپمنٹ جیسے اداروں میں انتہا پسند ہندوؤں کا تقرر کر کے براہِ راست ہندوتوا کا پرچار کر رہی ہے۔ گجرات کے فسادات پر بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا کہ اُن کا گجرات کی حکومت اور پراسیکیوشن پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔

1999ء میں ایک آسٹریلین مشنری گریہم سٹینز (Graham Staines) اور اُس کے دو بچوں کو اڑیسا میں زندہ جلا دینے پر امریکہ میں بھی اس خبر کو سنجیدگی سے لیا گیا۔ اس سے پہلے بھارتی عیسائی اور مسلمان مرتے رہے تو امریکہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

فروری 2002ء میں گجرات کے مسلم کش فسادات نے پوری دنیا کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اُس وقت گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی تھے۔ جنہوں نے اپنے BJP ہندو ارکان سے کہا کہ اِن لوگوں (مسلمانوں) کو سبق سکھاؤ کیونکہ یہ اپنی نسل میں اضافہ کر رہے ہیں۔ گویا کہ مسلم نسل کشی کی ترغیب دی گئی۔ VHP انٹرنیشنل کے صدر اشوک سنگھال نے گجرات کے مسلم کش فسادات کو ایک ''کامیاب تجربہ'' کہا اور دھمکی دی کہ یہ عمل پورے ہندوستان میں دہرایا جائے۔

BJP کی 2002ء الیکشن میں جیت پھر VHP کے سیکرٹری جنرل پراوین توگودیا نے کہا ''ہندوتوا کے تمام مخالفین کو سزائے موت دی جائے گی۔ اور یہ کام ہم عوام پر چھوڑیں گے۔ 2004ء میں امریکہ کے کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی نے اپنی State Department کو سفارشات میں تجویز دی تھی کہ وہ انڈیا کو اس کی مذہبی آزادی کے حقوق شدید منظم اور جاری'' خلاف ورزیوں پر اپنی لسٹ میں ڈالے۔ جہاں ہم یہ سمجھے 1.6 بلین بھارتی آبادی کا بہت بڑا تناسب میں اور معاشی اعتبار سے اتنا بڑا ملک بہت سے مغربی ممالک کے لئے ضرورت ہوگا وہاں یہ بات بھی سامنے رکھنی

ہوگی کہ اگر اسی طرح عیسائی، مسلمان، سکھ مرتے رہے تو مغربی دنیا کے لئے بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا کہ اپنے وقتی معاشی فوائد کے لئے ایک لانگ ٹرم سیاسی مقصد کو بھول جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بھارت میں ہندو انتہا پسندی اسی طرح بڑھتی رہی تو یہ بھارتی جمہوریت، معیشت اور خارجہ پالیسی کو تباہ کر دے گی۔

مغرب کو مسلم ممالک بالخصوص پاکستان کی شدت پسندی تو نظر آتی ہے لیکن بھارت سے جڑے اپنے معاشی مفادات کی وجہ سے بھارت کی شدت پسندی اور دہشت گردی نظر نہیں آتی۔ 2017 میں اتر پردیش کے لیجسلیٹیو اسمبلی (Uthar Pradesh Legislative Assembly) میں وزیر اعظم مودی کی سرپرستی بھارت کے ایک انتہا پسند اور مسلمانوں کے قاتل 44 سالہ جوگی ادتیا ناتھ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے کہا تھا کہ ''ہمیں (بابری مسجد) گرانے سے کوئی نہ روک سکا تو اب مندر بنانے سے کون روک سکے گا؟'' حالانکہ یہ کیس اعلیٰ عدالتوں میں چل رہا ہے۔ ابھی اپریل 2017ء میں بھارت کی سپریم کورٹ نے ایک لینڈ مارک فیصلہ دیا ہے جس میں بی جے پی کے ایل کے ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی کے بشمول تقریباً 12 بھارتی انتہا پسند راہنماؤں کو قصوروار ٹھہرایا کہ انہوں نے 6 ردسمبر 1992ء میں مسجد کی شہادت کے لئے سازش کی۔ عدالت نے کہا کہ یہ کام ''جرم'' ہے اور آئین کے سیکولر حصے کے لئے بہت بڑا 'صدمہ' ہے۔

عدالت نے بھارتی سنٹرل بیورو آف انوسٹیگیشن (Central Bureau of Investigation=C.B.I.) کو بھی ڈانٹا کہ بیورو نے اس کیس کو 25 سال روکے رکھا۔ مزید کہا کہ ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں اس لیے نہیں لایا جا سکا کہ CBI سے پراسیکیوشن کا صحیح طور پر پیچھا ہی نہیں کیا۔ سپریم کورٹ نے ریاستی حکومت کو بھی ڈانٹا کہ وہ ٹیکنیکل غلطیوں کا کوئی حل جان بوجھ کر تلاش نہ کر سکے۔

بھارت کی وزارتِ داخلہ کے مطابق تقریباً 40 کے قریب تنظیموں پر غیر قانونی سرگرمیوں کے ایکٹ [Unlawful Activities (Prevention) Act] کے تحت ملک کے اندر کام کرنے پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اِس کے علاوہ بھی کئی چھوٹی چھوٹی علاقائی تنظیمیں انتہا پسندی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کا قتل عام کرنے اور دہشت گردی کے ذریعے مسلمانوں کو بے گھر کرنے والی مذہبی تنظیموں پر کوئی پابندی نہیں۔ بھارت کے اندر دہشت گردی والی تنظیموں کا تقریباً 80% غیر مسلم ہے۔

انتہا پسندی پر کلام آخر:

انتہا پسندی ایک غیر پسندیدہ عمل ہے۔ تاہم اس کے خاتمے کے لیے ریاستی استعداد سے زیادہ شعوری عمل کا کام اہم ہے۔ یہ معاشرے کے باثر حلقوں اور علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ جب تک معاشرے میں شعوری طور پر انتہا پسندی کے جذبات کا ابطال نہیں کیا جائے گا محض قانون سازی کے ذریعے اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے خاتمے کے حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری اہل علم پر عائد ہوتی ہے۔ علمائے کرام اگر اپنے خطبوں، تقاریر اور وعظ میں انتہا پسندانہ رویوں کا کھل کر ابطال کریں تو ان رویوں کے دم توڑنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔

دہشت گردی کی حقیقت:

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے اور مسلمانوں کی بدقسمتی کہ ایک گہری حکمت عملی کے تحت اسلامک جہاد اور اسلامک ٹیررزم جیسی منفی اصطلاحات میڈیا کے ذریعے عامۃ الناس میں متعارف کروائی گئیں اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ پہلے سب نے مل کر القاعدہ جیسی تشدد پسند تنظیموں کو بنایا اور انہیں جدید اسلحہ کے ساتھ مسلح کر کے پروان چڑھایا اور پھر جب عراق، لیبیا اور شام کی تباہی کا منصوبہ بنا تو القاعدہ کا باب بند کیا گیا اور پھر ایبٹ آباد میں اُسامہ بن لادن کو یا زمین نگل گئی یا آسمان نے اُٹھا لیا پھر اس دہشت گردی کی کتاب کا پہلے سے لکھا ہوا ایک نیا باب داعش (دولۃ الاسلامی عراق و الشام) کی شکل میں اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے متعارف کروایا گیا اور ابوبکر بغدادی جیسے ایک غیر معروف شخص کو اُس کا امیر بنا دیا گیا۔

ابوبکر البغدادی جو کہ ابو دعاء اور ڈاکٹر ابراہیم علی البدری السماری کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں کچھ عرصہ قبل تک یہ ایک انتہائی غیر معروف شخصیت تھی، عراق کے شہر سمارہ میں 1971ء میں پیدا ہوئے۔ عراق پر امریکی حملہ کے بعد 2003ء میں یہ عراق کے مزاحمتی گروپوں میں شامل ہو گئے۔ 2006ء میں ابو مصعب الزرقاوی کے امریکی حملہ میں ہلاک ہونے کے بعد نام نہاد ''اسلامی ریاست'' داعش کے خود ساختہ خلیفہ بنے، یاد رہے ان کی خلافت کو کسی بھی اسلامی ملک نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ اسامہ بن لادن اور الزرقاوی کی طرح میڈیا پر آنے سے کافی پرہیز کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر تاثر یہ ہے کہ عراق پر حملے کے دوران امریکہ نے وہاں گوانتاناموبے کیمپ کی طرح ایک عقوبت خانہ ''البقعہ کیمپ'' کے نام سے بنا رکھا تھا جہاں البغدادی بھی زیر حراست تھے عام طور پر مسلمانوں میں تاثر یہ ہے کہ اسی جیل میں ایک خاص منصوبہ بندی ہوئی جس کے ذریعے داعش اور بغدادی کو مغربی میڈیا میں خلیفہ کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ کئی ایسی تحریریں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں جس میں ان کو ایک یہودی النسل نوجوان کے طور پر بتایا جاتا ہے۔ اور اسی نام نہاد خلیفہ کے حکم پر کئی مغربی صحافیوں اور دیگر معصوم لوگوں کے سر بھی قلم کیے گئے، جن میں جاپان، برطانیہ اور امریکہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ اور ان کی تنظیم نے عراق میں کئی خودکش حملوں کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔ ان کی بلیک مارکیٹ میں تیل کی فروخت کی آمد تقریباً ایک ملین ڈالر یومیہ ہے۔ اور ان کی پشت پناہی تیل کے بہت بڑے بین الاقوامی تاجر کر رہے ہیں۔ کہ لاکھوں ملین بیرل تیل کی نقل و حرکت بغیر کسی بڑی طاقت کے ممکن نہیں۔ اور اب ان کے اثاثے اربوں میں پہنچ چکے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۱۱ میں امریکہ نے ان کو سرکاری طور پر دہشت گرد قرار دیا اور ان کے سر کی قیمت پچیس ملین ڈالر مقرر کی۔

اب مغربی میڈیا میں ''اسلامی ریاست'' (Islamic State) کا لفظ اس بے دریغ طریقے سے استعمال ہوتا ہے کہ جیسے کوئی واقعی اسلامی ریاست وجود میں آئی ہے اور وہ ایک انتہائی غیر انسانی، غیر اخلاقی، دہشت گردی جیسی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر مغرب کے خلاف برسر پیکار ہے گویا کہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام پوری ''مہذب'' دنیا کے خلاف حالت جنگ میں ہے حالانکہ داعش کو نہ تو اقوام متحدہ اور نہ ہی کسی اسلامی ملک نے ریاست کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ طالبان کی حکومت کو کم از کم کچھ ممالک نے تو تسلیم کیا تھا۔

دہشت گردی سادہ لفظوں میں اس حکمت عملی کا نام ہے، جس کے تحت کوئی فرد اپنے کسی مقصد کی خاطر، جو جائز ہو سکتا ہے اور ناجائز بھی، ہر طرح کے قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، مسلح طریقے یا کسی اور طرح سے، لوگوں کو دہشت زدہ

کرتا ہے، ان کو خوف و ہراس میں مبتلا کرتا ہے اور اس عمل کے دوران وہ انسانی جان اور مال کے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ دہشت گردی کا مقصد خوف پھیلا کر اپنے مطالبے کو منوانا ہوتا ہے، اب اس عمل کو اپنانے والا کوئی مسلم ہو یا غیر مسلم ہر حال میں یہ عمل برا ہے۔

یہ ایک ایسا فعل ہے جسے دنیا کے کسی مہذب معاشرے میں گوارا نہیں کیا جاتا اور انسانیت متفقہ طور پر اس کی مذمت کرتی ہے۔ تاہم ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی فرد یا قوم کو اس کے کسی جائز حق سے محروم کر دیا جائے یا وہ کسی دوسری قوم کی طرف سے ظلم کا شکار ہو تو کیا وہ ظالم کے خلاف طاقت استعمال کر سکتی ہے یا کوئی ایسا طرز عمل اختیار کر سکتی ہے، جو مروجہ قوانین کے خلاف ہو؟ کیا ظالم کے خلاف اس نوعیت کی جدوجہد بھی ظلم کہلائے گی؟ آیئے ہم اس سلسلے میں اسلام کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اسلام کی ظلم کے خلاف جدوجہد:

۱۔ قرآن کریم کی تعلیمات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں انصاف پسندی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ ان کو کسی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دشمن کے خلاف بھی انصاف کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ...(14)

''جن لوگوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا، ان کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم حد سے گزر جاؤ۔''

۲۔ کلام اللہ اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ مسلح جدوجہد صرف اسی صورت میں جائز ہے جب کسی کے پاس اقتدار ہو۔ اگر کسی گروہ کے پاس اقتدار نہیں ہے تو وہ ظلم کا مقابلہ صبر کے ساتھ کرے گا نہ کہ طاقت سے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں تیرہ برس تک اقتدار نہیں ملا تو آپ نے اپنے خلاف ہونے والے مظالم پر صرف صبر کیا، کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور اگر صحابہؓ نے اس کی شکایت کی تو آپؐ نے جواباً صبر کا رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں پر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ تب یہ اجازت دی گئی کہ جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے اور جن پر ظلم ہوا ہے اور جو ناحق گھروں سے نکال دیے گئے، انہیں یہ حق ہے کہ وہ جنگ کریں۔(15)

قرآن مجید کی ان تصریحات سے چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

''کہ ظلم کے خلاف مسلمانوں کو آواز اٹھانی چاہیے، لیکن اس ظالم کے قبیلہ یا قوم میں سے کسی کے جان یا مال کو نقصان پہنچانا خود ایک ظلم ہے کیونکہ وہ ظالم کے ظلم میں شریک نہیں ہیں، اور اسلام میں اپنی برادری کی حمایت میں ظلم کا ساتھ دینے سے منع کیا گیا ہے چنانچہ حضرت واثلۃ بن اسقعؓ کی صاحبزادی سے مروی ہے کہ ان کے والد یہ فرماتے تھے: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصبیت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرے۔''(16)

حضرت سعید بن مسیبؒ نے سراقہ بن مالک بن جعشمؓ سے حدیث نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا تم میں سب سے بہترین شخص اپنے قبیلہ کا دفاع کرنے والا ہے جب تک وہ گناہ نہ کرے۔''.....(17)

فسیلہؒ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے سنا:

''میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرتا ہے کیا یہ بھی عصبیت میں سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! لیکن عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرے۔''(18)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

''ایک دیہاتی شخص نبی کریم ﷺ کے پاس اپنے قرض کا تقاضا کرنے آیا جو نبی کریم ﷺ پر تھا تو اس نے آپ ﷺ پر سختی کی یہاں تک کہ آپ ﷺ کو کہنے لگا میں آپ پر سختی کروں گا تاکہ آپ میرا قرض ادا کریں، اس پر آپ ﷺ کے صحابہؓ نے اس کو جھڑکا اور کہا: ''تو جانتا ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟'' اس دیہاتی شخص نے کہا میں اپنا حق طلب کر رہا ہوں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ حقدار کے ساتھ کیوں نہیں ہوئے؟'' پھر آپ ﷺ نے حضرت خولۃ بنت قیسؓ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ کے پاس کھجوریں ہوں تو مجھے قرض دیدیں جب ہماری کھجوریں آئیں گی تو ہم آپ کا قرض ادا کر دیں گے تو ان نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے والد قربان ہوں، ٹھیک ہے، حضرت خولہؓ نے آپ ﷺ کو قرض دیا تو آپ ﷺ نے بدو کا پورا قرض ادا کیا اور اس کو کھانا کھلایا تو اس بدو نے کہا آپ نے پورا کیا اللہ تعالیٰ آپ کے لیے پورا کریں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہی لوگ سب سے بہترین لوگ ہیں بلاشبہ کوئی ایسی امت پاکیزہ نہیں ہوسکتی جس کا کمزور مشقت میں مبتلا ہوئے بغیر اپنا حق نہ لے سکتا ہو۔''(19)

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ واضح طور پر صحابہ کرامؓ کو حقدار (مظلوم) کا ساتھ دینے کی ترغیب دے رہے ہیں حالانکہ اس شخص کا معاملہ آنحضرت ﷺ سے تھا جن کے بارے میں کبھی کسی دشمن کو بھی ادنی ناانصافی کا گمان نہیں ہوا چہ جائیکہ کسی مسلمان کو ایسا وہم ہو، لیکن نبی کریم ﷺ نے امت کی تعلیم کے لیے ایسا فرمایا کہ تمہارے سامنے جب ایسی صورت آئے تو صاحب حق کا ساتھ دینا چاہے کوئی بھی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''ایک شخص نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھے اور عرض کی اے اللہ کے رسول: میرے کچھ غلام ہیں جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں اور مجھ سے خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں، تو میں ان کو برا بھلا کہتا ہوں اور ان کو مارتا ہوں، اب میں ان سے کیسا ہوں گا؟ (میرا ان کا آخرت میں کیا معاملہ ہوگا؟) آپ علیہ السلام نے فرمایا وہ آپ سے جو خیانت اور نافرمانی اور جھوٹ بولتے ہیں اس کا اور آپ کی سزا کا حساب کیا جائے گا اگر آپ کی سزا ان کے گناہوں کے بقدر ہوئی تو یہ معاملہ برابر ہوگا نہ آپ کا نفع ہوگا اور نہ نقصان، اور اگر آپ کی سزا ان کے گناہوں سے اوپر ہوئی تو اس زائد کا آپ سے بدلہ لیا جائے گا، تو وہ شخص ایک طرف ہٹ کر بآواز رونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں پڑھتے وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّإِنْ كَانَ مِثْقَالَ (سورۃ الانبیاء آیۃ ۴۷) تو اس شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم میں ان کی جدائی سے زیادہ اپنے اور ان کے لیے کوئی چیز بہتر نہیں پاتا۔ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ سب آزاد ہیں۔(20)

اگر مسلمان کسی قوم کے ظلم کا شکار ہیں تو انہیں کسی طرح یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جواباً ظلم کا طریقہ اختیار کریں، انہیں ہر حال میں انصاف کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی قوم کی طرف سے دہشت گردی کا شکار ہیں تو وہ جواباً

دہشت گردی نہیں کر سکتے۔ انہیں بہر حال اسلامی تعلیمات کا احترام کرنا ہے۔ دہشت گردی سے مراد یہی ہے کہ اس قوم کے عام شہریوں کو نشانہ بنایا جائے، ان کی املاک تباہ کی جائیں یا ان میں خوف وہراس پھیلایا جائے۔ یہ چونکہ ناانصافی کی شکلیں ہیں، اس لیے انہیں اختیار نہیں کیا جائے گا گویا کہ کسی معصوم انسان کی جان لینے سے منع کیا گیا ہے اور صرف مخالف فوجی کے ساتھ ہی لڑائی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ نہتے کشمیری مسلمان ہندوستان کی آٹھ لاکھ فوج کے ظلم وتشدد کے خلاف نبرد آزما ہیں اور اپنے اُن حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں جس کو ہندوستان کی سابقہ حکومتوں اور اقوام متحدہ جیسے اداروں نے مختلف اوقات میں تواتر کے ساتھ تسلیم کیا ہے اس جدوجہد کو کسی بھی شکل میں دہشت گردی قرار دینا سراسر بین الاقوامی اصولوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح فلسطینی عیسائی اور مسلمان پچھلے پینسٹھ سال سے مستقل اپنے مقبوضہ علاقوں کی واگزاری کے لئے ایک مستقل جدوجہد میں مصروف ہیں۔ امریکہ کا دوریاستی فارمولا اور اُس کا روڈ میپ بری طرح ناکام ہو چکا ہے اور فلسطینیوں کے علاقوں میں اسرائیلی حکومت اقوم متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نئی بستیاں تعمیر کر کے بین الاقوامی کمیونٹی کا مذاق اُڑا رہی ہے۔

اگر مسلمان کہیں ظلم کا شکار ہیں اور ان کے پاس اقتدار نہیں ہے تو ان کے پاس واحد راستہ صبر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ استقامت وحکمت عملی ودوراندیشی سے اپنے خلاف ہونے والے مظالم کا مقابلہ کریں۔ صبر دراصل ایک حکمت عملی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ بہتری کی صورت پیدا کر دے۔ جیسے رسول اللہ نے تیرہ برس صبر کیا اور پھر اس کا صلہ یہ ملا کہ انہیں مدینہ کا اقتدار مل گیا جہاں آپ کو اپنی طاقت منظم کرنے کا موقع مل گیا اور پھر وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ ظلم کا جواب طاقت سے دے سکیں۔

جن مسلمانوں کے پاس طاقت نہیں ہے یعنی ان کو اقتدار حاصل نہیں تو ایک طاقتور فوج کے خلاف جو جدید ہتھیاروں سے لیس ہو مقابلے کے لئے عام ہتھیار استعمال کر کے اپنے ساتھیوں کو مروانا صحیح حکمت عملی نہیں ہوگی اگر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو اس کی اجازت دی جائے تو اس سے لازماً انتشار پیدا ہوتا ہے اور حالات مزید خراب ہوتے ہیں لہٰذا عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صورت حال پیدا نہ ہو جو ظلم کے مزید دروازے کھول دے۔ بلکہ مسلمانوں کو بہتر حکمت عملی اپنانی چاہیے جس سے اپنی قوت مزید بڑھا کر ظالم کے ظلم کا سدباب کر سکیں۔

اگر مسلمان حکمران اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہیں، یعنی انہیں کہیں جہاد کرنا چاہیے اور وہ نہیں کر رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ انہیں اس جانب متوجہ کیا جائے نہ کہ ان کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے جائیں۔ مثال کے طور پر قانون کا نفاذ ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے لیکن اگر کہیں حکمران اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ نفاذ قانون کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ اگر کوئی فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر چور کا ہاتھ کاٹ دے یا زانی کو سنگسار کرنا شروع دے یا ملکی یا غیر ملکی لوگوں کے خلاف ''جہاد'' کرنا شروع کر دے تو اُس سے افراتفری بھی پھیلے گی اور اقوامِ عالم کے سامنے جگ ہنسائی کے علاوہ کچھ نہ ملے گا یہ کام بہر حال حکومت کو کرنا ہے اور عام آدمی یا جماعت انہیں اس جانب متوجہ کر سکتے ہیں۔

دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اسلامی احکام:

ان تعلیمات کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دہشت گردی جیسے غیر انسانی فعل کا اسلام کی

اعلیٰ اور ارفع تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ طاقت کے ہوتے ہوئے بھی عفو اور درگزر کو ترجیح دیتا ہے۔ جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اس کا عملی مظاہرہ کیا۔ جب مسلمانوں میں سے کسی فرد نے نعرہ لگایا کہ ''آج کا دن بدلے کا دن ہے'' تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی اصلاح کی اور فرمایا کہ ''آج کا دن رحم کا دن ہے''(21)

تاہم انسانی زندگی میں اس کا موقع کبھی آجاتا ہے کہ طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، چنانچہ اللہ کے قانون میں اس کی اجازت دی گئی ہے لیکن انہیں چند حدود میں مقید کر دیا گیا ہے، جن کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی فرد یا گروہ ایسی حکمت عملی اختیار کرتا ہے جو اسلام کی ان تعلیمات کے خلاف ہے تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے۔ جو لوگ دانستہ یا نادانستہ انہیں اسلام سے منسوب کرتے ہیں، وہ دراصل انصاف نہیں کر رہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے اسلام اور دہشت گردی کو منظم انداز میں ہم معنی قرار دیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے مغربی ممالک میں کچھ زیادہ ہی پھرتیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ جہاں اسلامی تعلیمات سے مغربی اقوام کی لاعلمی ہے وہاں ہمارے چند نام نہاد مذہبی گروہوں کے رویوں اور حکمت عملیوں کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ کیونکہ ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت پہلے خود ہی جہاد کو ایک مخصوص شکل میں ایک مخصوص گروہ کے ذریعے متعارف کرایا گیا اور اب اس کو دہشت گردی سے منسلک کر کے اسلام اور مسلمانوں کی تضحیک شروع کر دی گئی۔

اقوام عالم اس وقت سب سے زیادہ خوف زدہ اور دہشت گردی سے متاثر ہیں۔ یہ چاہے افراد کی طرف سے ہو یا ریاست کی طرف سے ہو، اور اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں تعصب کی عینک اتارنی ہوگی کیونکہ ہم اس کے اسباب کو جاننے کے لیے کسی ایک طرف کا ہو کر اپنی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ بہت زیادہ پیچھے جانے کے بجائے پچھلے ایک سو سالہ تاریخ میں اس عمل کو دیکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان آج دنیا میں ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہیں۔ فلسطین، کشمیر اور دوسرے خطوں میں انہیں ان کے جائز حقوق حاصل نہیں۔ ایسی صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر وہاں کے کچھ گروہوں نے ان حالات کے جواب میں طاقت کے استعمال کا طریقہ اپنایا ہے جس پر کچھ عرصہ سے عمل درآمد جاری ہے۔ اس طریقہ کار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ مشہور فلسطینی محقق ایڈورڈ سعید کے مطابق آج ایک اسرائیلی مرتا ہے تو اس کے مقابلے میں پانچ مسلمانوں کی جان جاتی ہے۔ بلکہ انفراسٹرکچر کی تباہی سے لوگ بھوک افلاس اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور وہ زندہ لاشیں بن چکی ہیں جس کی وجہ سے انتہا پسند رویوں میں مزید تیزی آئی ہے۔ جس سے وہ مزید انتہا پسندی کی طرف بڑھے ہیں۔ یہاں میرا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ آزادی کی جدوجہد کو روک دیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر حکمت عملی تبدیل کی جائے۔ میں نے کئی جید علما سے گفتگو کی تو اُن کی رائے میں حماس کی طرف سے غزہ میں بیٹھ کر اسرائیل پر چھوٹے چھوٹے سیکڑوں راکٹ پھینکنے سے اسرائیل کا ایک بھی شہری نہیں مرتا جبکہ اُسکے ردِعمل میں اسرائیلی ٹینک اور جنگی جہاز پورے غزہ کا انفراسٹرکچر بشمول ہسپتال اور سکول تباہ کر دیتے ہیں۔ پانی اور بجلی کی سپلائی منقطع ہو جاتی ہے اور مہینوں سویلین لوگ اس بنیادی سہولت سے محروم رہتے ہیں۔ اور نفسیاتی طور پر عوام انتہا پسند رویوں کی طرف مائل ہوتی ہیں جس کے متعلق اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے اِدارے چیختے

رہتے ہیں کہ اِسرائیلی فوج طاقت کا بے دریغ اور غیر قانونی استعمال کر رہی ہے جس سے بچے اور خواتین ناحق قتل ہو رہے ہیں لیکن اسرائیلی حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی ابھی حال ہی میں سیکورٹی کونسل نے اسرائیل کے خلاف مقبوضہ فلسطین میں نئی بستیوں کی تعمیر کے متعلق ایک قرارداد پاس کی جسے پہلی دفعہ امریکہ اور برطانیہ نے بھی ویٹو نہیں کیا یہ قرارداد برازیل کی طرف سے پیش کی گئی اس پر اسرائیل نے اپنے پورے سفارت خانے کے عملے کو واپس بلا لیا یہ ہوتا ہے زندہ قوموں کا ردِعمل اور اِس پر طرہ یہ کہ اسرائیلی وزیراعظم ''نیتن یاہو'' نے نئے پچیس سو مکانات بنانے کا اعلان کر دیا اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ یا امریکہ سمیت دوسرے مغربی ممالک کیا اسرائیل پر بھی یہ قرارداد اسی طرح سے لاگو کریں گے۔ جس طرح عراق جیسے اسلامی ممالک کے خلاف یکطرفہ کارروائی میں ہوئی؟ نئے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ (جس کے بچے یا تو یہودی ہو گئے ہیں یا یہودیوں کے ساتھ شادیاں کر لی ہیں) کی ہٹ دھرمی کا اندازہ لگائیے کہ اُس نے امریکی سفارت خانہ تل ابیب کی بجائے یروشلم میں منتقل کرنے کا اعلان کر دیا ہے، اسی طرح کشمیر میں شہدا کی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے اور دیگر نقصانات کی تفصیل اس کے علاوہ ہے۔ لہٰذا اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان حکمت عملیوں کا جائزہ لیا جائے اور ان کے فوائد اور نقصانات کا اندازہ لگا کر اصلاح احوال کے لیے اقدامات کئے جائیں۔

آج کی تصویر:

دہشت گردی عصر حاضر میں جنم لینے والا ایک ایسا تصور ہے جس نے اس وقت ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور جس سے فی الواقع سارا زمانہ دہشت زدہ ہے۔ اس عہد میں اسے انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ آج ساری دنیا کو اگر کسی جرم سے پناہ مانگنی چاہیے تو وہ دہشت گردی ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف عالمی اتحاد قائم کئے جا رہے ہیں اور کم وبیش تمام ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دنیا اس کا حصہ ہے۔ دہشت گردی سے معاشرتی امن جس طرح تباہ ہوتا ہے۔ وہ جنگوں سے بھی زیادہ ہے۔

پاکستان کی مثال سامنے ہے۔ مسلمان معاشرہ ہونے کے باوجود دہشت گردی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات سے روگردانی روز کا معمول ہے۔ یہاں آئے دن دھماکے اور قتل کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہسپتالوں، سکولوں، یونیورسٹیوں، دفاتر، پولیس اور فوج کے مراکز، مساجد، مزارات، امام بارگاہوں، گرجا گھروں اور بازاروں کی خون سے آلودہ دیواروں کی تصاویر آئے دن میڈیا میں دکھائی جاتی ہیں۔ عبادت گاہوں کو یا سکیورٹی کے اداروں کو نشانہ بنا کر اور معصوم لوگوں کی قتل وغارت گری کر کے اسلام یا پاکستان کی کونسی خدمت کی جا رہی ہے خصوصی طور پر اقلیتوں کی عبادت گاہوں کا تحفظ نہ صرف ریاست کی ذمہ داری ہے بلکہ مسلمانوں کی قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کیونکہ اقلیتیں بھی اتنی ہی محب وطن پاکستانی ہیں جتنے دوسرے لوگ۔ لہٰذا حکومت اور علما کرام کو چاہیے کہ عوام میں احساس ذمہ داری پیدا کریں اور ہمیں یہ بھی چاہیے کہ اقلیتی رہنماؤں سے مل کر اُن کا اعتماد بحال کریں وگرنہ بین الاقوامی سٹیج پر ہم خود ہی پاکستان کی جگ ہنسائی کا موقع فراہم کریں گے یاد رہے کہ میں کئی ایسے اقلیتی لوگوں کو جانتا ہوں جو برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں جا کر سیاسی پناہ لینے کے لئے ایسے واقعات کا سہارا لیتے ہیں اور اپنا مطلب نکالتے ہیں جب کہ اقلیتی برادری کے دہشت گردی سے حقیقی طور پر متاثرہ لوگ اُسی محبت اور سرشاری سے پاکستان کی محبت میں باہر کا رُخ نہیں کرتے۔ اگر ہم پچھلے ایک سال پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مختلف مسالک اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے بہت سارے اہل علم،

علمائے کرام، ڈاکٹرز، انجینئرز، وکلاء، سیاست دان، بوڑھے، بچے، نوجوان اور خواتین اس لعنت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ تاریک راہوں میں مرنے والے یہ سب اسی قوم کے افراد تھے۔

دہشت گردی سے معاشرے کی نفسیات پر جو اثرات پڑتے ہیں اور لوگ جس طرح خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس لیے اس دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثر بھی وہی ہوتے ہیں۔ چونکہ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس لیے جب بم دھماکہ ہوتا ہے یا کوئی دہشت گرد پورے بازار میں گولیاں برساتا ہے تو اس کی زد میں ہر شخص آجاتا ہے۔ اب جس معاشرے میں جس مذہب کے ماننے والے زیادہ ہوں گے، وہی زیادہ نشانہ بنیں گے۔ یوں پوری قوم کی Persecution ہو رہی ہے۔

گزشتہ ماہ و سال میں آزادی کی تحریکوں اور مسلمانوں کے بعض گروہوں نے عسکری حکمت عملی کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کو ترجیح دی ہے جس سے بدقسمتی سے اسلام اور دہشت گردی کے درمیان مختلف حوالوں سے ایک تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس لیے آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلام کے حوالے سے پھیلنے والے اس تاثر کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے اور اس بے بنیاد پروپیگنڈے کی نفی معاشرتی سطح پر عملی اقدامات اٹھا کر کی جائے، جس سے اسلام کو اس عالمی جرم کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں یہ بنیادی بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کسی فرد یا گروہ کے طرز عمل کا نام نہیں بلکہ قرآن وسنت کی تعلیمات کا نام ہے۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص مسلمان ہو کر کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کی قرآن وسنت میں اجازت نہیں تو اس کا یہ فعل اسلام نہیں قرار پائے گا۔ اسلام کو جاننے کے لیے ہمیں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس کی تعلیمات ہی سے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وضاحت کے بعد ہم دہشت گردی اور اسلام کے بارے میں فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بے تکی بات ہے کہ اگر کوئی امریکی چوری کرے، قتل کرے یا نسلی منافرت کا کام کرے تو ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ تمام امریکی عوام چوری، قتل یا نسلی تعصب کو درست سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسلام کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنا سراسر ناانصافی اور متعصّبانہ فعل ہے۔

دہشت گردی پر کلام آخر:

آج مسلمانوں کو جس مشکل کا سامنا ہے، اس سے نکلنے کا راستہ باہر کی دنیا میں تلاش کرنے کے بجائے اپنے اندر ڈھونڈنا چاہیے۔ ہمیں آج مل کر یہ جدوجہد کرنا چاہیے کہ عالمی سطح پر مسلمان اور دہشت گردی کو ہم معنی قرار دینے کی جو مہم جاری ہے اس کا کس طرح خاتمہ ہو۔ اس کے لیے ایک طرف یہ ضروری ہے:

☆ ان گروہوں سے لاتعلقی کا اعلان کیا جائے جو دہشت گردی کے مروجہ طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

☆ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ کشمیر اور فلسطین سمیت تمام مسائل پر امن طور پر حل ہو جائیں، جس کے لیے پر امن جدوجہد کو یقینی بنانا چاہیے۔ ہمارے مغربی دوستوں کو چاہیے کہ وہ بھی کشمیر اور فلسطین سے متعلق ''حقوقِ انسانی سے متعلق دوہرے معیار پر نظر ثانی کریں اور ان مسائل کا ہنگامی بنیادوں پر کشمیریوں اور فلسطینیوں کی مرضی کے مطابق ایسا ہی حل نکال کر دیں جس طرح مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کے لوگوں کیلئے نکالا گیا۔

ساتواں باب

مغرب کا تصورِ جہاد اور حقیقتِ جہاد

یورپ اور امریکہ میں کوئی ایسا ٹی وی چینل یا اخبار نہیں جہاں مسلمانوں سے متعلق اکثر Islamic Jihadist (اسلامی جہادی) اور Islamic Extremist (اسلامی انتہاپسند) اور Islamic Terrorist (اسلامی دہشت گرد) جیسی اصطلاحات استعمال نہ ہوتی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات انتہائی سنجیدہ قسم کے سیاست دان بھی اس رو میں بہہ جاتے ہیں اور دہشت گردی کو جہاد اور اسلام سے جوڑ دیتے ہیں۔ جس کے مغربی سوسائٹی پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص منفی اور نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر امریکہ کے کسی سینما یا سکول پر حملے سے معصوم انسانوں کی قتل و غارت گری کی خبر آئے تو کئی مسلمان مائیں مصلے پر دعائیں مانگنے بیٹھ جاتی ہیں کہ اللہ کرے یہ حملہ آور مسلمان نہ ہو۔ اور کئی لوگ تو نوافل بھی مان لیتے ہیں صرف اس لیے کہ حملہ آور کا تعلق اگر اسلام سے ہوا تو میڈیا مسلمانوں اور اسلام کی تضحیک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ جس سے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس مزید بڑھتا ہے، انتہائی حیران کن بات یہ ہے کہ اگر حملہ آور غیر مسلم اور گورا ہو تو اُس کی شناخت، رنگ و نسل یا مذہب کا میڈیا میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس حملہ آور کو نفسیاتی مریض کہہ کر جان چھڑا دی جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اگر وہی حملہ آور مسلمان ہو تو اُس کی انفرادی شناخت کے علاوہ اُس کے پورے خاندان، مسجد، سکول، امام وغیرہ کی تفصیلات میڈیا میں فوراً آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اسلام اور جہاد کے ساتھ اس عمل کے تعلق کو انتہائی زور و شور سے جوڑا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اگر وہ حملہ آور پاکستانی ہو تو پاکستانی میڈیا مغربی میڈیا سے دس قدم آگے بڑھ کے ''شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار'' کے مصداق غیر ذمہ دارانہ رویہ اپناتے ہوئے ایسی بے ہودہ قسم کی تفصیلات مہیا کریں گے جس سے پاکستان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور سات جولائی ۲۰۰۵ء لندن کے خودکش حملوں کے مناظر بڑھا چڑھا کر بیان کیے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کا خوف اور منفی تاثر تازہ رہے، اور اکثر و بیشتر اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ''ملا اور مدرسہ'' ہی جہاد کے نام پر یہ فساد پھیلا رہے ہیں۔ جبکہ جتنے بھی دہشت گردی کے واقعات برطانیہ میں ہوئے ان میں کوئی بھی مدرسہ کا طالب علم تھا اور نہ ہی کوئی طالب علم تھا۔ ایک اور لمحہ فکریہ یہ ہے کہ شام سے متعلق مغرب کی خارجہ پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوگئی ہے، صدر اوباما ہوں یا وزیر اعظم کیمرون ہوں ان کے بیانات ریکارڈ پر ہیں کہ انہیں بشار الاسد مخالف عناصر کی مدد کرنی چاہیے، اور انہوں نے مدد کی جو کہ بعد میں داعش کی شکل میں دیکھی گئی، برطانیہ سے کئی لوگ اس ''مقدس فریضہ'' کی ادائیگی کے لیے شام پہنچے کیونکہ برطانوی حکومت بشار الاسد کی حکومت کو ہر حال میں گرانا چاہتی تھی۔ اب اگر کوئی برطانوی مسلمان برطانوی حکومت کی ''بشار الاسد مخالف'' پالیسیوں سے متاثر ہو کر شام میں جاتا ہے اور اسد حکومت کو گرانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے تو حکومت اُس کو جہادی سمجھ کر سزا دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی برطانوی غیر مسلم شام میں جا کر کُردوں کے ساتھ مل کر اُس غیر قانونی لڑائی میں شریک ہوتا ہے تو حکومت کی طرف سے اُس کے خلاف کوئی اقدام نہیں اٹھایا جاتا اور مزید ظلم یہ کہ برطانوی عوام

ایسے اشخاص کو ہیرو کے طور پر پیش کرتی ہے اور اس دوہرے معیار کی وجہ سے مسلم کمیونٹی کے اندر ایک عجیب وغریب اضطراب اور احساسِ کمتری ومحرومی پیدا ہوتا ہے۔

اس لیے میں نے یہ ضروری جانا کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ مغرب نے جہاد کی اصطلاح کو ایک ''مقدس'' فرض کے طور پر اپنی عوام کے سامنے کیسے پیش کیا؟ اور اس ''کارِ خیر'' میں انہوں نے کس طرح اور کتنا حصہ ڈالا؟ اگر چہ یہ ہمارا اصل موضوع نہیں لیکن بہر حال مغربی رہنماؤں کے کچھ بیانات اور تصاویر قارئی کے سامنے رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد جہاد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کیا جائے گا۔ تاکہ حقیقت حال سامنے آئے لہٰذا درج ذیل سطور میں مندرجہ بالا پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے جہاد کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی ایک کاوش کی گئی ہے۔

مغرب کا جہاد جیسے ''کارِ خیر'' میں حصہ:

افغانستان میں روسی حملے کے توڑ کے لئے سی آئی اے کی سربراہی میں جو انٹرنیشنل الائنس بنا جس میں پاکستان کی آئی ایس آئی بھی شامل تھی نے لفظ ''جہاد'' کو نا صرف مسلم ممالک (بشمول پاکستان اور سعودی عریبیہ) بلکہ مغربی ممالک میں بھی میڈیا کو ایک مستقل ٹاسک دی گئی کہ جہاد کو ایک مثبت عمل اور کارِ خیر کے طور پر پیش کیا جائے اور مجاہدین کو ہیروز کے طور پر عوام کے سامنے لایا جائے۔ اُس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق مرحوم کی فوجی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی مدارس کے طلبہ کو سیاسی ریلیوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی، کجا یہ کہ وہ AK47 کلاشنکوف اور سٹنگر میزائل اُٹھا کر باقاعدہ کسی دوسرے ملک کی جنگ میں شریک ہوں۔ سی آئی اے کی سربراہی میں افغان مجاہدین کے لئے کیمپ بنائے گئے اور مخصوص سوچ کو پروان چڑھانے کے لئے ٹریننگ کیمپ قائم کئے گئے (یہ یاد رہے کہ میری قطعاً نہ یہ سوچ ہے اور نہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اس ''انٹرنیشنل جہاد'' کا صرف مغرب یا امریکہ کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جائے بلکہ ہم سب اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر شریک تھے، ہاں البتہ اب حکومتی ادارے اور مدارس مل کر اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ اس خطے میں القاعدہ کا باب بند کر دیا گیا ہے اور مشرق وسطیٰ میں داعش کے نام سے ایک نئے باب کو کھولا گیا ہے) جس کو سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی بیوی سینیٹر ہلری کلنٹن (جو کہ صدر اوبامہ کی حکومت میں امریکی وزیر خارجہ بھی رہیں اور بعد میں ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں صدارتی امیدوار بھی رہیں) کا حسب ذیل بیان Youtube پر بہ آسانی دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔:

"We also have a history of kind of moving in and out of Pakistan. I mean, let's remember here: the people we are fighting today we funded 20 years ago. And we did it because we were locked in this struggle with the Soviet Union. They invaded Afghanistan, and we did not want to see them control Central Asia, and we went to work, and it was President Reagan, in partnership with the Congress, led by Democrats, who said, "You know what? Sounds like a pretty good idea! Let's deal with the ISI and the Pakistani military, and let's go recruit these Mujahidin! That's great! Let's get some to come from Saudi Arabia and other places, importing their Wahhabi brand of Islam, so that we can go beat the Soviet Union!" And guess what? They retreated, they lost billions of dollars, and it led to the collapse of the

Soviet Union. So there's a very strong argument which is: It wasn't a bad investment to end the Soviet Union but let's be careful what we sow because we will harvest. So we then left Pakistan. We said, "OK, fine. You deal with the Stingers that we've left all over your country. You deal with the mines that are along the border. And by the way, we don't want to have anything to do with you. In fact, we're sanctioning you."

ترجمہ: پاکستان کے معاملے میں ہماری تاریخ غیر سنجیدہ ہے، میرا مطلب ہے کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آج ہم جن لوگوں (مجاہدین) کے خلاف لڑ رہے ہیں ہم نے ہی اُن کو بیس سال پہلے فنڈ کیا تھا اور ہم نے اُن کو اس لئے بنایا تھا کہ ہم روس کے ساتھ دست و گریبان تھے۔ روس نے افغانستان پر قبضہ کیا اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ وسطی ایشیا کو کنٹرول کرے، تو صدر ریگن نے ڈیموکریٹک پارٹی کی رہنمائی اور کانگریس کی پارٹنرشپ میں اس کام (جہاد) کو شروع کر دیا۔ (گویا کہ پوری حکومتی مشینری اس ''مقدس'' کام میں شریک تھی) اور کہا کہ یہ ایک بہت اچھا آئیڈیا ہے کہ ہم آئی ایس آئی اور پاکستانی فوج کے ساتھ ڈیل کریں اور مجاہدین کو ریکروٹ کریں یہ بہت اچھی بات ہے کہ کچھ (مجاہدین) لوگ سعودی عربیہ اور دوسری جگہوں سے آئیں اور وہابی اسلام کو امپورٹ کریں تا کہ ہم سوویت یونین کو شکست دے سکیں۔ اور آپ اندازہ کریں کہ روسی کھربوں ڈالرز کا نقصان کر کے شکست سے دوچار ہوئے اور سوویت یونین کا خاتمہ ہو گیا۔ تو یہ ایک انتہائی وزنی دلیل ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے کے لئے ہماری انوسٹمنٹ بری نہیں تھی۔ لیکن ہمیں محتاط رہنا ہوگا کہ ہم جو بیج لگائیں گے فصل بھی اُسی کی کاٹیں گے اس کے بعد ہم پاکستان سے نکل آئے اور ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ اُن سٹنگر میزائلوں سے ڈیل کرو جو ہم نے آپ کے ملک (پاکستان) میں چھوڑے ہیں۔ آپ اُن (تباہ کن) مائنز کے ساتھ ڈیل کرو جو ہم نے پورے بارڈر پر نصب کی ہوئی ہیں اور ہاں اب ہمارا آپ سے کوئی سروکار نہیں (یعنی جو بدامنی پاکستان میں اسلحے کی بھرمار کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے) بلکہ ہم آپ پر پابندیاں لگا رہے ہیں۔''

تاریخ گواہ ہے کہ اُس وقت کے مجاہدین (جن کے متعلق ہم نے ہلری کلنٹن کے بیان کو اوپر نقل کیا ہے) جن میں پروفیسر برہان الدین ربانی اور مولانا جلال الدین حقانی وغیرہم کو اُس وقت کے امریکی صدر رونلڈ ریگن بھی وائٹ ہاؤس میں خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں۔ اور ایک عرصہ تک مجاہدین کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ صدر ریگن سے منسوب ہوتے رہے۔ اگرچہ بعد میں امریکی انتظامیہ اس سے منحرف ہو گئی۔

"these gentlemen (Mujahidin) were the moral equivalents of the American forefathers".

''کہ یہ شرفاء (مجاہدین) اخلاقی طور پر ہمارے امریکی آباء واجداد کے برابر کے لوگ ہیں''۔

بلکہ انہوں نے امریکی سپیس شٹل کولمبیا II کو افغان آزادی کے متوالوں کے نام سے "The Mujahidin" کہہ کر موسوم کیا۔

مزید یہ کہ جیمز بانڈ زبھی اس مقدس فریضہ کو انجام دیئے بغیر نہ رہ سکے اور جہاد کو اجاگر کرنے کیلئے ایک بلاک بسٹر فلم "The living Daylights" بنا ڈالی تا کہ عوام پر مجاہدین کا نفسیاتی طور پر مثبت اثر پڑے۔ اور امریکی فلم "Rambo III" کو افغان مجاہدین کے نام منسوب کیا۔ (اگرچہ بعد میں اس فلم سے لفظ ''مجاہدین'' ہٹا دیا گیا۔)

برطانوی اخبار نے تو اُسامہ بن لادن کو ہیرو کے طور پر "Anti-Soviet Warrior" پیش کیا۔

خدا کی شان دیکھیں کہ وقت نے کیسی کروٹ لی۔ وہی شخص جو کہ سی آئی اے کی آنکھ کا تارا اور اُن کا تیار کردہ ''مجاہد'' Warrior تھا، اُن کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور مطلوب دہشت گرد بن جاتا ہے اور پھر آگے ایبٹ آباد میں اس باب کو بند کر کے داعش کی شکل میں نیا باب کھول دیا جاتا ہے۔ اس کے اداکاروں میں تو کچھ ردو بدل کیا گیا ہے لیکن کہانی کا سکرپٹ بالکل وہی ہے۔

جہاد کی حقیقت:

ہم گذشتہ صفحات میں یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ مذہب اسلام کا تو مادہ ہی امن وسلامتی ہے تو یہ فساد کا سبب کیسے بن سکتا ہے یا فساد کو برداشت کیسے کر سکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ''ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اس لیے آیت مبارکہ میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ ﷺ کو انسانوں کے لیے یا صرف مسلمانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمام جہانوں کے لیے آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اور مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسلام نے انسانوں کے ساتھ جانوروں کے حقوق کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی رحمت اور اسلام کے امن کا دائرہ پوری کائنات پر محیط ہے۔ ہم جانوروں کے حقوق کے بارے میں کچھ احادیث نقل کرتے ہیں تاکہ: ع

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دِل جلا کے سرعام رکھ دیا

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو ان پر صحیح طریقہ سے سوار ہو اور ان کو اچھے طریقہ سے چھوڑو۔۔۔(1)

اور محسن کائنات ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم اپنے چوپایوں کی پشتوں کو منبر نہ بناؤ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے تابع کیا ہے تاکہ تمہیں ان شہروں تک پہنچا دیں جن تک تم اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے اور تمہارے لیے زمین بنائی تو تم اپنی حاجات اسی (زمین) پر پوری کیا کرو۔''(2)

یعنی اگر سواری پر سوار ہونے کی حالت میں لمبی بات چیت کی نوبت آجائے تو اس سواری سے اتر کر زمین پر ٹھہر کر بات چیت کرلو۔ اور سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: تم کسی جاندار چیز کو ہدف (تختہ مشق) نہ بناؤ۔(3)

یہ تو جانداروں کے حقوق کا ادنی سا نمونہ ہے اسلام نے تو جانداروں کے نفع کی اشیاء کو بھی ضائع کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن حبیشؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے بیری کے درخت کو کاٹا اللہ تعالیٰ جہنم میں اس کا سر پست کر دیں گے۔'' امام ابوداؤدؒ سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا گیا تو فرمایا یہ حدیث مختصر ہے یعنی جس شخص نے جنگل میں موجود ایسا بیری کا درخت ظلماً کاٹ دیا جس کا سایہ مسافر اور مویشی حاصل کرتے ہوں اس (کاٹنے والے) کا اس میں کوئی حق نہ تھا تو اللہ تعالیٰ اس کا سر جہنم میں جھکائیں گے۔(4)

قارئین کرام جس مذہب نے جانوروں کے حقوق کا اتنا خیال کیا ہے اس کے بارے میں یہ تصور پیش کرنا کہ وہ مذہب

انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کو جائز سمجھتا ہے یہ تصور پیش کرنا حماقت اور اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم آئندہ صفحات میں یہ بات تفصیل سے عرض کریں گے کہ روس کی افغانستان میں مداخلت سے پہلے دنیا اسلامی جہاد کے تصور سے ناواقف تھی روس کی مداخلت کے بعد بعض داخلی وخارجی عناصر نے اپنے خاص مقاصد کے حصول کے لیے ''اسلامی جہاد'' کا سہارا لینے کے لیے اس کا مخصوص تصور پیش کیا اور جو ''مجاہدین'' امریکی صدر رونالڈ ریگن اور برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کی آنکھوں کے تارے تھے آج انہی مجاہدین کو فتنہ اور دہشت گردی کا سبب قرار دیدیا گیا ہے، اور اسی ''اسلامی جہاد'' کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے اسباب وعوامل پر گفتگو تو کتاب میں کئی جگہ تفصیل سے ہوگی لیکن یہاں یہ بات عرض کرنی ہے کہ قارئین کرام اقوام عالم اس بات پر متفق ہیں کہ فتنہ وفساد کو ختم کرنے کے لیے اگر کوئی اور صورت ممکن نہ ہو تو جنگ کو اپنانا جائز ہے۔ لیکن لحہ فکریہ یہ ہے کہ لیبیا، عراق اور شام میں نہ تو کوئی دہشت گرد تنظیم (القاعدہ، داعش وغیرہ) موجود تھی اور نہ ہی کوئی ایسا فتنہ وفساد تھا کہ ان پر حملہ کر کے انفراسٹرکچر کو مکمل طور پر تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ عملی طور پر ان لڑائیوں کے بعد خطے میں بدامنی، دہشت گردی، لاقانونیت اور فساد میں اضافہ ہی ہوا ہے، اور دنیا مزید غیر محفوظ ہوگئی ہے۔ اور مزید برآں لاکھوں معصوم جانوں کا نقصان اور اربوں ڈالر کا مالی نقصان کون اور کہاں سے پورا کرے گا؟ اب عام مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم یورپی باشندے بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کے علمبردار اور دنیا کے ''مہذب'' ممالک عوام کو قذافی، صدام حسین اور بشار الاسد کے ''مظالم'' سے نجات دلانے کے لیے یہ ''نیک کام'' بڑے اہتمام سے کر رہے ہیں، اسی ظلم اور دہشت گردی سے نجات ہی وہ عمل ہے جسے اسلام نے جہاد کہا اور جائز قرار دیا تو اس پر اتنا واویلا کیوں؟؟؟ اسلام نے جہاد کے بارے میں حدود وقیود کے ساتھ ایسے سخت احکام نازل کیے ہیں جن سے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہوتا ہے بلکہ اسلام کے آنے سے پہلے دنیا میں جو خون ریزی جاری تھی وہ بھی ختم ہوگئی، چنانچہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے دو بڑے قبیلے آباد تھے (۱) بنو قریظہ (۲) بنو نضیر، ان قبائل کی ساری قوت دوسرے قبائل اوس وخزرج کو نیچا دکھانے میں صرف ہو رہی تھی تو اللہ تعالی نے ان کی تنبیہ کے لیے یہ آیت نازل کی:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (5)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا تھا کہ جس نے جان کے بغیر یا زمین میں فساد برپا کرنے کے بغیر کسی نفس کو قتل کیا تو اس (کا گناہ ایسے ہے) جیسے اس نے سارے لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک نفس کو (قتل نہ کر کے) زندہ کیا تو یہ (ثواب میں) ایسے ہے اس نے سارے لوگوں کو زندہ کیا۔''(6)

اس آیت مبارکہ میں یہود کے قبائل کو انسانی جان کی اہمیت بتائی گئی کہ ناحق کسی ایک انسان کو قتل کرنا ساری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر ہے اور کسی ایک انسان کی زندگی کا تحفظ ساری انسانیت کی زندگی کا تحفظ ہے۔ اور یہ حکم تورات میں بھی تھا تو تم اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟

اس آیت مبارکہ سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے تو پہلے سے جاری خون ریزی کا سد باب کیا ہے نہ کہ اس کو ہوا دے کر بھڑکایا ہے۔

دوسری آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (7)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔''

اس آیت میں واضح کر دیا گیا کہ انسانوں کو آپس میں جغرافیائی، لسانی، قومی، یا نسلی اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ فضیلت کا مدار تقوی ہے۔ اب اس آیت میں تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے کہ تم جو رنگ و نسل (سیاہ فام، سفید فام ہونے) کی وجہ سے ایک دوسرے کو نفرت وحقارت سے دیکھتے ہو، تمہارا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ تم سب ایک ہی مرد وعورت کی اولاد ہو اور مسلمانوں کے لیے یہ بھی پیغام ہے کہ تمہیں برتری صرف ایمان وتقوی کی وجہ سے حاصل ہے ورنہ بنیادی انسانی حقوق میں مسلم وغیر مسلم یکساں ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے فتنہ، فساد اور خون ریزی کی مکمل روک تھام کے لیے احکام جاری کیے ہیں اور جہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے وہ بھی ظلم وفتنہ کو ختم کرنے کے لیے دی گئی ہے اور اس میں بھی ایسے احکامات دیئے ہیں جن سے پہلے سے جاری ظلم وفساد ختم ہوگا ایک نیا سلسلہ شروع نہیں ہوگا۔ اور ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ظلم وفتنہ کو ختم کرنے کے لیے اقوام عالم بھی جنگ کو ضروری سمجھتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اقوام عالم نے جب بھی فتنہ ختم کرنے کے لیے جنگ کی اس کے نتیجہ میں فتنہ وفساد میں اضافہ ہی ہوا ہے اور اکثر فتنہ کی سرکوبی کا نام لے کر اپنے خفیہ مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہے اس طرح کے تمام مذموم مقاصد کی اسلام نے ہمیشہ حوصلہ شکنی کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے جہاد کو ''اعلاء کلمۃ اللہ'' اور عدل وانصاف قائم کرنے، اور بندوں کو، مخلوق کی بندگی سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف لانے، اور دفاع کے لیے مشروع اور جائز کیا ہے۔

جس وقت دنیا میں اسلام آیا، اس وقت دنیا کے طول وعرض میں، کسی ضابطے کی قید، جنگ کے کسی سبب کے بغیر صرف دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے لڑائی کی آگ چاروں طرف روشن تھی۔ بلاشبہ اسلام کو اس میدان میں سبقت حاصل ہے کہ جنگ کے لیے ایک واضح ضابطہ اخلاق جاری کیا، جس سے جنگوں کو متعین قوانین کے تحت لانے کیلئے ایسا دنیاوی نظم قائم ہوا، جو اس کو لاقانونیت سے نکال کر ایک منظم جائز مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔

مقصد جہاد:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

''ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ اللہ کے راستے میں قتال کیا ہے؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصہ کی وجہ سے قتال کرتا ہے، اور کوئی (قبیلہ اور قوم کی) حمیت میں قتال کرتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا، راوی کہتے ہیں کہ وہ شخص کھڑا تھا اس وجہ سے سر اٹھایا، اور ارشاد فرمایا:

جو شخص اس لئے قتال کرے تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ دنیا میں بلند ہو، وہ شخص فی سبیل اللہ قتال کرنے والا ہے۔''(8)

اور دوسری حدیث میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

''ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ ایک شخص اس لئے جنگ کرتا ہے تا کہ اس کو مال غنیمت حاصل ہو، ایک شخص شہرت حاصل کرنے کے لئے قتال کرتا ہے، ایک شخص عزت کیلئے قتال کرتا ہے، ان میں سے کون اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے؟ جواب میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس لئے قتال کرے تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ دنیا میں بلند ہو، وہ شخص فی سبیل اللہ قتال کرنے والا ہے۔''(9)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! ایک شخص اللہ کے راستے میں جہاد کا ارادہ کرتا ہے، اور وہ اس کے ذریعہ دنیا کا ساز وسامان حاصل کرنا چاہتا ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کو کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔''(10)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں صرف وہی جنگ جائز ہے جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو، اور اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہو۔ اگر کسی جنگ کا مقصد وطنی یا لسانی عصبیت یا مال ودولت کا حصول یا کوئی اور دنیاوی مقصد ہو تو اسلام ایسی جنگ کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

لہٰذا وہ جنگیں جو دنیاوی دشمنی یا قومی اور لسانی تعصب کی بنیاد پر لڑی جائیں، یا جن کا ہدف دوسروں کو غلام بنانا اور ملک گیری ہو، ان جنگوں کا ''اسلامی جہاد'' سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلامی جہاد کے مقاصد کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اسلامی جہاد سے دو چیزیں مقصود ہوتی ہیں:

(۱) اول یہ کہ اسلام کا دفاع کرنا، یا اگر اسلامی حکومت پر کفار حملہ کر دیں تو اس کا دفاع کرنا، اس کی طرف اللہ جل شانہ نے قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (11)

''حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس وجہ سے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعوی کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (12)

''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو۔''

(۲) اور جہاد کا دوسرا مقصد ظلم اور فتنہ کو دفع کرنا، اور کفر کی ایسی شان وشوکت کو توڑنا ہے جو اسلام کی دعوت دینے اور اس کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہو، اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (13)

''اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔''

اسلامی جہاد کے انہی اہداف کو حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایران کے پہلوان ''رستم'' کے سامنے اس وقت بیان کیا تھا، جب مسلمانوں نے کسریٰ پر حملہ کیا تھا، تو ان لوگوں نے یہ سوال کیا تھا کہ تمہیں کیا چیز یہاں لے کر آئی ہے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے تا کہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف نکالیں، اور لوگوں کو دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کی طرف نکالیں، اور مذاہب کے مظالم سے اسلام کے عدل کی طرف نکالیں۔''(14)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مزید فرماتے ہیں:

''حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول ''اور مذاہب کے مظالم سے اسلام کے عدل کی طرف نکالیں'' کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر زبردستی کی جائے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ظلم اور غلامی سے اس عدل وانصاف کی طرف نکالیں جس کو اللہ جل شانہ نے زمین پر اللہ کی شریعت جاری کرنے کے لئے مشروع کیا ہے، یہاں تک کہ ہر حق والے کو اس کا حق دیدیا جائے، یا ظالمین کی شوکت کو توڑ کر ایسا ماحول تیار کیا جائے جس میں ہر انسان کھلی آنکھوں سے مذاہب کے درمیان موازنہ کر سکے، اور کفر اور ظلم کی شوکت حق کو قبول کرنے کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔''(15)

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے ان جنگوں کا راستہ بالکل بند کر دیا ہے جن کا مقصد ملک پر قبضہ کر کے دوسروں کو غلام بنانا، اور ان کے اموال اور زمینوں پر تسلط جمانا مقصود ہو۔ جیسے آج صاف نظر آ رہا ہے کہ عراق، لیبیا اور کویت وشام پر جنگ مسلط کرنے کا مقصد ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دوران جنگ عدل وانصاف پر مبنی اصول:

جنگ کے دوران اسلام نے ایسے عمدہ احکامات جاری کیے ہیں جن کی پاسداری کی صورت میں وہ جنگ صرف پہلے سے جاری ظلم کو ختم کرے گی کسی نئے ظلم وعدوان کی بنیاد نہیں بنے گی جیسا کہ آج کل ظلم کو ختم کرنے کے نام پر جنگ شروع کی جاتی ہے لیکن اس کے نتیجہ میں کئی ممالک میں لامتناہی ظلم کا دروازہ کھل جاتا ہے جیسا کہ لیبیا، عراق، شام، افغانستان، صومالیہ کے حالات سے مترشح ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جہاد کیلئے کوئی فوجی دستہ بھیجتے تو ان کے سامنے ان ضوابط کی وضاحت فرماتے، اور اس دستے کو اس پر کاربند رہنے کی تاکید فرماتے، ان ضوابط کو بہت سے صحابہ کرامؓ نے بیان کیا ہے انہی قواعد کے بارے میں حضرت بریدہ بن الحصیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی لشکر پر یا کسی دستے پر کسی شخص کو امیر بناتے تو اس کو خاص طور پر اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں ان کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کی وصیت فرماتے، اور پھر فرماتے: اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرے، اس سے قتال کرو، جہاد کرو، خیانت مت

کرو، دھوکہ مت دو، مُثلہ مت کرو، اور کسی بچہ کو قتل مت کرو۔''(16)

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی لشکر روانہ فرماتے تو آپ اس لشکر سے فرماتے کہ اللہ کے نام پر چل پڑو، کسی بوڑھے کھوسٹ کو قتل مت کرنا، کسی چھوٹے بچہ کو قتل مت کرنا، کسی عورت کو قتل مت کرنا، خیانت نہ کرنا، مالِ غنیمت ایک جگہ پر جمع کرنا، اور لوگوں کی اصلاح کرنا، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اللہ تعالیٰ اچھا سلوک کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔''(17)

عام طور پر جنگ کے وقت جنگجوؤں کا لیڈر ایسی تقاریر کرتا ہے جس سے اس کے جوان جذبات میں مغلوب ہو کر دشمن کو نیچا دکھانے اور اس کی قوت کو توڑنے کے لیے ہر حد سے گزر جائیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر روانہ کرتے وقت اس بات کی تاکید کرتے کہ لڑائی کے دوران دشمن کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کریں جس کو اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک غزوہ میں ایک مقتولہ عورت پائی گئی، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل پر نکیر فرمائی۔''(18)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کی طرف لشکر بھیجے تو ان کو رخصت کرتے ہوئے ان کے ساتھ چلے، اور چلتے ہوئے ان کو وصیت کی اس لشکر کے امیر یزید بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے:

''آپ وہاں پر ایک ایسی قوم کو پائیں گے جن کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کیلئے اپنی جانوں کو روک رکھا ہے (اس سے مراد راہبین ہیں، جنہوں نے اللہ کی عبادت کیلئے رہبانیت اختیار کی ہے) تو ایسے لوگوں کو نہ چھیڑنا، اور میں تمہیں دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں کسی عورت کو قتل مت کرنا، کسی بچے کو قتل مت کرنا، نہ کسی بڑی عمر کے بوڑھے کو قتل کرنا، کسی پھل دار درخت کو مت کاٹنا، کسی آبادی کو ویران مت کرنا، کسی بکری کی اور کسی اونٹ کی کونچیں مت کاٹنا (اس کو زخمی مت کرنا) مگر یہ کہ کھانے کا ارادہ ہو، کسی کھجور کے درخت کو مت کاٹنا، نہ اس کو جلانا، اور مالِ غنیمت میں خیانت مت کرنا، اور بزدلی مت دکھانا۔(19)

اسلام سے پہلے بھی اور آج کی متمدن دنیا میں بھی یہی دستور ہے کہ جنگ کے دوران اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جو چاہے طریقہ اپنا سکتے ہیں چاہے اس کے نتیجہ میں پرامن شہر برباد ہوں یا پورا ملک نیست و نابود ہو جائے کوئی پرواہ نہیں ہے بس کامیابی ملنی چاہیے اور یہ صرف مفروضہ نہیں بلکہ جنگ عظیم اول و دوم کی تباہیاں، ہیروشیما اور ناگاساکی میں سسکتی ہوئی انسانیت اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن اسلام نے جنگجوؤں کے لیے ایسے سخت احکام جاری کیے جن سے جنگ کے دوران بھی ظلم کا دروازہ بند ہو گیا ہے، یہ احکام اتنے زیادہ اور اہم ہیں کہ ''احکام الجہاد اور قتال'' ایک مستقل علم بن گئے، اور اس پر کتابیں لکھی گئیں ہیں، شاید اس موضوع پر سب سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں ''کِتَابُ السِّیَرِ لِلْاَوْزَاعِیِّ رحمۃ اللہ علیہ'' اور ''کِتَابُ السِّیَرِ الْکَبِیْرِ لِلْاِمَامِ مُحَمَّدِ بْنِ حَسَنِ الشَّیْبَانِیِّ رحمۃ اللہ علیہ'' ہیں، جن میں جنگ کے احکام اور ملکی تعلقات کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ احکام لکھے گئے اور یہ سب احکام قرآن کریم، حدیث نبوی، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے تعامل کی بنیاد پر لکھے گئے۔

جنگ کے قواعد پر عمل کی چند عمدہ مثالیں:

اسلام نے جنگ کے دوران جن قواعد پر عمل کا حکم دیا ہے دنیا کے دیگر قوانین کی طرح یہ صرف صفحات میں قلمبند نہیں رہے بلکہ مسلمانوں نے ان روشن قوانین پر عمل کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے کہ دشمن کے ساتھ جس قوم کے یہ بلند اخلاق ہیں دوستوں کے ساتھ ان کے اخلاق کا کیا عالم ہوگا؟

صحابہ کرام غیر مسلمین کے ساتھ معاملات کرنے میں اسلام کے ان زریں اصولوں پر عمل کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ حالت جنگ میں بھی وہ ان کی پابندی کرتے تھے چنانچہ:

''حضرت خُبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کافر دشمنوں کے پاس قید تھے، کافروں کے بچوں میں سے ایک بچہ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آ گیا، حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بچے کو اپنی ران پر بٹھالیا اس وقت حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں استرا تھا، اس بچہ کی ماں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی، حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی ماں سے کہا کہ تم اس بات سے ڈر گئیں کہ میں اس کو قتل کر دوں گا، میں ایسا نہیں کروں گا۔''(20)

حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیلئے یہ بھی ممکن تھا کہ اس بچہ کو ڈھال بنا کر اس بچہ کے عوض دشمنوں کی قید سے خلاصی حاصل کر لیتے، لیکن حضرت خُبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا نہیں کیا، اپنی جان دیدی، لیکن اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ مسلمانوں کی طرف یہ بات منسوب کی جائے کہ یہ بچوں کو قتل کر دیتے ہیں، یا اپنی آزادی حاصل کرنے کیلئے بچوں کو ڈھال بنا لیتے ہیں۔

تمام مذاہب اور ادیان میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جنگ کی حالت میں جنگ لڑنے والوں کیلئے یہ جائز ہے کہ جس طریقے سے بھی بن پڑے، دشمن کے اموال پر قبضہ کر لیں، لیکن اسلام نے یہ اجازت ان اموال تک محدود کی ہے جن کو مسلمان اپنی قوت بازو سے حاصل کریں، لیکن دشمن کا وہ مال جو ان کے پاس امانت کے طور پر آیا، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس مال پر زبردستی قبضہ کر لیں۔

(۱) اس اصول کی بہترین عملی مثالوں میں سے غزوہ خیبر میں حضرت اسود عنسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے، یہ واقعہ احادیث کی کتابوں میں مختلف طریقے سے مروی ہے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امام المغازی حضرت موسیٰ بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

''یہودی ایک محفوظ قلعے میں داخل ہو گئے، جس کو ''عموص'' کہا جاتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً بیس دن تک ان کا محاصرہ کیا، وہ زمین خراب اور شدید گرمی والی تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بڑی مشقت اُٹھائی۔

اسی موقع پر اہل خیبر کا ایک سیاہ فام حبشی غلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، جو اپنے مالک کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس غلام نے اہل خیبر کو دیکھا کہ انہوں نے ہتھیار پہنے ہوئے ہیں، اس نے ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے اس غلام سے کہا کہ ہم اس شخص سے جنگ کر رہے ہیں جس کا خیال ہے کہ وہ نبی ہے، اس غلام کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال آ گیا وہ اپنی بکریوں کو لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ گیا، اور آپ سے کہا: آپ کیا کہتے ہیں؟ اور آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اور یہ کہ تم ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' کی گواہی دو، اور یہ گواہی دو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ اللہ کے علاوہ ہم کسی کی عبادت

نہیں کریں گے، اس غلام نے کہا: اگر میں ان باتوں کی گواہی دوں، اور اللہ پر ایمان لے آؤں تو؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے جنت ہے، اگر اس حالت میں تم مر جاؤ، چنانچہ وہ غلام اسلام لے آیا۔

اس غلام نے کہا: اے اللہ کے نبی! یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ان بکریوں کو ہمارے لشکر سے نکال دو، اور اور کنکریوں کے ذریعہ ان کو مارو، اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے امانت پہنچا دیں گے، اس غلام نے ایسا ہی کیا، اور بکریاں اپنے مالک کے پاس واپس چلی گئیں۔ (21)

ایک دوسری روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے:

''وہ غلام بھی لڑائی کی صف میں شامل ہو گیا (کیونکہ لڑائی کے لیے صفیں بنی ہوئی تھیں) اور اس کو ایک تیر آ کر لگا اور وہ مر گیا، اور اس شخص نے اللہ کیلئے ایک سجدہ بھی نہیں کیا، حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اس کو خیمے میں لے جاؤ۔ بعد میں آپ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھی کا اسلام کتنا اچھا رہا، میں اس کے پاس آیا اور اسکے پاس گوری چمڑی والی اور بڑی آنکھوں والی اس کی دو بیویاں ہیں۔''

اس اضطراری حالت میں مسلمانوں کے لئے سہل یہی تھا کہ اس طرح کی کوئی تاویل کر کے اس مال کو مسلمانوں کے لیے مباح کر دیتے کہ یہ حالت جنگ ہے اور حالت جنگ میں دشمن کا مال حلال ہوتا ہے۔

لیکن حضور اقدس ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے اس لئے کہ اس چرواہے نے وہ بکریاں ان کے مالکوں سے عقد امانت کے تحت لی تھیں، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس چرواہے کو بکریاں مالکوں کو واپس کرنے کا حکم دیا، حالانکہ اس سخت حالت میں مسلمان ان بکریوں کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے۔ ((22

اس کے برعکس ہمیں برطانیہ میں کئی ایسے گروہ اور نوجوان ملتے ہیں جن کو یہ تعلیم دی گئی ہے، کہ کفار کی عورتیں ہماری باندیاں ہیں اور یہ ہمارے لیے جائز ہیں ہم ان کے ساتھ ہر قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں، اور کفار کا مال ہمارے لیے جائز ہے، اور یہ مال ہم جس طریقے سے چاہیں ان سے لوٹ سکتے ہیں۔ یعنی نفرت اور اخلاقی گراوٹ اس سطح پر پہنچ چکی ہے، کہ اسلام کی طے شدہ حدود سے بڑی جرأت کے ساتھ تجاوز کرتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایسی تعلیم مساجد یا مدارس میں نہیں دی گئی بلکہ کچھ نام نہاد ''اسلامی'' گروپ اپنے مختلف حلقوں میں نوجوانوں کو پھنسا کر ایسے گمراہ کن رویے پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ تعداد میں انتہائی قلیل ہیں۔ لیکن مغربی میڈیا ایسے لوگوں کو بہت زیادہ پروموٹ کرتا ہے۔ مزید برآں یہ گروپ مغربی میڈیا پر آ کر علی الاعلان یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ وہ برطانوی وزیر اعظم کو ٹریفالگر سکوائر کے نیلسن کالم پر پھانسی کے پھندے پر لٹکائیں گے اور وزیر اعظم ہاؤس میں خلافت کا جھنڈا لہرائیں گے۔

(۲) امام ابوعبید قاسم بن سلاّم رحمۃ اللہ علیہ نے صفوان بن عمرو اور سعید بن عبدالعزیز سے روایت کی ہے:

''رومیوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس پر صلح کر لی کہ وہ ان کو مال ادا کریں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس معاہدہ پر ان سے رہن مانگا، تو انہوں نے شہر ''بعلبک'' بطور رہن ان کو دیا۔ پھر رومیوں نے غداری کی اور عہد توڑ دیا، تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مسلمانوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ جو لوگ ان کے پاس بطور رہن کے ہیں اُن کو قتل کرنے کے بجائے ان کیلئے جانے کا راستہ کھول دیا جائے، اس طریقے سے ان پر فتح حاصل کی اور مسلمانوں نے کہا: غداری کے بدلے میں وفاداری کرنا، غداری کے بدلے میں غداری کرنے سے بہتر ہے۔ (23)

اس کتاب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام کے جاری کردہ تمام احکام عادلہ کو بیان کیا جائے اور مسلمانوں نے حالت امن اور حالت جنگ میں غیر مسلمین کے ساتھ معاملات کرنے میں ان احکام پر عمل کی جو بلند مثالیں بطور یادگار چھوڑی ہیں ،ان سب کا احاطہ اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں ،لیکن ہمیں امید ہے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ دین اسلام کی اعلیٰ ظرفی پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے۔

صلح کی اہمیت وفضیلت

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ''علماء فقہ اور اصول فقہ اور متکلمین سب اس بات پر متفق ہیں کہ قتال ''حَسَنٌ لِعَیْنِہٖ''نہیں بلکہ ''حَسَنٌ لِغَیْرِہٖ'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ضرورت کے وقت اس کو اختیار کیا جائے گا ،اگر شریعت کے مقاصد صلح کے ذریعہ حاصل ہو جائیں تو پھر قتال کی ضرورت نہیں ،حدیث شریف میں ہے: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نزول کے بعد جنگ کو ساقط کر دیں گے۔'' (صحیح بخاری) اس لئے کہ اس زمانے میں جنگ اور قتال کے بغیر ہی شریعت کے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔''(24)

نوٹ : شریعت کے بعض احکام وہ ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے حسین وخوبصورت ہیں جیسے اللہ تعالی پر ایمان لانا، سچ بولنا ،انصاف کرنا وغیرہ ان احکام کو علما کی اصطلاح میں ''حَسَنٌ لِعَیْنِہٖ'' کہتے ہیں ۔اور شریعت کے وہ احکام جو اپنی ذات کے اعتبار سے حسین نہیں ہوتے بلکہ کسی اور چیز کی وجہ سے ان میں حسن آتا ہے جیسے نماز کے لیے وضو وغیرہ ان کو ''حَسَنٌ لِغَیْرِہٖ'' کہتے ہیں۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان نے خیبر کے دن نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

''میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا اللہ تعالی اس کے ہاتھ پر فتح دیں گے،'' تو سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین منتظر رہے کہ یہ کس کو دیا جائے گا تو اگلے دن ہر شخص کو یہ خواہش تھی کہ جھنڈا اسی کو دیا جائے تو آپ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ علی کہاں ہیں؟ تو عرض کیا گیا کہ ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے تو آپ علیہ السلام کے حکم پر ان کو بلایا گیا آپ علیہ السلام نے ان کی آنکھوں میں لعاب مبارک ڈالا وہ ایسے تندرست ہو گئے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا تو حضرت علیؓ نے عرض کیا ہم ان (یہود) سے لڑائی کریں یہاں تک کہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''تھوڑا ٹھہریں یہاں تک کہ آپ ان کے صحن میں اتریں پھر ان کو اسلام کی طرف بلائیں اور ان کو ان چیزوں کی خبر دیں جو ان پر واجب ہیں، پس اللہ کی قسم اگر آپ کی وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت دی جائے تو یہ آپ کے لیے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔''(25)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ قتال بذات خود مقصود نہیں ہے بلکہ ''حَسَنٌ لِغَیْرِہٖ'' ہے اگر ملکی نزاعات صلح کے ذریعے حل کرنا ممکن ہوں تو جنگ اور قتال کے بھڑکانے سے بہتر اور افضل یہ ہے کہ صلح کے ذریعہ سے معاملات حل کیے جائیں لیکن یہ شرط ہے کہ صلح کے یہ طریقے مصالح شریعت کے ضامن ہوں، اور اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (26)

ترجمہ: ''اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو آپ بھی جھکیں اسی طرف اور بھروسہ کریں اللہ پر۔''

حضور اقدس ﷺ نے بدیل بن ورقاء سے صلح حدیبیہ سے پہلے فرمایا تھا:

''ہم کسی سے قتال کیلئے نہیں آئے لیکن عمرہ ادا کرنے کیلئے آئے ہیں، قریش کو تو جنگ نے لاغر اور کمزور کر دیا ہے، ان کو جنگ نے نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ لوگ چاہیں تو میں ان کیلئے ایک مدت متعین کر دوں، اور اس مدت میں قریش مجھے اور دوسرے لوگوں کو چھوڑ دیں، اگر اسلام غالب آجائے تو ان لوگوں کو اختیار ہوگا کہ چاہیں تو دوسرے لوگوں کی طرح جو اس میں داخل ہوئے ہیں، یہ بھی اس میں داخل ہو جائیں، ورنہ یہ سب میرے خلاف جمع ہو جائیں اور اگر وہ اس بات سے انکار کریں تو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں ان سے اس معاملے میں ضرور قتال کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ تنہا میری گردن باقی رہ جائے، اور اللہ تعالیٰ ضرور اپنے حکم کو نافذ فرمائیں گے۔''(27)

کائنات کی سب سے زیادہ فصیح اور سچی ہستی کی زبان مبارک سے جاری ہونے والے یہ کلمات حالت جنگ اور حالت امن میں اسلام کا مؤقف بیان کرنے کیلئے بہترین نمونہ ہیں۔

اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس واقعہ کے تحت فرماتے ہیں: ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جملہ:

''قریش کو تو جنگ نے لاغر اور کمزور کر دیا ہے، ان کو جنگ نے نقصان پہنچایا ہے'' مکمل وضاحت سے یہ بیان کر رہا ہے کہ ''جنگ'' فی نفسہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں، اور اگر امن وامان قائم کرنا اس کے بغیر ممکن ہو تو پھر جنگ بھڑکانے کی ضرورت نہیں لیکن صلح کے طریقوں کو ان مقاصد شرعیہ کی قیمت پر حاصل کرنا، جن کی مضبوطی اور پائیداری کیلئے اسلام آیا ہے کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اور اس کی اصل اللہ جل شانہ کا یہ ارشاد ہے: فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ (28)

ترجمہ: ''سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو۔''

یعنی اگر دشمن صلح کی بات چیت، اور گفت وشنید کو ٹال مٹول کرنے کیلئے ایک حیلہ بنالے اور اس صلح کو اپنے باطل پر دیر تک جمے رہنے کیلئے ایک ذریعہ بنالے اور اپنے ظلم پر ہمیشہ رہنے کیلئے اور مستحق تک اس کا حق پہنچانے میں تاخیر کرنے کیلئے اس کو ایک وسیلہ بنالے تو اس صورت میں صلح کے یہ انداز اور یہ طریقے فریب اور دھوکہ کے علاوہ کچھ نہیں، اور عادلانہ بنیاد پر صلح کے قیام میں مندرجہ بالا طریقے سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا۔''(29)

دین اسلام کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ اس نے جنگ کی بھی اخلاقیات بیان کی ہیں۔

اسلام میں جہاد کے اخلاقی اصول:

جنگ کی اخلاقیات میں ایفائے عہد کا بھی اہم مقام ہے۔ مسلمانوں پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے کئے گئے معاہدوں کے پابند ہیں اور از روئے شریعت اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی ڈھا رہی ہو تو ان مسلمانوں کی مدد نہیں کی جاسکتی جو دوسرے ملک کے شہری ہوں کیونکہ مسلمان اپنے معاہدے کے پابند ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ج وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (30)

''رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو ان کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد چاہیں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے لیکن کسی ایسی قوم

کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ یورپ کے کئی ممالک بشمول برطانیہ، جرمنی اور فرانس کے مسلمان نوجوان جہاد کے نام پر دوسرے ممالک کا سفر کر کے جنگی کارروائیوں میں شریک ہوتے ہیں۔اوپر کی آیت کی روشنی میں معاہدے کی پاسداری لازم ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ جب دوسرے ممالک کے مسلمان شہری یورپین ممالک کی شہریت حاصل کرتے ہیں تو باقاعدہ ایک تحریری معاہدہ ہوتا ہے کہ شہریت حاصل کرنے والا مسلمان اُس ملک کے قوانین کی پابندی کرے گا اور وفادار رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بسنے والے علما کرام مسلمانوں کو یہی تلقین کرتے ہیں کہ جس معاہدے کے تحت شہریت حاصل کی گئی ہے اُس کے مطابق اُن ممالک کے شہریوں، املاک اور مفادات کو نقصان پہنچانا کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی ہے لہٰذا یہ عمل غیر اِسلامی ٹھہرا۔مزید برآں ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمان انہی غیر مسلم حکومتوں سے سرکاری مکانات، اپنے لئے ماہانہ وظائف اور اپنے بچوں کے لئے وظائف کے علاوہ مفت سرکاری تعلیم اور امن وامان کے اداروں کے تعاون سے مستفید ہو رہے ہیں۔اس لئے علما کرام یہ کہتے ہیں کہ یورپی ممالک میں مسلمانوں کی جان عزت جائیداد اور عبادت گاہوں کی حفاظت احسن طریقے سے ہو رہی ہے لہٰذا یہ ممالک دارالحرب نہیں ہیں۔(دارالحرب کی تعریف آگے مستقل باب میں آرہی ہے۔)

تاہم اگر فریق مخالف سے بدعہدی کا اندیشہ ہو یا وہ معاہدے کے کسی شق کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بھی معاہدے سے نکلنے کا اعلان کریں اور بہتر یہی ہوگا کہ اپنی شہریت کو کینسل کرواتے ہوئے کسی اور جگہ رہنے کا انتخاب کریں کہ وہاں بسنے والے دوسرے مسلمانوں کیلئے آزمائش اور ابتلا کا ماحول پیدا نہ ہو۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ (31)

ترجمہ: پھر اگر کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تم بھی برابری کے ساتھ اعلانیہ اس کا عہد اس کے آگے پھینک دو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ بدعہدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ ''جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس کی مدت گزر جانے تک اس میں کوئی تغیر وتبدیلی نہ کرے یا پھر خیانت کا اندیشہ ہو تو اسے برابری کے ساتھ اعلانیہ اس کے آگے پھینک دے''۔

مسلمانوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جہاد کے لیے نکلتے وقت نمود ونمائش نہ کریں بلکہ اللہ کو یاد کریں۔اس طرح ، جو لوگ شریک جنگ نہیں ہوتے ان کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ جنگ کے موقع پر جب یہ معلوم ہوا کہ ایک عورت قتل کر دی گئی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے لوگوں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا۔اسی طرح دشمن کو آگ میں جلا کر مارنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے کیونکہ آگ سے جلانے کا عذاب صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔اس کے علاوہ، دشمن کے ملک میں لوٹ مار کرنے، لاشوں کی بے حرمتی کرنے اور راستے تنگ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔یہ تو ہیں اسلامی تعلیمات اور اصولِ جنگ، اس کے برعکس طالبان انسانوں کے سر کاٹ کر فٹ بال کھیلتے ہیں تو یہ کون سے اسلام کی خدمت ہو رہی ہے؟ دوسری طرف آج کی ''مہذب دنیا'' مسلمان ممالک پر صریحاً نہتے سویلین لوگوں پر بمباری کر کے کونسی اقدار قائم کر رہی ہے۔؟ حال ہی میں افغانستان پر دنیا کا

سب سے بڑا نان نیوکلیئر بم مادر آف بمبز پھینک کر ''مہذب دنیا'' کون سے اخلاقی اور قانونی جواز کا سہارا لے رہی ہے۔ اور ایسے غیر قانونی اقدام کو چیلنج کرنے کے لئے اقوام متحدہ کب خوابِ خرگوش سے بیدار ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ یہ توازن کہیں ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کے اصول سے تو نہیں بگڑا۔

جہاد کے بارے میں جذباتی رویے اور اس کے نقصانات

اگر ہم موجودہ دور میں انتہا پسند نام نہاد عسکری تنظیموں کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ہمیں جہاد کے حوالے سے جو زرّیں احکامات دیے ہیں، ان کا یہ لوگ سرعام مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اسلام کے حقیقی تصور جہاد کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بالخصوص پاکستان مخالف عناصر کا جہادی ٹرم استعمال کر کے پاکستان کے مفادات اور شریعت کو بین الاقوامی پلیٹ فارمز پر نقصان پہنچایا۔ ذاتی فوائد کے حصول کے لیے لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسے تصور جہاد کو فروغ دیا گیا ہے جس کے لیے دین کے ماخذ میں کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی۔ پرائیوٹ گروپس اور جتھے آئے روز جہاد کے اعلانات کر رہے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کو تو چھوڑیں اب تو بعض لوگوں نے مساجد جیسی قابل احترام جگہوں کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مسلکی اور دیگر اختلافات کو بنیاد بنا کر مسلمان کے ذریعے سے مسلمان کا گلا کاٹا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے ہی معاشرے میں صدیوں سے اکٹھے اور پرامن طریقے سے رہنے والے غیر مسلموں کی زندگیوں کو غیر محفوظ کر دیا۔ اس عمل نے دوسرے ممالک کے سفارتی عملے، سماجی ترقی اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے اداروں کے اہلکاروں، غیر ملکی کھلاڑیوں اور پرامن شہریوں کے خلاف خون ریز کارروائیاں کیں۔ اس کا نتیجہ نکلا ہے کہ پاکستان اور اسلام پوری دنیا میں بدنام ہوئے ہیں۔ ہمارے صالح اور ذہین نوجوان جن کی صلاحیتیں ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے صرف ہونی چاہیے تھیں، ایک ایسی سرگرمی کی نذر ہو رہی ہیں، جس کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی ہے اور عملی طور پر پوری کی پوری قوم خوف اور ہراس میں مبتلا ہے۔ روزانہ سیکڑوں معصوم جانیں ضائع ہوتی ہیں گویا پوری پاکستانی قوم کی Persecution ہو رہی ہے۔ یعنی پاکستانی افواج، پولیس، دیگر سیکورٹی کے ادارے، تعلیم گاہیں، مساجد، مدارس، امام بارگاہیں، مزارات، بازار، اساتذہ، طلبا اور مزدور، دہشت گردی سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔

آج ضرورت ہے کہ لوگوں پر اسلام کا تصور جہاد پوری طرح واضح ہو اور اس قوم کے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو صحیح میدان میسر آئے۔ اس کے لیے ایک طرف علمی جدوجہد کی ضرورت ہے اور دوسرے طرف عملی۔ یعنی آج ضرورت ہے کہ لوگوں پر قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح تصور جہاد واضح کیا جائے اور دوسری طرف عملی طور پر ایسی سرگرمیاں شروع کی جائیں، جن سے نوجوانوں کو درست میدان عمل میسر آئے۔

اگر ہم اپنے معاشرے پر غور کریں تو نوجوانوں کی ان سرگرمیوں میں شمولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بے روزگار ہیں۔ یہ بے روزگاری ہی ہے جو لوگوں کو جرائم اور منشیات کی طرف مائل کرتی ہے، ان کے اندر معاشرے سے عدم دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور مایوسی انہیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہے جہاں وہ دوسروں کو جینے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر انہیں جینے کے مواقع میسر نہیں ہیں تو دوسروں کو کیوں ہوں؟

اس مایوسی نے ہمارے ہاں تین طرح سے لوگ پیدا کیے۔ ایک وہ جنہوں نے جرائم کا راستہ اختیار کیا ہے، دوسرے

وہ جنہوں نے منشیات میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈی ہے اور تیسرے وہ جو اپنے مذہبی رجحان کے سبب جہاد کے موجودہ تصور کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ چونکہ بہتر لوگ ہیں، اس لیے انہیں اگر درست رہنمائی میسر آئے تو یہ ملک وقوم کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ دوسرے دو گروہوں کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے اور اس کے لیے بھی کام ہونا چاہیے۔ چونکہ اس مضمون میں جہاد کا تصور زیر بحث ہے، اس لیے اپنی گفتگو اور تجاویز کو اسی موضوع تک محدود رکھ رہے ہیں۔

کلام آخر:

جنگ کسی بھی ریاست کے لیے ایک عارضی معاملہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے بارے میں اسلامی احکامات پوری طرح واضح ہوں۔ تاکہ قتال اور جہاد کے مفہوم میں موجود وسعت کو صحیح تناظر میں دیکھا جا سکے۔ آج چونکہ مسلمانوں کے بعض گروہوں میں یہ نقطۂ نظر فروغ پا رہا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف قتال میں ہے، چاہے وہ قتال غیر مسلموں کے خلاف ہو یا بے راہ رو مسلمانوں کے خلاف ہو اور یہ نظریہ اسلام کے تصور جہاد پر بدنما داغ ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دور میں منکرات و بدعات کو روکنے کے لیے کچھ لوگوں نے ہتھیار استعمال کیا حالانکہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تو تذکیر کا حکم ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (32)

اس لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں دین کے احکام پورے واضح ہوں، اس بات کا تجزیہ کیا جائے کہ اس طرح کی حکمت عملی میں کامیابی کے امکانات کتنے ہیں اور یہ کہ کیا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی ہے جس کو اپنانے سے مسلمانوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہ کام صرف علمائے کرام اور اہل علم و دانش کا نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ ان پہلوؤں سے اس اہم دینی حکم کے بارے میں لوگوں کی رہنمائی کریں تاکہ اس باب میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے اور دین کے ایک اہم حکم کو صحیح پس منظر اور صحیح لوگوں سے سمجھا جائے۔ بجائے اس کے کہ موجودہ رویے کو برقرار رکھا جائے جس میں ہمیشہ علما اور مدارس کو مستقل تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم سب کسی ایک معاشرے کا حصہ ہیں اور اس کے کسی حصے کا بگاڑ ہمارے اوپر بھی منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ اس لئے ہماری اخلاقی، مذہبی اور قانونی ذمہ داری بنتی ہے کہ معاشرے کے بگاڑ کو درست کرنے کے لئے پوری قوم متحد ہو تاکہ ایک پُرامن ماحول پیدا ہو سکے۔ یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ جب ہم دین کے عنوان سے کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کے احکامات کو پس پشت ڈال دیں گے تو پھر ہم اللہ کی رضا اور مدد سے محروم رہ جائیں گے۔ اور یہ حکم بھی انہی علما سے معلوم کیا جائے جن کی زندگی عوام کے سامنے ہے اور عوام کو ان کے علم و تقوی پر اعتماد ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

يَكُونُ فِي اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ يَأْتُونَكُمْ مِنَ الْاَحَادِيثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَاؤُكُمْ فَاِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّونَكُمْ وَلَا يَفْتِنُونَكُمْ ...(33)

”آخر زمانہ میں جھوٹے دجال ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی احادیث لائیں گے جو نہ تم نے سنی ہونگی اور نہ تمہارے آباء واجداد نے، تم ان سے بچنا وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں اور تمہیں فتنہ میں نہ مبتلا کر دیں۔“

آٹھواں باب:

مسئلہ کشمیر حقائق کے تناظر میں

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تقسیم کے بعد پاک و بھارت تعلقات میں خرابی کی بنیادی وجہ ریاست کشمیر کا بھارت سے متنازعہ الحاق ہے۔ اس متنازعہ الحاق کی حقیقت جانے بغیر ہم مسئلہ کشمیر کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے حل تک دونوں کے تعلقات درست سمت کی طرف نہیں بڑھ سکتے۔

اس موضوع کا حقیقت پسندانہ اور بے لاگ جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ریاست کشمیر کی نوعیت کو سمجھیں۔ تقسیم ہند کے وقت کشمیر ایک نیم خود مختار ریاست (Princely State) تھی۔ اس طرح کی ریاستوں کی تعداد 562 تھی۔

ان کے مستقبل کے بارے میں مسلم لیگ، کانگرس اور ان ریاستوں کے حکمرانوں کے ساتھ بات چیت کے بعد یہ اصول وضع کیے گئے:

☆ ریاستوں کے حکمران چاہیں تو ہندوستان میں شامل ہو جائیں یا پاکستان کے ساتھ۔

☆ وہ اپنی آزاد حیثیت بھی برقرار رکھ سکتے ہیں۔

☆ لیکن ہر دو فیصلوں میں مناسب ہے کہ اپنے جغرافیائی حدود اور رعایا کی مرضی کا خیال رکھیں۔ البتہ قانونی طور پر حکمران کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

پنجاب کی تقسیم کے بارے میں کانگریس کا موقف یہ تھا کہ فیصلے کا اختیار برطانوی فیڈرل کورٹ کو ہونا چاہیے۔ ماونٹ بیٹن (Lord Mountbatten) کی تجویز یہ تھی کہ اقوام متحدہ کے ایک کمیشن کو فیصلے کا اختیار دیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کی تجویز یہ تھی کہ سر سرل ریڈ کلف (Sir Cyril Radcliffe) کو چیئرمین بنایا جائے اور اسے فیصلہ کن ووٹ کا اختیار بھی دیا جائے۔ بال آخر اس تجویز کو منظور کر لیا گیا اور ریڈ کلف (Radcliffe) نے ضلع گورداس پور کی چار میں سے تین تحصیلیں بھارت کے حوالے کر دیں۔ اس میں ایک پٹھانکوٹ کی تحصیل تھی۔ یہاں سے ایک سڑک ہندوستان کو کشمیر سے ملاتی تھی۔ بعد میں اسی راستے سے ہندوستان نے اپنی افواج کشمیر میں داخل کی تھیں۔

جب تقسیم کا عمل مکمل ہو گیا تو حیدر آباد کے نظام میر عثمان علی نے پہلے پاکستان کے ساتھ الحاق کی خواہش کا اظہار کیا بعد میں اس نے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنے کا علان کر دیا۔ اور اس کے لیے اقوام متحدہ میں درخواست بھی جمع کر ادی۔[4]

کچھ یہی نیت کشمیر کے راجہ ہری سنگھ کی تھی، مسلم اکثریت کی وجہ سے اس نے اپنی اس نیت کا فتور پہلے تو چھپائے رکھا، بلکہ مسلم لیگی قیادت کو بہت ساری یقین دہانیوں کے بعد یہی یقین دہانی کرائی کہ وہ پاکستان ہی کے ساتھ الحاق کرے گا مگر عملاً اس نے الحاق کے فیصلے کو لٹکائے رکھا۔ ادھر جب ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی فسادات پھوٹ پڑے تو اسے بھی اپنے عزائم کو پورا کرنے کا بہانہ مل گیا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے کی خاطر مسلح رضا کار کشمیر میں داخل ہو چکے

تھے۔ راجہ شاید اس وقت کی پاکستانی قیادت سے اسی غلطی کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری طرف ان رضا کار ''پٹھان بھائیوں'' نے بھی جلدی مچائی اور سری نگر میں راجہ کے محل کی طرف چڑھائی کر دی، ہری سنگھ دہلی جا پہنچا۔ بھارتی حکومت نے اسے غنیمت جانا اور ''بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا'' کے مصداق راجہ سے کسی ''نامعلوم لالچ'' کی بنیاد پر الحاق کی دستاویز پر دستخط کرا لیے۔ یہ نامعلوم لالچ کس کس کے ذہن میں تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ راجہ ہری سنگھ کے ان دستخطوں کے باوجود قانونی طور پر ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر اور اس کے بعد بھی بھارت کے اس وقت کے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو اور دوسرے حکومتی عہدے داروں نے کیا کہا، ذرا ملاحظہ فرمائیے:

1).....حکومتِ کشمیر کی جانب سے ہنگامی مدد کی درخواست کا ہم نے مثبت جواب دیا۔ مگر میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہنگامی امداد بھارت سے الحاق کے لیے دباؤ ڈالنے کے مقصد سے نہیں بھیجی گئی۔ ہمارا موقف متواتر یہ ہے کہ کسی بھی متنازعہ علاقے یا ریاست کا الحاق وہاں کے لوگوں کی مرضی سے ہونا چاہیے (یہ ٹیلی گرام وزیرِ اعظم نہرو کی جانب سے 26 اکتوبر 1947 کو برطانوی وزیرِ اعظم ایٹلی (Clement Richard Attlee) اور 27 اکتوبر کو پاکستانی وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کو بھیجا گیا)۔

2).....ہم نے مہاراجہ اور کشمیری مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت (شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس) کی درخواست پر کشمیر کے الحاق کا فیصلہ اس شرط کے ساتھ قبول کیا ہے کہ کشمیری عوام طے کریں کہ وہ دونوں ڈومینینز (بھارت و پاکستان) میں سے کس کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ امن و امان بحال ہوتے ہی فوجوں کے انخلا اور ریاست کے مستقبل کا فیصلہ عوام کے ہاتھوں میں چھوڑنے کے حوالے سے ہمارا وعدہ نہ صرف آپ کی حکومت بلکہ کشمیریوں اور عالمی برادری سے ہے (یہ ٹیلی گرام 31 اکتوبر 1947 کو وزیرِ اعظم نہرو کی جانب سے وزیرِ اعظم پاکستان کو بھیجا گیا)۔

3).....ہم نے الحاق قبول کرتے ہوئے بذریعہ طیارہ فوج بھیجی مگر اس شرط کے ساتھ کہ کشمیری عوام الحاق سے متعلق فیصلے میں شامل ہوں گے۔ ہم اس بارے میں محتاط ہیں کہ کشمیری عوام کو اپنی رائے کے اظہار کا مکمل موقع ملے بغیر جلدی میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو۔ ہمارا وعدہ، جسے مہاراجہ کی حمایت بھی حاصل ہے، نہ صرف کشمیری عوام بلکہ دنیا سے ہے۔ ہم اس سے نہ مکر سکتے ہیں نہ مکریں گے۔ امن و امان معمول پر آتے ہی اقوامِ متحدہ جیسی تنظیم کی بین الاقوامی نگرانی میں ریفرنڈم کرانے کو تیار ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ مرحلہ صاف و شفاف ہو۔ لوگوں کی جو رائے ہوگی ہم قبول کر لیں گے (2 نومبر 1947 کو وزیرِ اعظم نہرو کا قوم سے نشریاتی خطاب)۔

4).....میں آپ کی توجہ کل شام کو کشمیر کے بارے میں ریڈیو پر اپنے خطاب کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ اس میں بطور سرکاری پالیسی واضح کیا گیا کہ ہمیں کشمیر پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اس بارے میں آخری فیصلہ کشمیری عوام کا ہوگا۔ ہم اس پر راضی ہیں کہ اقوامِ متحدہ جیسا کوئی غیر جانبدار ادارہ ریفرنڈم کی نگرانی کرے (3 نومبر 1947 کو وزیرِ اعظم نہرو کا وزیرِ اعظم پاکستان کو ٹیلی گرام)۔

5).....ریاست کے الحاق کا فیصلہ عوام سے رجوع کے بعد ہونا چاہیے۔ ہم نے اپنی خوش نیتی کے اظہار کے لیے تجویز دی ہے کہ عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ اقوامِ متحدہ جیسے کسی غیر جانبدار ادارے کی نگرانی میں کریں (25 نومبر 1947 کو

وزیرِ اعظم نہرو کا بھارتی مجلسِ آئین ساز میں بیان)۔

6)..... یہ تاثر زائل کرنے کے لیے کہ بھارت ریاستی بحران سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، حکومت واضح الفاظ میں کہنا چاہتی ہے کہ بین الاقوامی نگرانی میں منعقد ہونے والے غیر جانبدار ریفرنڈم یا رائے شماری کے جمہوری طریقے کے ذریعے لوگ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے (اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے نام حکومتِ بھارت کا خط مورخہ 31 دسمبر 1947)

7)..... مستقبل میں ہمسایہ ممالک اور باقی دنیا کے سامنے کشمیر کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی اور یہ کہ ریاست بھارت سے الحاق ختم کر کے پاکستان سے الحاق کرے گی یا بطور آزاد ریاست اقوامِ متحدہ کی رکن بننا چاہے گی۔ ان سوالات کے فیصلے کا حتمی حق روزمرہ زندگی کی بحالی کے بعد صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے (15 جنوری 1948 کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل سے بھارتی مندوب گوپال سوامی آئینگر کا خطاب)۔

8)..... جیسا کہ سلامتی کونسل کے علم میں ہے۔ حکومتِ بھارت کا عہد ہے کہ امن کی بحالی اور تمام مہاجرین کی ریاست میں واپسی کے بعد ایک آزاد رائے شماری میں فیصلہ ہو کہ ریاست کے لوگ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، پاکستان میں شمولیت چاہتے ہیں یا آزاد شناخت اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ (23 فروری 1948 کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل سے بھارتی مندوب گوپال سوامی آئینگر کا خطاب)

9)..... حتیٰ کہ الحاق کے موقع پر ہم نے آگے بڑھ کے از خود کہا کہ ہم ریفرنڈم یا رائے شماری کے نتیجے میں کشمیری عوام کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ ہم نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ حکومتِ کشمیر فوری طور پر ایک مقبول عوامی حکومت ہونی چاہیے۔ ہم متواتر اپنے موقف پر جمے ہوئے ہیں کہ شفاف ووٹنگ کے ماحول میں رائے شماری اور اس کے نتائج قبول کرنے کو تیار ہیں (بھارتی مجلسِ آئین ساز سے وزیرِ اعظم نہرو کا خطاب مورخہ 5 مارچ 1948)۔

10)..... اگر آپ ثالثی مسترد کرتے ہیں تو یا تعطل پیدا ہوگا یا جنگ ہوگی۔ ہمارا تواتر سے کہنا ہے کہ ہم جنگ نہیں چاہتے۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے تحت ثالثی واحد راستہ ہے۔ ثالثی کی نوعیت کیا ہوگی۔ یہ بعد میں طے ہوسکتا ہے (نئی دلی میں وزیرِ اعظم نہرو کی پریس کانفرنس مورخہ 16 نومبر 1951)۔

11)..... بھارت کا یہ مسلسل موقف ہے کہ ہم کشمیری عوام کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینے کے لیے اقوامِ متحدہ کے تحت انتظامات کے لیے تعاون کریں گے۔ درحقیقت یہ بات ہم اقوامِ متحدہ کے اس جھگڑے میں آنے سے بھی پہلے سے کہہ رہے ہیں کہ فیصلے کا پہلا حق کشمیری عوام کا ہے اور پھر بھارت اور پاکستان کا ہے۔ اس بابت دونوں ممالک (بھارت اور پاکستان) نے بہت حد تک بنیادی خدوخال طے کر لیے ہیں۔ دونوں متفق ہیں کہ کشمیریوں کو اپنی داخلہ و خارجہ حیثیت کا فیصلہ خود کرنا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ سمجھوتہ نہ بھی ہو تب بھی کوئی ملک کشمیریوں کی مرضی کے خلاف کشمیر پر قابض نہیں رہ سکتا (وزیرِ اعظم نہرو کی لندن میں پریس کانفرنس مورخہ 16 جنوری 1951 جو 18 جنوری کو اخبار Daily Statesman میں شائع ہوئی)

کشمیر اور اقوامِ متحدہ کی قراردادیں:

یہاں اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کے متعلق جان لیں کہ کشمیر کے متعلق بارہ قرار دادیں پاس ہوئیں ۔ یہ

جنوری 1948 سے لے کر دسمبر 1957 کے درمیان میں منظور کی گئیں ان میں کئی قراردیں عملاً بھارت کے حق میں تھیں اور نظری طور پر پاکستان کے حق میں ہیں۔ یہ تمام قراردادیں شیڈول سات سے تعلق رکھتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نوعیت اصل میں سفارشی ہے۔ یعنی محض مشورہ۔ فریقین میں سے کوئی بھی اسے ماننے سے انکار کرسکتا ہے اور ان پر عمل درآمد لازمی نہیں ہے۔ یعنی یہ سب پاکستان کے کسی کام کی نہیں۔ اس کے برعکس عراق اور افغانستان پر جو کارروائی کی گئی تھی وہ ان قراردادوں کی منظوری کے بعد کی گئی تھی، جن پر عملدرآمد ضروری ہوتا ہے۔ یہ قراردادیں سلامتی کونسل کے آرٹیکل 25 کے تحت منظور کی گئی تھیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ کشمیر کی طرح متعدد دیگر ریاستیں بھی ایسی تھیں جنھوں نے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کرنا تھا، ایسی ہی ایک دوسری ریاست حیدرآباد تھی جو ان تمام ریاستوں میں بڑی اور امیر ترین تھی۔ جب کشمیر کی طرح حیدرآباد کی ریاست کے سربراہ نظام میر عثمان نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تو پاکستان کی طرح بھارت کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے وہ بھارت کے اندر تھی۔ چنانچہ 1948ء میں جب حیدرآباد اور کشمیر دونوں کا تنازع چل رہا تھا کہ گورنر جنرل ہندوستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Albert Victor Nicholas Mountbatten) اور سردار پٹیل مذاکرات کے لیے پاکستان آئے۔ اس موقع پر بھارت کی طرف سے تجویز آئی کہ حیدرآباد پر ہمارا حق مان لیں، ہم کشمیر پر آپ کا حق مان لیں گے۔ یعنی اس وقت بھارت خود کشمیر ہمیں دینے کو تیار تھا لیکن ہمارے وزیراعظم لیاقت علی خان نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں چند پہاڑیوں کی خاطر حیدرآباد دکن کو چھوڑ دوں؟ یوں یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت کی قیادت نے پلیٹ میں رکھ کر کشمیر بھارت کے حوالے کردیا۔ یہ بات پاکستان کے پہلے وزیراعظم چودھری محمد علی نے اپنی کتاب Emergence of Pakistan اور سردار شوکت حیات نے متاع گم گشتہ ("The Nation that Lost its Soul: Memoirs") کے صفحہ ۲۸ پر لکھی ہے۔

اس اہم تاریخی موڑ پر مؤرخ یہ ضرور کہے گا کہ قائداعظم کے بعد پاکستان میں ویژنی لیڈرشپ کی خاصی کمی رہی ہے۔

کشمیر حاصل کرنے کے بہترین مواقع جو ضائع ہوئے!

1962 میں بھارت چین لڑائی میں بھارت بری طرح پھنس گیا تھا۔ مگر پاکستان نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر پاکستان چاہتا تو چین سے پھینٹی کھایا ہوا بھارت ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتا اور ہم بزور کشمیر حاصل کرسکتے تھے۔ اس کے بالکل الٹ نہ جانے اس وقت کی قیادت کو اصول پسندی اور بھارت سے تعلق بہتر کرنے کی کیا فکر پڑ گئی کہ اس نے خود آگے بڑھ کر بھارت اور چین میں صلح کرانے کا ''مقدس'' فریضہ انجام دیا۔

دوسرا موقع اس وقت ملا جب ہم افغان جنگ میں امریکہ ہی نہیں پوری مغربی دنیا کی آنکھ کا تارا تھے۔ اس موقع پر ہم نے ایٹم بم تو بنالیا لیکن کشمیر کو اپنا بنانا پھر بھول گئے۔ جنرل ضیاء الحق دلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کی بات تو کرتے رہے لیکن کشمیر کے حوالے سے امریکا سے کچھ نہ منوا سکے۔

اگست 1988 میں مجاہدین نے بھارتی افواج کے خلاف مسلح آپریشن شروع کیا۔ (تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ) اقدام اس پس منظر میں کیا گیا کہ افغانستان کے محاذ سے ''بے روزگار'' ہونے والے مجاہدین کو نئی اسائن منٹ بھی تو دینی تھی اس کے بعد سے لے کر کم وبیش 2008ء تک بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رہی۔ اس میں کارگل اور سیاچین کے

معرکے بھی ہوئے)اس مسلح جدوجہد میں سینتالیس ہزار کشمیری اور دوسرے مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ جب کہ اسی عرصے میں آٹھ ہزار بھارتی فوجی بھی لقمہ اجل بن چکے ہیں۔اس وقت وادی کشمیر اور بعض شورش زدہ علاقوں میں تقریباً سات لاکھ بھارتی فوجی موجود ہیں۔اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زخمیوں کی تعداد کتنی ہوگی اور جان و مال وعزت وآبرو کے دوسرے نقصانات کتنے ہوں گے۔

معاہدہ لاہور، جنگ کارگل اور معاہدہ واشنگٹن:

یہ بات معلوم ہے کہ پاکستان کی قومی سطح کی بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف چاہتی ہیں کہ اس مسئلے کا جلد از جلد کوئی حل نکل آئے۔غیر سرکاری طور پر وہ اس کے ایسے حل پر بھی آمادہ ہیں جس میں بھارتی کشمیر کے مسلمانوں کو بھارت کے اندر رہتے ہوئے مکمل خود مختاری مل جائے۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ لائن آف کنٹرول (LOC) ہی کو مستقل سرحد قرار دے دیا جائے۔ پاکستان کے چار مزید بڑے سیاسی گروپ یعنی، اے این پی، ایم کیو ایم، بلوچستان کے نیشنلسٹ رہنما اور جمعیت علما اسلام فضل الرحمٰن گروپ بھی اس سے ملتے جلتے کسی بھی حل پر آمادہ ہیں۔البتہ مسلم لیگ کا نظریاتی گروپ، فوج، جماعت اسلامی اور کچھ اہم مذہبی رہنما پورے کشمیر (بشمول جموں ولداخ کے غیر مسلم اکثریتی علاقے) کے استصواب رائے اور اس کے نتیجے میں پاکستان سے الحاق ہی کو اس مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دور، جولائی 1989 میں بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کی پاکستان آمد کے موقع پر مسئلہ کشمیر لو پروفائل میں رہا۔اس کے بعد جب فروری 1999 میں بی جے پی سے تعلق رکھنے والے بھارتی وزیر اعظم واجپائی پاکستان میں میاں نواز شریف کی دعوت پر پاکستان آئے اور معاہدہ لاہور پر دستخط ہوئے تو اس پوری صورت حال کے متعلق دو بالکل متضاد اطلاعات ہیں۔میاں نواز شریف کے قریب ترین حلقوں کے مطابق اس امر پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ وادی کشمیر (جموں اور لداخ کے بغیر) کو مکمل خود مختاری دی جائیگی۔اس کا اپنا وزیر اعظم ،جھنڈا اور کرنسی ہوگی۔اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ وادی کی خارجہ پالیسی اور دفاع کا کیا انتظام کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ اگلے ایک سال کے اندر ان دونوں مسائل کا حل بھی تلاش کر لیا جائے گا اور یہ کہ ان سب امور کو آخری لمحے تک خفیہ سفارتکاری کے ذریعے سے طے کیا جائے گا۔

اس کے بالکل برعکس ایک دوسرے حلقے کا یہ کہنا ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔میاں نواز شریف اس مسئلے کو اٹھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔اسی لئے معاہدہ لاہور کے ابتدائی مسودے میں اس کا ذکر بہت بے جان الفاظ میں کیا گیا تھا۔اور سابق صدر پرویز مشرف اور اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف کے اصرار پر ان الفاظ میں ردوبدل کر دیا گیا۔ (مستقبل ہی میں ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ کونسی بات صحیح تھی۔البتہ سابق صدر پاکستان رفیق تارڑ نے ایک انٹرویو میں اور مسلم لیگی رہنما صدیق الفاروق نے اپنی کتاب ''معرکہ کارگل'' میں پہلی بات کی تصدیق کی ہے۔)

اس کے بعد فروری 1999 میں جنگِ کارگل پیش آ گئی۔اس جنگ کے متعلق بھی دو بالکل مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ اس وقت کی طاقتور اسٹیبلشمنٹ نے معاہدہ لاہور کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔اس لئے اس نے سیاسی حکومت سے بالا ایک پلان تیار کیا۔اس پلان کے مطابق کارگل کے علاقے میں اس تمام علاقے پر دوبارہ قبضہ مقصود تھا جو معاہدہ شملہ کے تحت بھارت کے قبضے میں رہنے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ان مہینوں میں

جب کہ سردی اور برف باری کی وجہ سے کارگل کی چوکیاں خالی ہوتی تھیں، پاکستانی فوج نے لائن آف کنٹرول پار کر کے ان پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سیاسی قیادت کو صرف یہی بتایا گیا کہ پاکستانی فوج اس علاقے میں کنٹرول لائن کی اپنی طرف فوجی مشقیں کر رہی ہے۔ مئی کے پہلے ہفتے میں بھارتی وزیراعظم نے پاکستانی وزیراعظم کو فون کر کے اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب پاکستانی وزیراعظم کو یہ معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج نے لائن آف کنٹرول کو پار کرلیا ہے۔ مگر اس وقت ان کے لئے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب پوری دنیا کی توجہ اس لڑائی کی طرف مبذول ہوگئی اور جب امریکن سیٹلائٹ کی تصویروں کی وجہ سے پاکستان کے لئے ان چوکیوں تک اسلحہ اور سامان رسد پہنچانا ناممکن ہوگیا تو اس منصوبے کے کرتا دھرتا اس وقت کی فوجی قیادت نے نواز شریف سے درخواست کی کہ وہ بل کلنٹن کو درمیان میں لاکر جنگ بندی کروائیں اور یہ ضمانت حاصل کریں کہ ''مجاہدین'' کے پیچھے ہٹتے وقت ان پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ نواز شریف کو واشنگٹن جانا پڑا اور لائن آف کنٹرول کے احترام کے وعدے کے بدلے پاکستانی ''مجاہدین'' کے پرامن پیچھے ہٹنے کی ضمانت حاصل کرلی۔

اس کے بالکل برعکس دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ نواز شریف کو اس آپریشن کے بارے میں پہلے دن سے ہی اعتماد میں لیا گیا تھا۔ واشنگٹن بھی نواز شریف از خود گئے۔ فوج نے تو مستقل طور پر سیاسی حکومت کے فیصلوں کے مطابق عمل کیا۔

اِن دو نقطہ ہائے نظر میں کون سا صحیح ہے۔ اس کا فیصلہ بھی مستقبل قریب کی تاریخ میں ہوجائے گا۔ البتہ بیرونی دنیا بالعموم پہلے نقطہ نظر کو صحیح سمجھتی ہے اور اس کے حق میں کئی شواہد پیش کرتی ہے۔

اسی طرح لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالمجید ملک نے اپنی کتاب ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں کارگل اپریشن پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ جنرل ملک میاں محمد نواز شریف کی کابینہ میں وفاقی وزیر برائے امورِ کشمیر بھی تھے۔ اور ان کے مطابق فروری 1999ء میں پاکستانی فوج نے کارگل کی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سڑک جو لداخ اور لیہہ کو سری نگر سے ملاتی ہے اور بھارت کی سپلائی لائن کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے کی 16000 فٹ کی بلندی پر بیٹھ کر نگرانی کی جاسکے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس ساری پلاننگ کے محرک چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف، جنرل محمود کمانڈر 10 کور اور میجر جنرل جاوید حسن کمانڈر ناردرن ایریاز تھے۔ اس کے علاوہ جنرل محمد عزیز جو اُس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے اور جنرل توقیر ضیاء جو ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن تھے وہ بھی اس منصوبہ سازی میں شریک تھے۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے جب ایکشن لیا گیا تو بقول آرمی ہائی کمان کشمیر کی آزادی کے لئے سرگرم مجاہدین نے ان چوٹیوں پر قبضہ کرلیا۔ پاک آرمی نے اس آپریشن کو ''آپریشن بدر'' کا نام دیا۔ یہ واقعہ فروری 1999 کا ہے۔'' وہ مزید رقمطراز ہیں:

''میرے علم میں ہے کہ بعد میں جب (سابق چیف آف آرمی سٹاف) اشفاق پرویز کیانی (جو کہ 1999 میں کشمیر کے دفاع پر مامور 12 ڈویژن کی کمان کر رہے تھے) کو کارگل آپریشن کی اطلاع ملی تو وہ اس کے پورے مخالف تھے۔''

''اپریل اور مئی 1999 میں جب حالات کافی سنگین ہوگئے تو آرمی کمان نے فیصلہ کیا کہ حکومت کو باقاعدہ

طریقے سے ساری پوزیشن کے بارے میں بریفنگ دی جائے۔ 17 مئی کو ISI ہیڈکوارٹر میں میٹنگ ہوئی جس میں فوج کی طرف سے جنرل پرویز مشرف، جنرل محمود، جنرل عزیز، جنرل جاوید حسن، جنرل توقیر ضیاء اور بریگیڈئر ندیم شامل تھے۔ حکومت کی طرف سے وزیراعظم نواز شریف اس میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے اور ان کے ساتھ سرتاج عزیز (وزیر خارجہ)، سیکرٹری ڈیفنس جنرل افتخار علی خان (چودھری نثار علی خان کے بھائی) شامل تھے۔ اور میں بھی بحیثیت وفاقی وزیر برائے امورِ کشمیر موجود تھا۔ وزارتِ خارجہ کی طرف سے شمشاد احمد خان سیکرٹری اور مسٹر فاطمی ایڈیشنل سیکرٹری بھی موجود تھے۔''

''کارگل آپریشن کے بارے میں یہ پہلی باقاعدہ میٹنگ تھی (یعنی آپریشن کے تین ماہ بعد).....سب سے پہلے سرتاج عزیز نے اپنے انداز میں اس آپریشن کی مخالفت کی اور کہا کہ وزیر خارجہ کی حیثیت سے سفارتی سطح پر وزارتِ خارجہ کے لئے اس آپریشن کا دفاع کرنا ناممکن ہوگا۔ لیفٹیننٹ جنرل افتخار علی خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدانخواستہ اگر یہ جنگ اور پھیل گئی تو ہمارے پاس اس طرح کے فوجی وسائل نہیں کہ ہم اس جنگ کے متحمل ہوسکیں۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے بھی اس آپریشن کی مخالفت کی۔'' (ہم بھی وہاں موجود تھے، ص240 تا243)

معرکہ کارگل نے بھارت کو بہت زیادہ فائدہ اور پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس پورے معرکے کے دوران میں بھارت کے اندر اپنی حکومت کے لئے بہت جوش وخروش اور اتحاد دیکھنے میں آیا۔ اس کے برعکس پوری دنیا نے پاکستان کو وعدہ خلاف، جھوٹا اور ناقابل اعتماد ملک قرار دیا۔ چین اور سعودی عرب جیسے دوست ممالک نے اس آپریشن پر ناراضی کا اظہار کیا۔ فوجی اعتبار سے بھی پاکستان گھاٹے میں رہا اور اس آپریشن کے بعد ان علاقوں میں بھارت کا قبضہ پوری طرح مستحکم ہوگیا۔ اس آپریشن پر پاکستان کے پچاس ارب روپے خرچ ہوئے۔

معاہدہ واشنگٹن سے بھی پاکستان ایک کمزور اور امریکہ کے طفیلی ملک کی حیثیت سے سامنے آیا۔ یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس میں بھارت سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ ایسے معاہدے اور پاکستانی فوج کی بحفاظت واپسی کی ضمانت کے لئے پاکستانی وزیراعظم کو واشنگٹن جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہیں سے امریکی صدر اور بھارتی وزیراعظم کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے اور بحفاظت واپسی کی ضمانت حاصل کر سکتے تھے۔ کیونکہ ایسی واپسی خود بھارت کے مفاد میں تھی۔

کیا ہی بہتر ہوتا اگر اس معاملے کی اعلیٰ سطح پر جوڈیشل انکوائری کرا کے ذمہ داران کا تعیّن کیا جاتا تاکہ آئندہ کسی کو قومی عزت اور وقار کو مجروح کرنے کا موقع نہ ملتا۔

موجودہ حالات میں چند اہم حقائق:

☆.....اس مسئلے نے بھارت اور پاکستان دونوں ریاستوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن بھارت کی نسبت اس سے پاکستان کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوسکیں، پاکستان پر بیرونی واندرونی قرضوں کا بوجھ آپڑا ہے، حکومتیں دفاعی بجٹ کے بوجھ تلے دب کر تعلیم اور صحت کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دے سکیں۔ ان کے عوامل میں سب سے بڑا عامل کشمیر کا مسئلہ ہے۔ بھارت کو بھی اس مسئلے سے نقصان پہنچا ہے لیکن ایک بڑا ملک ہونے کے ناتے وہ ان کو جذب کرنے میں نسبتاً کامیاب رہا ہے۔

☆.....اس وقت یہ بڑی طاقتوں کے مفاد میں ہے کہ بھارت اور پاکستان میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔اس لئے کہ اب یہ دونوں طاقتیں ایٹمی صلاحیت کی حامل بھی بن گئی ہیں اور دونوں کے درمیان اس مسئلے پر اگر کبھی جنگ چھڑ جائے تو اس کے بہت خوفناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔تاہم بین الاقوامی طاقتوں میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ ان دونوں ملکوں پر کوئی حل مسلط کر سکے۔

☆..... پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ دونوں ملکوں میں سے کسی کے بھی مفاد میں نہیں۔فی الوقت پاکستان کے پاس لڑنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چالیس دن کا روایتی اسلحہ ہے جب کہ بھارت کے پاس اسی ((80 دن تک لڑنے کا اسلحہ موجود ہے۔گویا جب بھی لڑائی شروع ہوئی تو چند ہفتے بعد دونوں کو جنگ بندی پر مجبور ہونا پڑے گا۔جہاں تک ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے کا سوال ہے تو اس کو دونوں میں سے کوئی بھی ملک پسند نہیں کرے گا۔اس لئے کہ اس سے دونوں تباہ ہو جائیں گے۔اور اس سے جو کچھ بچ جائے گا، اس پر بڑی طاقتیں آ کر قبضہ کر لیں گی، یوں کشمیر پر لڑتے لڑتے سارا برصغیر اپنے آپ کو تباہ کر دے گا۔

☆..... جہاں بھارت کا روس سے دفاعی معاہدہ موجود ہے، وہاں فی الوقت کشمیر کے مسئلے پر کوئی بھی ملک پاکستان کی پشت پر نہیں کھڑا۔مسلمان ممالک بڑی نیم دلی سے پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔اور ان کے تجارتی تعلقات پاکستان کی نسبت بھارت سے کہیں زیادہ ہیں۔چین بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ایک حد سے زیادہ پاکستان کی مدد نہیں کر سکتا۔اسی لئے 1965,1971,1985 سمیت کارگل کے معرکے تک وہ پاکستان کی عملی مدد نہیں کر سکا۔

☆.....امریکہ کے لئے بھارت اور پاکستان دونوں اہم ہیں۔بھارت اس کے لئے ایک بہت بڑی منڈی ہے۔وہ کلچر کے اعتبار سے بھی اس سے قریب تر ہے۔دوسری طرف امریکہ پاکستان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔اس لئے کہ پاکستان عالم اسلام اور اس خطے کا سب سے اہم ملک ہے۔چنانچہ امریکہ کشمیر کے مسئلے پر ہمیشہ افہام وتفہیم کی پالیسی اپنائے گا۔

☆.....کشمیر میں جاری مسلح جدوجہدِ آزادی کو بھارت دہشت گردی کے روپ میں پیش کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔اور اس کوشش میں اسے کافی کامیابی بھی ملی ہے۔دنیا عام طور پر یہ بات مانتی ہے کہ اس کی سرپرستی پاکستان کر رہا ہے۔بھارت پاکستان کو بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کا مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔اس حوالے سے پاکستان کو اسی قسم کے معاہدے کی طرف بڑھنا ہوگا جس قسم کا معاہدہ واجپائی اور نواز شریف کی حکومتوں میں 1999 میں ہونے کے قریب تھا۔

☆..... پاکستانی حکومت کو چاہیے کہ کشمیری پاکستانی نژاد برطانوی دارالعوام اور دارالامراء کے ارکان سے مل کر ایک منظم طریقے سے بین الاقوامی سطح پر تحریک چلائیں جس کے اغراض ومقاصد واضح ہوں۔اسی طرح امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک میں اسی نوعیت کا کام شروع کیا جائے اور سفارت خانوں کو نئے سرے سے منظم کر کے ایک ٹارگٹ مشن کے تحت کام کیا جائے۔

کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ:

1950 میں انڈین آئین عمل میں آنے کے بعد انڈیا نے آرٹیکل 1(3) اور 370 کے تحت کشمیر کو ملک کا حصہ بنا

دیا۔ آرٹیکل 370 کو، جس کا مقصد خودمختاری کی صورت پیدا کرنا تھا، کشمیر کے مخصوص حالات کی وجہ سے آئین میں شامل کیا گیا۔ اسی شق کے ذریعے 1950 کے بعد انڈیا اور کشمیر کے درمیان موجود رشتے کو وضع کیا گیا۔ آرٹیکل 370 میں اس بات کو دہرایا گیا کہ انڈین پارلیمان کے پاس صرف ان شعبوں میں قانون سازی کا حق ہوگا جو معاہدۂ الحاق میں وضع کیے گئے ہیں۔ یعنی آرٹیکل 370 کے تحت انڈین پارلیمان کے پاس ریاست جموں کشمیر کے لیے صرف دفاع، مواصلات اور خارجہ امور سے متعلق قانون سازی کا محدود اختیار تھا۔ تاہم آرٹیکل 370 کے ہی تحت صدر کو دیے گئے اختیارات کا مطلب یہ تھا کہ سترہ نومبر 1952 کے بعد ان کے پاس احکامات جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔ تاہم ایک اہم صدارتی آرڈر کو، 'کانسٹیٹیوشن اپلیکیشن ٹو جموں کشمیر آرڈر 1950'، 'پروسپیکٹو لی' جاری کیا گیا۔ اس آرڈر کے ذریعے ان شعبوں میں نئے شعبے جوڑے گئے جن پر وفاقی پارلیمان کو کشمیر کے لیے قانون سازی کا اختیار تھا اور پہلے سے موجود شعبوں میں تبدیلی کی گئی۔ ان میں آئین میں ترامیم کی دفعات (آرٹیکل 368) اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 اور انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ 1947 کو ختم کرنے کی دفعات، جہاں تک ان کا تعلق کشمیر سے تھا، ان کا اطلاق انڈیا کے زیر انتظام کشمیر تک بڑھا دیا گیا۔ یوں آرٹیکل 370 کے ذریعے تقریباً 205 وفاقی قوانین کو کشمیر منتقل کیا گیا۔ آرٹیکل 370 کے تحت جموں کشمیر آئین ساز اسمبلی کے اتفاق اور انڈین صدر کے احکامات کے ذریعے ان شعبوں میں مزید وسعت کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔ تاریخی اعتبار سے 1950 کے آرڈر کے تحت انڈیا کے صدر کے پاس جموں کشمیر آئین ساز اسمبلی کی منظوری کے بغیر آرٹیکل 370 کو تبدیل کرنے یا ختم کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ یعنی آرٹیکل 370 میں کسی بھی ترمیم کے لیے نامزد اسمبلی کی رضامندی ضروری تھی۔''

پانچ اگست 2019 کو انڈیا کے زیر انتظام کشمیر پر ایک مکمل لاک ڈاؤن نافذ کرنے کے بعد سخت گیر ہندو قوم پرست جماعت بی جے پی کی قیادت میں انڈین حکومت نے یکطرفہ طور پر، کشمیر کی ریاستی اسمبلی سے مشاورت کے بغیر (جو کہ گورنر راج کی وجہ سے اس وقت فعال نہیں تھی) کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کر دیا۔ اس دوران انڈیا نے کشمیر میں موجود اپنی فوجوں میں اضافہ کیا جس سے کشمیر میں انڈین فوج کی مجموعی تعداد ساڑھے سات لاکھ تک پہنچ گئی۔ کشمیر پر مکمل مواصلاتی پابندی لگا دی گئی۔ ہزاروں افراد کو بنا کسی فرد جرم کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ عالمی نشریاتی اداروں مثلاً بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق:

کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے کا مطلب ہے کہ انڈین آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کے تحت کیے گئے وعدے اب نہیں رہے اور انڈیا کے زیر انتظام کشمیر پر اب دلی کی براہ راست حکومت ہے۔ اس سے ریاستی پرچم، ریاست کا آئین اور سینکڑوں ریاستی قوانین بھی بیکار ہو گئے اور سیاسی، انتظامی اور قانونی نقطہ نظر سے سب کچھ تھم گیا۔ اس کے بعد انڈیا نے 18 مئی 2020 کو جموں و کشمیر یونین ٹیریٹوری کے لیے ڈومیسائل کے نئے قواعد متعارف کرائے جن کے تحت انڈیا کے کسی بھی حصے سے لوگ کشمیر کا ڈومیسائل حاصل کر سکتے ہیں۔ آرٹیکل 370 اور 35A کے تحت حاصل ضمانتوں کے تحت یہ ممکن نہیں تھا۔ دی جموں اینڈ کشمیر ری آرگانائیزیشن آرڈر 2020 کے تحت ڈومیسائل کی تعریف بدل دی گئی تاکہ غیر کشمیریوں کے لیے مستقل رہائش حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ اس کا مقصد کشمیر کے متنازع خطے میں آبادی کے تناسب کو بدلنا ہے۔ ترمیم شدہ ڈومیسائل قانون کی وجہ سے کشمیریوں کے لیے ملازمت میں بھی مواقع کم ہو جائیں گے کیونکہ اب

کشمیر میں موجود نوکریوں کے لیے غیر کشمیری بھی درخواست دے سکیں گے۔ اس طرح کے خدشات کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے کہ آبادی کے تناسب میں تبدیلی سے کسی بھی رائے شماری کے نتائج پر اثر پڑے گا۔ کئی مبصرین نے اس ڈومیسائل قانون میں اس تبدیلی کو 'اسرائیلی طرز' کی یہودی آبادیوں کی طرف ایک قدم قرار دیا ہے، جس سے آخر کار کشمیر کی مسلمان اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی جس کے بعد اس کی نسل کشی آسان ہو جائے گی۔ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے سے پہلے انڈیا کے زیر انتظام جموں کشمیر کی ریاستی قانون ساز اسمبلی سے مشاورت نہیں کی گئی جو کہ آرٹیکل 370(3) کے تحت لازمی تھا۔ کشمیر کی اسمبلی کو جون 2018 میں اس وقت تحلیل کر دیا گیا تھا جب پی ڈی پی اور بی جے پی کے درمیان اتحاد ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انڈیا کے زیر انتظام کشمیر پر گورنر راج اور پھر صدارتی راج نافذ کر دیا گیا تھا۔ انڈیا کے زیر انتظام کشمیر میں کوئی منتخب حکومت نہیں تھی، تاہم 2019 کے صدارتی حکم نامے کے مطابق گورنر ریاستی اسمبلی کے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے آرٹیکل 370 کے بارے میں اپنی سفارشات صدر کو دیں گے۔ آرٹیکل 370 کو ختم کرنے کا مقصد پورا کرنے کے لیے 2019 کے صدارتی حکم نامے میں 'آئین ساز اسمبلی' کو بدل کر ریاست کی 'قانون ساز اسمبلی' کر دیا گیا۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ آرٹیکل 370(3) کے مطابق آرٹیکل 370 صدارتی حکم نامے سے ختم ہو سکتا ہے تاہم اس کے لیے 'آئین ساز اسمبلی' کی سفارش لازمی ہے۔ یہ تمام آئینی ترامیم غیر آئینی تھیں کیونکہ انڈیا کے زیر انتظام کشمیر میں پہلے سے ہی صدارتی راج نافذ تھا اور 2019 کے صدارتی حکم نامہ کے دعوے کے برعکس ریاست کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔"



نواں باب

مسئلہ فلسطین: قیام اسرائیل تک

مسئلہ فلسطین دنیا کا سب سے پیچیدہ، قدیم اور حساس مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ اس عالمگیر مسئلے کے ساتھ تینوں آسمانی مذاہب یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام جڑے ہیں۔ ان مذاہب کے درمیان نسل، کلچر اور عقائد و عبادات کے تمام تر اختلافات اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

اس وقت موجودہ اسرائیل کا رقبہ تقریباً اکیس ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی 8,462000 (چوراسی لاکھ باسٹھ ہزار) ہے۔ اس آبادی میں یہودیوں کی تعداد (74.9%) 6,335,000 جبکہ عرب مسلمان (20.7%) 1,757,000 اور عیسائی عرب (4.4% 370,000) ہیں۔ جس علاقے پر اسرائیل نے جون 1967 کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور جس کے متعلق فلسطینی قیادت کا دعویٰ ہے کہ یہی مستقبل کی فلسطینی ریاست ہے۔ اس میں سے ایک علاقہ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے اسرائیل کی سرحد تک ہے۔ اس علاقے کا رقبہ چھ ہزار مربع کلومیٹر سے کچھ کم ہے اور اس کی آبادی بیس لاکھ ہے۔ اسے عام طور پر غربِ اردن (West Bank) کہا جاتا ہے۔ دوسرے علاقے کو غزہ کی پٹی (Gaza Strip) کہتے ہیں۔ یہ اسرائیل کی مغربی سرحد، مصر اور بحیرہ روم (Mediterranean Sea) میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی پٹی ہے۔ جس کا رقبہ تین سو ساٹھ مربع کلومیٹر ہے اور جس کی آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ گویا مجوزہ فلسطینی ریاست میں اکتیس لاکھ فلسطینی رہتے ہیں۔

عہد فاروقی میں بیت المقدس کی فتح:

ساتویں صدی عیسوی (سن 638ء) میں حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کیا۔ اُس وقت ہیکل سلیمانی کا پورا علاقہ کھنڈرات بنا ہوا تھا۔ کیونکہ نصرانیوں نے یہودیوں کی دشمنی میں اسے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس علاقے کو صاف کرایا اور اس کے جنوبی حصے میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لئے مخصوص فرمائی۔ یہاں ہم حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے دورے کا ایک انتہائی اہم واقعہ درج کرتے ہیں جو مسلمانوں کی رواداری اور دوسرے مذاہب کے بارے میں برداشت (Tolerance) کی بہترین مثال ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے قیام کے دوران ان سے شکایت کی گئی کہ بڑے کلیسا میں رکھے ایک مقدس مجسمے کو مسلمان سپاہی کی تلوار کا دستہ لگنے سے نقصان پہنچا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس مجسمے کو اسلامی خزانے کے خرچ سے مرمت کرایا جائے۔ (بحوالہ عمر فاروق از محمد حسین ہیکل) یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق یہودیوں اور قرآن مجید کے موقف کے اختلاف کو سمجھا جائے۔ یہودیوں کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی پوری نسل کو پروردگار نے اپنی چہیتی نسل قرار دیا۔ چنانچہ یہ نسل باقی پوری دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔ اسی نسل کو پروردگار نے فلسطین کا سارا علاقہ حوالے کیا اور ہیکل سلیمانی (Solomon's Temple) کو اس کا قبلہ بنایا۔ چنانچہ اس علاقے میں آباد ہونا ان کا حق ہے۔

جبکہ قرآن مجید کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو فضیلت ایک خاص مقصد کے لئے دی گئی تھی، وہ یہ کہ وہ خود بھی پروردگار کے احکام پر عمل کریں گے اور پوری دنیا میں توحید کا پیغام پھیلائیں گے۔

چنانچہ جب تک وہ یہ کام کرتے رہے، پروردگار ان پر انعام فرماتا رہا۔ اور جب وہ اس کو پس پشت ڈالتے تو پروردگار ان کو سزا دیتا تھا۔ چونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور اپنی طرف سے ان کو قتل کرانے کی کوشش کی، اس لئے پروردگار نے ان سے یہ فضیلت واپس لے لی اور آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے۔ اس بحث کے بعد ہم ایک دفعہ پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ہونے کے بعد اگلے ساڑھے چار سو برس تک یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر حکومت رہا۔ 1078ء میں سلجوقی ترکوں نے یروشلم پر قبضہ کیا۔ ان کے بیس سالہ دور حکومت میں نصرانی زائرین کے ساتھ مبینہ طور پر ناروا سلوک کیا گیا اور اس کے بعد 1099ء میں ایک متحد صلیبی لشکر نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اٹھاسی سال کے بعد اکتوبر 1187ء میں مسلمانوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی (1193-1137) کی قیادت میں دوبارہ یروشلم کو فتح کر لیا۔

صلاح الدین ایوبی اور بیت المقدس:

صلاح الدین ایوبی نسلاً عراقی کُرد تھے۔ وہ مصر میں فاطمی خلیفہ العابد کے دربار میں وزیر تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اگرچہ سنی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے اور فاطمی حکمران شیعہ تھے لیکن اپنی سپہ سالارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے خلیفہ کے بہت نزدیک تھے۔ جب خلیفہ کا 1171ء میں انتقال ہوا تو نالائق وارثوں کو دیکھ کر انھوں نے اقتدار پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ انھوں نے تمام بغاوتوں پر قابو پا کر مصر میں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی۔ وہ چاہتے تو بغداد کی کمزور عباسی خلافت پر بھی قبضہ کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنی حکومت کو خلافت کے ماتحت کر کے ایک دفعہ پھر تمام مسلمانوں کو متحد کر دیا۔ اپنے لیے انھوں نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور اردگرد کی تمام مفاد پرست اور نااہل مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے مصر، شام، الحجاز اور فلسطین پر ایک مضبوط اور اپنے وقت کی عوام دوست فلاحی حکومت قائم کی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اپنا یہ دعویٰ سچ کر دکھایا کہ انھیں اقتدار اور سلطنت کی وسعت سے کوئی غرض نہیں، وہ بیت المقدس پر صلیبی اقتدار ختم کر کے اسے اسلامی خلافت کے زیر تحت لانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں پر مسیحیوں کا ظلم ختم ہو اور قبلہ اول تمام آسمانی مذاہب کے لیے یکساں طور پر وقف ہو جائے۔ چنانچہ اکتوبر 1187ء میں جب انھوں نے بیت المقدس فتح کیا تو حضرت عمرؓ کی طرح کوئی خون خرابہ نہیں کیا اور شہر کو انتہائی امن سے کنٹرول میں لیا۔ اپنے وعدے کے مطابق انھوں نے بیت المقدس کو تینوں مذاہب کے لیے یکساں طور پر کھولے رکھا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید سو سال تک مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں تاہم مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ اسی کو تاریخ میں صلیبی جنگیں (Crusades) کہتے ہیں۔ گویا نصرانیوں کے اٹھاسی سالہ اقتدار کے بعد یروشلم پر اگلے آٹھ سو برس یعنی پہلی جنگ عظیم تک مسلمانوں کا اقتدار رہا۔

خلافت عثمانیہ میں بیت المقدس کا انتظام:

1517ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور اگلے چار سو برس تک یہ علاقہ عثمانی سلطنت (Ottoman Empire) کا حصہ رہا۔ ہر آمرانہ حکومت کی طرح اس میں آہستہ آہستہ خرابیاں در آتی گئیں۔ کرپشن، عیاشی اور سازشیں پروان چڑھتی

گئیں۔اجتماعی اخلاقیات دن بدن گرتی گئیں۔اس حکومت نے اپنی مقبوضات کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا۔اس دور میں سب عرب ممالک اس سلطنت کا حصہ تھے،لیکن یہ سب کے سب ترکوں کے برے سلوک کی وجہ سے اپنے آپ کو ترکوں کا غلام سمجھتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ جہاں یورپ جمہوریت اور سائنس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہا تھا،عثمانی سلطنت نے ان دونوں کے لئے اپنے دروازے بند کر لئے اور ہر سلطان نے اپنی حکومت بچانے کی جدوجہد ہی کو اپنا مقصد سمجھا۔چنانچہ یہ سلطنت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی۔حکومت کا سارا نظام قرضوں کے سہارے چلنے لگا۔یورپی ممالک سے لئے گئے ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے جب صوبوں پر اضافی ٹیکس لگائے گئے تو اکثر صوبوں نے بغاوت کر دی۔حتیٰ کہ اکثر مقبوضات ترکی کے ہاتھ سے نکل گئیں۔اس پورے دور میں مذہبی طبقہ عام طور پر سلاطین کا حامی رہا۔چنانچہ عام لوگ،سلاطین اور مذہبی طبقہ دونوں کے خلاف ہو گئے۔

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ:

1908ء میں سلطان عبدالحمید کو برطرف کر دیا گیا اور ایک موثر قوم پرست تنظیم (Young Turk Revolution) یعنی نوجوان ترکوں نے اقتدار سنبھال لیا۔اس تنظیم کی قیادت کمال پاشا کر رہے تھے۔اس حکومت نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ اس نے 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کی ابتدا سے جرمنی سے خفیہ معاہدہ کر لیا اور اتحادی افواج جن میں (برطانیہ،فرانس،روس اور بعد میں امریکہ بھی شامل ہو گیا)،کے خلاف اعلان جنگ کر دیا،اور روسی بندرگاہوں پر بمباری شروع کر دی۔یہ ایک بھیانک غلطی تھی۔ترکی کے لئے سب سے اچھی پالیسی غیر جانبداری کی تھی۔بہرحال اس اعلان جنگ کے بعد اتحادی افواج نے ترک مقبوضات پر بھی حملہ شروع کیا اور یروشلم دسمبر 1917ء میں برطانوی فوج کے قبضے میں چلا گیا۔یروشلم کے تمام مسلمان باشندوں نے ترکی حکومت کی مخالفت میں برطانوی فوج کا نجات دہندہ کے طور پر استقبال کیا۔

اسلامی ریاستوں میں یہودیوں کی حالت:

تاہم سپین کے مسلم عہد اور شمالی یورپ کے بعض ممالک میں ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔صلیبی جنگوں کے دوران نصرانیوں نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کا بھی خوب قتل عام کیا۔(۱) جبکہ عثمانی ترکوں کے عہد میں بھی یہودیوں کے ساتھ غیر مناسب سلوک کیا گیا۔مغربی یورپ میں جمہوریت آنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے ساتھ سلوک میں بھی بہتری آتی گئی۔تاہم روس اور جرمنی میں ان کے ساتھ بہت برا سلوک روا رکھا گیا۔زارِ روس ان کا سخت مخالف تھا۔سترہویں صدی کے لگ بھگ یہودیوں میں اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔اور مختلف مقامات پر یہودیوں نے اپنی مقامی تنظیمیں بنانی شروع کر دیں۔

یوں تو یہودیوں میں یہ احساس بھی سترہویں صدی سے ہی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا اصل وطن فلسطین ہے جہاں انہیں واپس جانا چاہیے مگر اس کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل جرمنی کے ایک مشہور دانش ور اور وکیل تھیوڈر ہرزل (Theodor Herzl) نے دی،جس نے 1895 میں صیہونیت (Zionism) کے نام سے یہ تحریک شروع کی۔زایان یا صیہون دراصل یروشلم کے قریب ایک پہاڑی کا نام ہے۔ابتدا میں یہ خیال بھی تھا کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں

یہودی امن سے رہ سکیں اور اس ضمن میں نظر انتخاب یوگنڈا پر گئی۔ تاہم یہودیوں کی اکثریت نے اسے نامنظور کر کے فلسطین ہی کو اپنی منزل قرار دیا۔ 1881ء میں فلسطین میں صرف چوبیس ہزار یہودی تھے۔ روس میں زار کے ظلم سے بچنے کے لئے بہت سے یہودیوں نے روس چھوڑ کر فلسطین کا رخ کیا۔ چنانچہ 1914 میں فلسطین میں پچاسی ہزار یہودی آباد تھے۔ اُس وقت وہاں فلسطینیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ (2)

قیام اسرائیل کے وقت یہودیوں کی حالت:

اُس وقت! بین الاقوامی صورت حال کیا تھی، اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔ انیسویں صدی میں سلطنت برطانیہ سب سے بڑی طاقت تھی، مگر اس صدی کے دوسرے آخر میں جرمنی بھی ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا۔ یہ دونوں اور یورپ کی باقی طاقتیں صنعتی اعتبار سے ترقی کی منازل طے کر رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کے درمیان خام مال، تیار مال کی فروخت اور دوسرے وسائل کے لئے مقابلہ لازمی تھا۔ چنانچہ ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس کا اتحاد بن گیا اور دوسری طرف جرمنی، اٹلی، آسٹریا اور ہنگری کا اتحاد بن گیا۔ اس منظر نامے میں ترکی کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ ہر اعتبار سے پس ماندہ تھا اور اسی لئے یورپ کا مرد بیمار کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم 1914ء میں چھڑ گئی تو ترکی نے بلاضرورت اس میں جرمنی کا ساتھ دیا اور روسی بندرگاہوں پر حملہ کر کے اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا بھی کر دی۔ چنانچہ برطانیہ اور اس کی اتحادی افواج نے ترکی مقبوضات، جن میں فلسطین بھی شامل تھا، کو اپنا ٹارگٹ بنالیا۔

اب دیکھئے کہ اُس وقت عالم عرب کی صورت حال کیا تھی۔ 1517ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کے لگ بھگ مصر سمیت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی ترکوں کے قبضے میں چلے گئے۔ عربوں میں قبائلی معاشرت تھی اور ترکوں کا رویہ ان کے ساتھ حاکمانہ تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹتی رہیں۔ قوم پرستی کا جذبہ بڑھتا رہا۔ اور ترک انتہائی بے رحمی کے ساتھ مختلف بغاوتوں کو کچلتے رہے۔ چنانچہ پورے عالم عرب میں بلحاظ مجموعی ترکوں کے خلاف نفرت کی ایسی فضا پیدا ہوگئی کہ وہ ترکوں کے خلاف ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بعض جاسوسوں کو عربوں کے درمیان بھیجا جو ترک عرب اختلافات کو ہوا دیتے تھے اور عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر اکساتے تھے۔ ایسے ہی جاسوسوں میں لارنس آف عربیہ (ThomasEdward Lawrence 1888 – 1935) بہت کامیاب رہے۔ وہ ایک برطانوی فوجی تھے اور انھوں نے دمشق میں امیر فیصل کے ساتھ مل کر ترکوں کے خلاف کامیاب بغاوت کرائی۔

جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو برطانیہ نے ترکی کو شکست دینے کے لئے ایک پلان بنایا۔ اس پلان کے تحت برطانیہ نے ایک طرف دنیا بھر کے یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، جواب بہت مالدار ہو چکے تھے اور جن کے پیسے اور علم و ہنر کی برطانیہ کو سخت ضرورت تھی۔ دوسری طرف برطانیہ نے ان عرب طاقتوں کی حمایت کا اعلان کیا جو ترکوں سے برسر پیکار تھے۔ کیمسٹری کے ایک یہودی پروفیسر ڈاکٹر وائزمین (Chaim Azriel Weizmann) جو اُس وقت صیہونی تحریک کے سربراہ تھے، نے برطانوی حکومت کو چند ایسی ایجادات بنا کر دیں جن سے جنگ میں برطانیہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس کے عوض اس نے برطانوی حکومت سے یہ انعام مانگا کہ وہ یہ وعدہ کرے کہ جنگ عظیم میں کامیابی کی صورت میں فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ نومبر 1917 میں برطانوی وزیر خارجہ لارڈ

بالفور(Lord Balfour) نے ایک خفیہ خط کے ذریعے سے یہ وعدہ کرلیا۔اس خط کو عرف عام میں اعلانِ بالفور (The Balfour Declaration) کہا جاتا ہے۔(3)

دوسری طرف برطانیہ نے جنگ عظیم کے دوران سرزمین حجاز (یعنی مکہ و مدینہ) کے حاکم حسین ابن علی، جسے عام طور پر شریف حسین آف مکہ کہا جاتا ہے، کو یہ پیش کش کی کہ اگر وہ ترک عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کرے تو برطانوی حکومت اس کی حمایت اور مدد کرے گی۔ چنانچہ شریف حسین نے یہی کیا اور ترک حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ بڑی عجیب لیکن اہم بات ہے کہ 24 اکتوبر 1915ء کو مصر میں برطانوی ہائی کمشنر نے شریف حسین کے نام خط میں تمام عرب آبادی کی آزادی کا وعدہ کیا تھا ماسوائے شام کے چند مغربی اضلاع کے۔ یہی وہ بات ہے جس کی بنیاد پر برطانیہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اسرائیل کے قیام کے اپنے ممکنہ عزم کو کبھی خفیہ نہیں رکھا۔ تاہم اس کے بعد برطانیہ اور فرانس نے مئی 1916ء میں ایک خفیہ معاہدہ کیا جس کو سائیکس پیکوٹ معاہدہ(The Sykes–Picot Agreement) کہا جاتا ہے جس کے مطابق جنگ کے بعد لبنان اور شام فرانس کو ملنا تھا اور عراق، اردن اور فلسطین برطانیہ کو۔

(Castles Made of Sand: A Century of Anglo-American Espionage and Intervention Google Books)

برطانیہ کے اس معاہدے کا راز 1917ء میں روسی حکومت نے اُس وقت افشا کیا جب جنگ عظیم اول کے درمیان میں ہی روس میں کمیونسٹوں نے زار کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اعلان بالفور The Balfour Declaration کا بھی اسی طریقے سے پتہ چلا۔

اِدھر یہ حال تھا اور اُدھر عرب، انگریزوں کے گن گا رہے تھے۔ دسمبر 1917ء میں جب برطانوی افواج یروشلم پہنچیں تو یروشلم کے تمام شہریوں نے شہر سے باہر آ کر ان کا والہانہ استقبال کیا، حالانکہ اس وقت تک برطانیہ کے یہودیوں سے کئے گئے تمام وعدے سامنے آ چکے تھے۔ اس کے بعد اگلے تیس برس میں برطانیہ نے فلسطین میں یہودی آبادکاری کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ تاہم برطانیہ کی اس کوشش میں بہت سے عربوں نے بھی اپنا حصہ یوں ادا کیا کہ شام اور لبنان میں بیٹھے ہوئے تمام غیر حاضر زمینداروں نے منہ مانگی قیمت پر اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کر دیں۔ ایک بڑی تعداد میں فلسطینیوں نے بھی اپنی زمین یہودیوں کو فروخت کر دی اگرچہ بہت سے اہلِ دانش نے انہیں اس سے روکا۔

اسرائیل کی ترقی:

جب یہودیوں کی آبادی خاصی بڑھ گئی تب وہاں کے مسلمانوں کو ہوش آیا اور 1936ء سے لے کر 1939ء تک فلسطینیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ مگر اس بغاوت کے مقابلے میں برطانوی اور یہودی اکٹھے تھے، چنانچہ بغاوت کچل دی گئی۔ یہ بھی ایک دلخراش حقیقت ہے کہ اُس وقت بھی فلسطینی آپس میں تقسیم تھے، جب کہ یہودی پہلے دن سے ہی ایک متحد تنظیم جیوش ایجنسی(Jewish Agency for Palestine 1929–1948) کے تحت منظم تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے ایک منظم اور تربیت یافتہ فوج بھی تیار کر لی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مملکت کے قیام کے لئے یہودیوں نے جتنی قربانی دی، اس کی تاریخ میں مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مختلف حکومتوں کے خوف سے بھاگنے والے تو خیر آ ہی رہے تھے، لیکن بہت بڑے مالدار اور نامی گرامی یہودی بھی اپنی آرام دہ زندگی چھوڑ کر فلسطین کے صحراؤں میں

آ کر اپنے مستقبل کی مملکت کی تعمیر میں جُت گئے۔

فلسطین میں یہودیوں کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ساری دنیا سے یہودی اپنے مستقبل کے قومی وطن کی خواہش میں یہاں آتے گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی سے بھاگ کر آنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ ایک اندازے کے مطابق ہٹلر نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کر دیا تھا اور باقی جان بچا کر فلسطین بھاگ آئے۔ 1948ء میں یعنی اسرائیل کے قیام کے وقت وہاں سات لاکھ اٹھاون ہزار یہودی بس گئے تھے۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ اب وہاں ایک یہودی وطن بن سکتا ہے تو اس نے اس پورے علاقے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔ اس وقت صورت حال یہ بنی کہ امریکہ اور روس سمیت تمام طاقت ور ممالک اسرائیل کے حامی تھے۔ چنانچہ نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرار داد کے ذریعے سے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔ اسرائیل کو کل رقبے کا چھپن (56%) فیصد دیا گیا، حالانکہ یہودیوں کی آبادی اُس وقت کل آبادی کی ایک تہائی تھی اور فلسطینی (نصرانی اور مسلمان) ریاست کو چوالیس (44%) فیصد دیا گیا، حالانکہ فلسطینیوں کی آبادی دو تہائی تھی۔ یہ صریحاً ایک ناجائز تقسیم تھی۔ چنانچہ فلسطینیوں اور اردگرد کے عرب ممالک نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

اُس وقت فلسطینیوں اور دیگر عرب ممالک کا یہ انکار ایک غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ انکار زمینی حقائق کے خلاف تھا اور اس سے فلسطینیوں کو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اُس وقت تمام بڑی طاقتیں اسرائیلی ریاست کے قیام کے حق میں تھیں۔ یہودی، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ طاقت ور اور پر جوش تھے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان ممالک کمزور اور آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والے تھے۔ بات یہ ہے کہ اپنا مقصد کبھی نہیں بھولنا چاہیے لیکن سمجھوتہ ہمیشہ زمینی حقائق اور آنے والے حالات کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ اور اُس وقت کا صبر سے انتظار کرنا چاہیے جب حالات ایک نئی کروٹ لے لیں اور حالات کو بدلنے کے لیے مؤثر اور بھرپور حکمتِ عملی اپنانی چاہیے۔ جنگی سمجھوتہ کبھی بھی منصفانہ نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ ہمیشہ عملی ہوا کرتا ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے، خود اندازہ لگائیں کہ کیا یہ معاہدہ انصاف پر مبنی تھا یا حکمت پر؟ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے صلح حدیبیہ سے کیا سبق حاصل کیا؟۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اردن کا شاہ عبداللہ بھی فلسطینی ریاست کا سخت مخالف تھا۔ اس لئے کہ اس سے اُس کو اپنی ریاست کے لئے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسرائیلی حکومت سے خفیہ مذاکرات کر کے فلسطینی ریاست رکوانے اور اس کے بعض حصوں پر خود قبضہ کرنے اور بعض حصوں پر اسرائیلیوں کو قبضہ کرنے کی اجازت دینے کا خفیہ سمجھوتہ کر لیا تھا۔

آزاد اسرائیل کا قیام:

چودہ مئی 1948ء کو آخری برطانوی رجمنٹ کے رخصت ہوتے ہی اسرائیل نے اپنی آزادی کا اعلان کر لیا۔ لیکن فلسطین نے اپنی آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ فلسطینی اپنی چوالیس فیصد زمین پر آزادی کا اعلان کرتے اور بقیہ زمین حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے۔ اس کے بجائے اردگرد کے چار عرب ممالک شام، اردن، مصر اور عراق نے مل کر اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کر لیا۔ یہ تمام افواج بہت کمزور، نیم تربیت یافتہ، اور مورال کے لحاظ سے انتہائی پست تھیں۔ یہ سب ملک آپس میں ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے اور ان کے بہت سے کمانڈر اسرائیلیوں

سے ملے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ اسرائیل نے مزید علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اب اس کے پاس ستتر (77%) فیصد علاقہ تھا۔ مغربی کنارے کو اردن نے اور غزہ کی پٹی کو مصر نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ گویا فلسطینی ریاست نہ بننے کے جرم میں اسرائیل کے ساتھ یہ دونوں ممالک بھی شریک تھے۔ کیونکہ اگر یہ دونوں ممالک اپنے زیر قبضہ علاقوں میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو ساری دنیا اس کو فوراً تسلیم کر لیتی اور اسرائیل سے مزید گفت وشنید نہایت آسان ہوتی۔

عرب ممالک نے ایک اور طریقہ سے بھی اسرائیل کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ وہ یوں کہ 1948ء سے پہلے کے اسرائیل میں یورپ سے آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی شامل تھے۔ ان کو اشکینا زے (Ashkenaze) کہا جاتا ہے۔ لیکن 1948ء کے بعد آنے والے لاکھوں یہودیوں میں سے اکثر کا تعلق مشرقی ممالک خصوصاً مسلم عرب ممالک یعنی تیونس، مراکش، مصر وغیرہ سے ہے۔ ان کو سیفارڈم (Sephardim) کہا جاتا ہے۔ اسرائیل میں اب انہی مشرقی یہودیوں کی اکثریت ہے۔ عرب ممالک چاہتے تو ان یہودیوں کے بدلے ریاست فلسطین کے لئے گفت وشنید کر سکتے تھے۔ مگر ان کے ہاں اس امر کا کوئی شعور نہ تھا۔

دسواں باب

قیام اسرائیل کے بعد

کیونکہ اس کتاب کا مقصد فلسطین یا اسرائیل کی پوری تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ فلسطینیوں کے مسائل اور ان کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سرفہرست رہا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ عالمی طاقتیں ناانصافی کا مظاہرہ کرتی ہیں جس کی وجہ سے نوجوانوں میں انتہاء پسندی کے رجحانات جنم لیتے ہیں اس لیے میں اختصار کے ساتھ پچھلے چند سالوں کی صورت حال آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

جولائی 2000ء کے مذاکرات:

جولائی 2000ء میں کیمپ ڈیوڈ میں صدر کلنٹن کے ذریعے سے یاسر عرفات اور اسرائیل کے اعتدال پسند لیبر پارٹی کے وزیراعظم ایہود بارک کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات کئی دن جاری رہے۔ کلنٹن نے ان مذاکرات کی کامیابی کی سرتوڑ کوشش کی مگر یہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ناکامی کی اصل وجوہات دو تھیں ایک یہ کہ یروشلم کے معاملے میں یاسر عرفات کا رویہ غیر لچکدار تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ایہود بارک نے اُن چھ لاکھ (جن کی تعداد اب بہت بڑھ چکی ہے) فلسطینی مہاجرین کو واپس لینے سے انکار کردیا جو 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بے گھر ہوگئے تھے۔ بال آخر کلنٹن نے ایک فارمولا پیش کیا، جس کے مطابق مسجد اقصیٰ اور مشرقی یروشلم فلسطین کے پاس ہوتا اور دیوار گریہ سمیت مغربی یروشلم اسرائیل کے پاس ہوتا۔ واضح رہے کہ اس وقت مشرقی یروشلم میں دو لاکھ فلسطینی بستے ہیں اور مغربی یروشلم میں ساڑھے چار لاکھ یہودی بستے ہیں۔ مہاجرین کے متعلق کلنٹن کی تجویز تھی کہ انہیں فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور ان کی آباد کاری کے سارے اخراجات امریکہ برداشت کرے گا۔

(Global Campaign for Middle East Peace, Clinton Proposal on Israel-Palestinian Peace;)

یہ فارمولا ایہود بارک نے منظور کرلیا اور یاسر عرفات نے اسے مسترد کردیا، چنانچہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔ یہ فلسطینیوں اور یاسر عرفات کی سب سے فاش غلطی تھی۔ انہیں جو کچھ مل رہا تھا، اس سے زیادہ ملنا مستقبل قریب میں ناممکن تھا۔1

مذاکرات کی ناکامی سے معتدل وزیراعظم ایہود بارک کی اپنے ملک میں مقبولیت کم ہوگئی اس لئے کہ وہ اس وعدے پر برسراقتدار آیا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے ساتھ معاہدہ کرے گا۔ اس کی اس کم ہوتی ہوئی مقبولیت سے اس کے حریف لیکوڈ پارٹی کے لیڈر ایریل شیرون (Ariel Sharon) نے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ چنانچہ اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ 28 دسمبر 2000ء کو قبۃ الصخرا کا باہر سے دورہ کرے گا۔ واضح رہے کہ اس کا یہ دورہ مسجد اقصیٰ کا نہیں تھا۔ مسجد اقصیٰ کی نگرانی آج بھی اردن کی وزارت اوقاف کے پاس ہے۔ قبۃ الصخرا ایک چٹان کے اوپر گنبد کا نام ہے۔ (یہی وہ سنہری گنبد (Golden Dome) ہے جس کی تصویر کو لوگ عام طور پر غلطی سے مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں) جس کی ایک تاریخی اہمیت

ضرور ہے مگر اس کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔اس طرح ایرل شیرون (Ariel Sharon) دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ایک یہ کہ وہ اسرائیلی عوام کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے خلاف، ایہود بارک کے برعکس، ایک سخت موقف اختیار کرنے والا فرد ہے۔دوسرا وہ اس طریقے سے فلسطینیوں کو اشتعال دلانا چاہتا تھا تاکہ ہنگامے ہوں، حالات ایہود بارک کے کنٹرول میں نہ رہیں اور اسے نئے انتخابات کروانے پڑیں۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کونسی حکمت عملی فلسطینی عوام کے حق میں بہتر تھی؟ کیا انہیں اشتعال میں آنا چاہیے تھا؟ یا انہیں شیرون کی چال ناکام بنانی چاہیے تھی؟ ظاہر ہے ان کے حق میں صحیح حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اس دورے کی زبانی کلامی خوب مذمت کرتے، مگر کوئی متشددانہ اقدام نہ کرتے تاکہ شیرون کی سازش ناکام ہوجاتی۔مگر فلسطینی، شیرون کی چال میں آ گئے۔اگلے دن سے ایک نیا انتفاضہ شروع ہوگیا۔پُرتشدد ہنگامے شروع ہوگئے۔اگلے چند مہینوں میں ان ہنگاموں میں سیکڑوں فلسطینی اور بیسیوں یہودی کام آئے۔بالآخر ایہود بارک کو نئے انتخابات کا اعلان کرنا پڑا، جس میں شیرون نے باسٹھ (62) فیصد ووٹ لے کر ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔

شیرون کی کامیابی کے بعد اسرائیل کی طرف سے ظلم و بربریت کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔فلسطینیوں کی طرف سے ہر تشدد کا اسرائیل کی طرف سے دس گنا ردعمل کے ساتھ جواب دیا گیا۔کئی کئی دن تک یاسر عرفات کے دفتر کا محاصرہ کیا گیا۔اس کے دفتر کی بجلی اور پانی کو بند کر دیا گیا۔حتیٰ کہ اس کے لئے خوراک کی فراہمی بھی بند کر دی گئی۔بلڈوزروں کے ذریعے سے مشتبہ افراد کے گھر مسمار کر دیئے گئے۔

اسی دوران فلسطینیوں کی طرف سے خودکش حملے شروع ہوگئے۔یوں تو اس سے بہت پہلے سے اکا دکا خودکش حملے جاری تھے، مگر اب باقاعدہ ایک ترتیب کے ذریعے سے یہ کئے گئے۔کچھ خودکش حملے تو براہ راست فوجی تنصیبات پر کئے گئے لیکن کئی حملے سول جگہوں مثلاً ریستوران، بسوں اور عام علاقوں میں کئے گئے۔اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسرائیل کے اندر خوف کی ایک فضا بن گئی۔اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ باقی دنیا نے اسرائیل کی حمایت کر دی۔اور ان خودکش حملوں کو بھی غیر انسانی کہہ کر فلسطین کی پوری تحریک ہی کو دہشت گرد قرار دے دیا۔حماس کا تعارف بھی ایک دہشت گرد جماعت کے طور پر ہونے لگا، جس کی وجہ سے بہت سے مغربی ممالک بھی حماس کے خلاف ہوگئے۔یوں اس مسلح جدوجہد نے اسرائیل کے کئی اور ہمدرد پیدا کر دیے۔

یہ خودکش حملے اسلام سمیت دنیا کے کسی بھی مذہبی اور انسانی اخلاقیات کے خلاف تھے۔لیکن یہ حکمت عملی اور اصول دونوں کے خلاف تھے۔خودکش حملوں کے لئے وہی انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے جو انتہائی پرعزم اور جنونی ہو۔ایسے ہی لوگ کسی تحریک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ایسے لوگ جب اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں تو یہ تحریک کے لئے ایک بڑا نقصان ہوتا ہے۔پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ایسے حملوں کی رفتار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔اصولی اعتبار سے بھی یہ حملے غلط ہیں۔خصوصاً جب یہ حملے غیر فوجی تنصیبات کے خلاف ہوں اور اس میں عام لوگ ہلاک ہوں تو عام انسان کا ضمیر بھی اسے گوارا نہیں کرتا۔

ایسے حملوں کا توڑ کرنے کے لئے حریف طاقتیں بھی اپنی حکمت عملی بنا لیتی ہیں۔اسرائیل نے اس سے نمٹنے کے لئے یہ حکمت عملی اپنائی کہ خودکش حملہ آوروں کا گھر مسمار کر دیا اور ان کے رشتہ داروں کو جلاوطن کر دیا۔ظاہر ہے کہ اسرائیل کا یہ

طرز عمل ظالمانہ تھا لیکن اسے عالمی حمایت میسر تھی۔ کیونکہ خودکش حملے اور ان کے سہولت کار کسی بھی ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ مگر بہرحال اس سے یہ خودکش حملے آہستہ آہستہ تھم گئے۔

انتفاضہ کا یہ دوسرا دور کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہوگیا۔ اس سے فلسطینیوں کے جان و مال کا بڑا نقصان ہوا۔ اور یہ بات صاف واضح ہوگئی کہ اس سے پہلے اسرائیل فلسطینی ریاست کے لئے جتنی زمین دینے کے لئے تیار تھا، اب وہ ان سے بھی سخت تر شرائط پر معاملہ کرے گا۔

امریکہ کا نیا روڈ میپ (Road Map)

امریکہ نے یہ الزام لگایا کہ امن منصوبے کے راستے میں اصل رکاوٹ یاسر عرفات ہے اور جب تک وہ کسی اور فرد کو وزیر اعظم نامزد نہیں کر لیتا، تب تک امریکہ اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لے گا۔ چونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ اگرچہ امریکہ، اسرائیل کا وکیل اور حمایتی ہے، لیکن اس کے بغیر یہ مسئلہ حل تو کیا، ایک انچ آگے بھی نہیں سرک سکتا، بلکہ مسلسل فلسطینیوں کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے یاسر عرفات پر ہر طرف سے یہ دباؤ پڑا کہ ایک بااختیار وزیر اعظم مقرر کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک قریبی ساتھی محمود عباس (ابو مازن) کو وزیر اعظم نامزد کیا۔ یہ نام امریکیوں کو بھی قبول تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور صدر بش نے مشرق وسطیٰ کے لئے اپنا روڈ میپ دے دیا۔ اس روڈ میپ کے مطابق اگلے دو برس میں ایک آزاد فلسطینی ریاست کا وجود عمل میں آنا تھا اور اس مقصد کے لئے ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس میں ہر اہم مرحلے پر اسرائیل اور فلسطین کو ایک ایک قدم لینا تھا۔ اس روڈ میپ میں تین اہم ترین مسائل یعنی فلسطینی مملکت کی حدود، یروشلم کا مستقبل اور فلسطینی مہاجرین کی وطن واپسی کا کوئی حل نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اصل حل کا انحصار تو انہی مسائل پر ہے۔ یہ روڈ میپ یاسر عرفات کے ساتھ ساتھ شیرون کو بھی منظور نہیں تھا۔ لیکن امریکہ کے دباؤ پر دونوں فریقوں کو یہ منظور کرنا پڑا۔ اس روڈ میپ کے بعد دونوں طرف سے تشدد کا سلسلہ کسی حد تک کم ہوگیا۔ اسرائیلی فوج کچھ شہروں سے نکل گئی۔ تاہم عمل درآمد کی رفتار تسلی بخش نہیں۔ اسرائیل کی طرف سے غرب اردن اور غزہ کو اسرائیل سے علیحدہ کرنے والی بہت بڑی دیوار کے منصوبے نے مزید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ یہ دیوار اس لئے تعمیر کی جارہی ہے کہ تخریب کاروں پر نظر رکھی جا سکے۔ فلسطین کا کہنا ہے کہ یہ دیوار جان بوجھ کر اس طرح تعمیر کی جارہی ہے کہ غرب اردن اور غزہ کا زیادہ سے زیادہ علاقہ اسرائیل اپنے ساتھ شامل کر سکے اور بال آخر یہی دیوار سرحد بنے۔

فی الوقت اس روڈ میپ کا ذکر بالکل ہی غائب ہوگیا ہے، اس لیے کہ حالات کی پیچیدگی کی وجہ سے مذاکرات کا سارا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ خودکش حملوں کی وجہ سے اسرائیل کو یہ بہانہ مل گیا کہ چونکہ فلسطینیوں کی طرف سے روڈ میپ کی پابندی نہیں کی جارہی، اس لیے اب وہ بھی اس کا پابند نہیں ہے۔ اسرائیل نے فلسطینی جنگجو تنظیموں کے ساتھ ساتھ نہتے فلسطینیوں کے خلاف بہت بڑی کارروائیوں کا آغاز کر دیا اور یہ سلسلہ ابھی تک وقتاً فوقتاً جاری ہے۔

یوں لگتا ہے کہ امریکی روڈ میپ اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ اس وقت مکمل تعطل کی صورت ہے۔ متفقہ فلسطینی رہنما یاسر عرفات گیارہ نومبر 2004ء کو فوت ہوگئے۔ اسی دوران اسرائیل نے اعلان کیا کہ وہ غزہ کی پٹی سے اپنی فوج واپس بلالے گا اور وہاں موجود یہودی نو آبادیوں کو ختم کر دے گا۔ اس فیصلے سے اسرائیل کا مقصد یہ تھا کہ غزہ کی پٹی کی طرف سے

اُس پر خودکش حملے بند ہو جائیں۔ واضح رہے کہ زیادہ تر خودکش حملے غزہ کی پٹی کی طرف سے ہوتے تھے۔ چنانچہ 2005ء میں اسرائیل نے غزہ کے علاقے کو عملاً آزاد کر دیا۔

حماس اور الفتح آمنے سامنے:

اسی اثناء میں فلسطین کے اندر نئے انتخابات کا وقت قریب آ گیا۔ اس انتخاب میں دو بڑی پارٹیاں ایک دوسرے کے مدمقابل تھیں، یعنی الفتح اور حماس۔ الفتح اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر کے اُس کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے سے فلسطینی ریاست بنانے کے حق میں تھی۔ جب کہ حماس نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر حماس کو دو مزید معاملات میں برتری ملی۔ ایک یہ کہ الفتح کی موجودہ حکومت نہایت کرپٹ تھی، جب کہ اس کے مقابلے میں حماس کے رہنماؤں کو بہت دیانت دار سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ چونکہ غزہ کی پٹی میں حماس کی ایک واضح اکثریت تھی، اس لیے اس پٹی سے اسرائیل کے انخلا کو حماس نے اپنی کامیابی سے تعبیر کیا۔ جب پچیس جنوری 2006ء کو انتخاب ہوا، تو حماس نے ستر فیصدی نشستیں حاصل کر لیں۔

اب اس موقعے پر ایک ڈیڈ لاک کی کیفیت نے جنم لیا۔ وہ یوں کہ صدارت کے عہدے پر الفتح کے محمود عباس فائز تھے، اور وزارت عظمیٰ، حماس کے اسماعیل حانیہ کے پاس تھی۔ دونوں کی پالیسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، چنانچہ مستقلاً بحران کی ایک کیفیت رہی۔ مناسب یہی تھا کہ اُس وقت محمود عباس استعفا دے دیتے اور پورا اقتدار حماس کے حوالے کر دیا جاتا۔ یہی جمہوری اصولوں کا تقاضا تھا، اور ممکن تھا کہ اس طرح اسرائیل اور حماس دونوں کے موقف میں ایک دوسرے کے لیے لچک آ جاتی۔ تاہم ایسا نہ ہوا۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ میں نے جب 2011ء میں ایک برطانوی چیمبر آف کامرس کے وفد کے ساتھ اسرائیل کا سفر کیا تو دورانِ سفر میرے ساتھ والی سیٹ پر اسرائیلی آرمڈ فورسز کے آفیسر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے بین الاقوامی صورتِ حال زیر بحث رہی تو میرے لیے ایک چشم کشا راز کھلا، اُس نے کہا کہ جس طرح سی آئی اے نے القاعدہ بنا کر غلطی کی اسی طرح ہماری موساد نے الفتح کو کاؤنٹر کرنے کے لیے حماس بنا کر سب سے بڑی غلطی کی، کیونکہ جس طرح القاعدہ پر سی آئی اے کا کنٹرول نہیں رہا اسی طرح حماس بھی اب ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔

فروری 2007ء میں سعودی عرب کی کوششوں سے معاہدہ مکہ ہوا، جس کے تحت دونوں پارٹیوں پر مشتمل حکومت وجود میں آئی۔ تاہم چونکہ دونوں پارٹیوں کے مسلح ونگ موجود تھے، اس لیے کھچاؤ کی کیفیت جاری رہی۔ جون 2007ء میں حماس کے مسلح ونگ نے غزہ کی پٹی میں الفتح کے مسلح ونگ اور اس کے دفاتر پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں دونوں طرف کے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اس لڑائی کے نتیجے میں غزہ کی پٹی مکمل طور پر حماس کے قبضے میں آ گئی۔ دوسری طرف محمود عباس، جو کہ مغربی کنارے میں موجود تھے، نے حماس کی حکومت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا، اور ایک عبوری کابینہ بنا دی۔ گویا فلسطینی ریاست وجود میں آنے سے قبل ہی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ فلسطینی ریاست کے آئین کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جلد از جلد نیا انتخاب کرایا جائے۔ حماس نے نئے انتخاب کی مخالفت کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس سارے قضیے میں عرب لیگ، عرب وزرائے خارجہ لیگ، رابطہ عالم اسلامی اور سب سے بڑھ کر

OIC کہاں غائب تھے؟

آئین کے مطابق اپریل 2014 کے بعد فلسطین میں نئے الیکشن ہونے چاہیے تھے۔اس دوران اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ حماس کے پاس خفیہ ہتھیار ہیں۔جب اس کے سرچ آپریشن کی مخالفت کی گئی تو اس نے جون 2014 میں حملہ کر دیا۔اس حملے کی فوری وجہ وہ تین اسرائیلی بچے بھی بنے جن کو ایک فلسطینی تنظیم نے اغوا کر کے ہلاک کر دیا تھا۔اس اسرائیلی حملے کے نتیجے میں ہزاروں فلسطینی ہلاک ہوئے، جواب میں فلسطین اتھارٹی نے کئی سو راکٹ داغے اور اسرائیل کے دعوے کو ٹھیک ثابت کر دیا وہ اپنے ہاں ایسا اسلحہ اکٹھا کر رہا ہے جس سے اسرائیل پر حملہ کر سکے۔جب اسرائیل کی تسلی ہوگئی تو سیز فائر کا اعلان کیا گیا۔اس کے بعد جون 2015 میں یہی تاریخ دوبارہ دہرائی گئی اور ہزاروں فلسطینی پھر شہید کر دیے گئے۔ہر حملے کے بعد اسرائیل نے غزہ کی پٹی میں اپنی نئی رہائشی کالونیوں کی تعمیر کا اعلان کیا۔اسرائیل نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ متعدد سرنگوں کا سراغ لگایا گیا ہے جن کے ذریعے اسلحہ سمگل کر کے غزہ میں پہنچایا گیا تھا۔

غالباً مستقبل کا منظر نامہ شاید یہ ہے کہ غزہ کی پٹی میں انتخاب منعقد نہیں ہو سکے گا، اور مغربی کنارے میں انتخاب منعقد ہو جائے گا، جس کے نتیجے کے متعلق فی الوقت کچھ کہنا ممکن نہیں۔مناسب یہی ہے کہ پورے فلسطین میں نیا انتخاب ہونا چاہیے تا کہ نئے حالات کی روشنی میں فلسطینی عوام اپنے مستقبل کا تعین کر سکیں۔اگر اس انتخاب میں حماس ایک دفعہ پھر جیت ہو جاتی ہے، تو پھر محمود عباس کو صدارت سے استعفا دینا چاہیے تا کہ حماس کو اپنی پالیسیاں نافذ کرنے کے لیے کھلا میدان مل جائے۔

اسرائیل کی تعمیر و ترقی:

اسرائیل کی تخلیق اصلاً برطانیہ کی مرہون منت ہے۔اور اسرائیل کی تعمیر میں یہودیوں کی اَنتھک جدوجہد کے ساتھ ساتھ امریکی یہودیوں کا پیسہ اور حکومت امریکہ کی مسلسل مادی و اخلاقی امداد بھی شامل ہے۔اسرائیل سے باہر یہودیوں کی سب سے زیادہ تعداد امریکہ میں بستی ہے جن کی تعداد باون (52) لاکھ ہے۔اسرائیل میں اڑتالیس ((48 لاکھ یہودی بستے ہیں۔امریکی یہودی انتہائی بااثر اور مالدار ہیں۔ہر اہم ادارے میں ان کے بہت مضبوط لوگ ہیں۔دونوں سیاسی پارٹیوں میں اہم ترین عہدوں پر وہ فائز ہیں۔اگرچہ ان یہودیوں کے اندر بہت سے معاملات پر بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں تاہم اسرائیل کی سلامتی، بقا، تحفظ اور تعمیر کے معاملے میں وہ سب پوری طرح متحد ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کسی امریکی حکومت کے لئے اسرائیل کی مخالفت کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے قیام کے پہلے دن سے ہی اسے امریکی امداد کی فراہمی شروع ہوگئی۔یہ امداد دو شکلوں میں ہے۔ایک شکل امریکی یہودیوں کی طرف سے اسرائیل کو براہ راست رقم کی فراہمی اور دوسری شکل امریکی حکومت کی طرف سے ریاستی سطح پر امداد۔امریکہ کی طرف سے سب سے زیادہ امداد اسرائیل کو ملتی ہے۔بلکہ یہ کسی بھی ملک کی طرف سے کسی بھی ملک کو ملنے والی سب سے زیادہ امداد ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اگر اسرائیل کو کوئی مسئلہ درپیش آ جائے مثلاً کسی جنگ میں اس کے اخراجات ہو جائیں تو امریکہ فوراً اس نقصان کو پورا کر دیتا ہے۔اسرائیل نے جان بوجھ کر اپنے ملک میں ایسی طرز معاشرت رکھی ہوئی ہے کہ اگر امریکہ سے کوئی سیاح اسرائیل چلا جائے تو اسے کسی غیریت کا احساس نہ ہو۔اس معاملے میں اسرائیل نے یہودی نظامِ اخلاقیات کی تمام پابندیوں کی دھجیاں اڑائی ہوئی ہیں۔درحقیقت اسرائیل نے

ایک بڑے عرصے سے یہ شعوری فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کا رکھوالا ہوگا اور عملاً امریکہ کے اکیاونویں (51st) ریاست کی حیثیت سے زندگی گزارے گا۔ چنانچہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، تاہم ہمیں اس کا شعور ہونا چاہیے کہ مستقبل قریب میں بھی اسرائیل کے لئے امریکی امداد یونہی جاری رہے گی۔

چند اہم نکات:

اب تک کی بحث سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

☆.....اسرائیل کی تخلیق برطانیہ نے کی اور اس کی تعمیر میں امریکہ نے ایک بڑا کردار ادا کیا۔

☆.....مسلمانوں کی خودغرضی، کوتاہ اندیشی، غلط فیصلوں، عدم جمہوریت اور حقائق کی بنیاد پر حکمت عملی نہ بنانے کی روش نے اسرائیل کے قیام کو آسان اور اس کی تعمیر کو آسان تر بنا دیا ہے۔ مثلاً اگر سلطنت عثمانیہ میں جمہوریت اور صوبائی خودمختاری ہوتی، اگر وہ ہوا کا رخ بھانپ کر عرب مقبوضات کو آزادی دے دیتی اور اگر ترکی کی حکومت پہلی جنگ عظیم میں کود نہ پڑتی تو اسرائیل کا قیام ناممکن حد تک مشکل ہوتا۔

☆.....عربوں کی نااتفاقی، عاقبت نااندیشی اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے اجتماعی مقاصد کو قربان کرنے کی روش نے بھی اسرائیل کی تعمیر اور تسلسل میں پورا کردار ادا کیا۔ مثلاً پہلی جنگ عظیم میں عربوں نے برطانیہ کی حمایت کی۔ قیام اسرائیل کے وقت فلسطینی ریاست نہ بننے کے معاملے میں اسرائیل اور اردن کے شاہ عبداللہ نے باقاعدہ خفیہ معاہدہ کیا۔ پچھلے پچاس سال میں تمام عرب مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اردن اور مصر نے فلسطینی ریاست پر قبضہ کیا اور اپنے زیر قبضہ علاقے میں فلسطینی ریاست نہ بننے دی۔ سادات نے اسرائیل سے گفت وشنید میں صحرائے سینا تو واپس لے لیا، مگر غزہ کا علاقہ بدستور اس کے قبضے میں رہنے دیا، حالانکہ وہ علاقہ اسرائیل نے مصر سے ہی چھینا تھا۔

☆.....فلسطین کے معاملے میں عربوں نے ہمیشہ حکمت عملی اور زمینی حقائق کے خلاف قدم اٹھایا۔ 1917ء میں اعلان بالفور اور سائیکس پیکاٹ معاہدہ منظر عام پر آچکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب عربوں کو انگریزوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر ایک قابلِ عمل معاہدہ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت عربوں اور انگریزوں کی طاقت میں ایک نسبت ہزار کا فرق تھا۔ اور جب یہ صورت ہو تو قابلِ عمل پرامن معاہدہ ہی کمزور قوم کے مفاد میں ہوتا ہے۔ پھر 1948ء میں اگر عرب اقوام متحدہ کی قرارداد منظور کر لیتے تو آج کی نسبت ایک تہائی اسرائیل وجود میں آتا۔ اس کے بعد بھی اگر عرب اپنے زیر قبضہ علاقہ میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو اسرائیل سے گفت وشنید آسان ہو جاتی اور یروشلم کے ساتھ بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہتا۔ اگر صدر ناصر مبالغہ آمیز دعوے نہ کرتے، اور مسلسل دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی مملکت کے دفاع کی طرف توجہ دیتے تو 1967ء کا سانحہ پیش نہ آتا۔ اسی طرح فلسطینیوں کی طرف سے ہر متشددانہ کارروائی نے ان کی آزادی کو مزید دور اور ان کے ممکنہ علاقے کو مزید محدود کر دیا ہے۔

☆.....آج اسرائیل کم آبادی والی ایک بڑی طاقت بن چکا ہے جس کے پاس سینکڑوں ایٹم بم بھی ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ ٹیکنالوجی اور فی کس آمدنی کے لحاظ سے وہ دنیا کے سرفہرست ملکوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اردگرد کے تمام عرب ممالک کی مجموعی معاشی، فوجی اور اسلحی ذخائر سے اُس کے ذخائر کہیں زیادہ

ہیں۔کئی مسلمان ممالک بشمول اردن، مصر، تنظیم آزادی فلسطین، قطر اور ترکی نے اسے تسلیم کیا ہوا ہے اور ان کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ چنانچہ اب ہمیں اس امر پر غور وفکر کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں فلسطینیوں اور مسلمانوں کے لئے بہتر اور قابلِ عمل حل کیا ہے۔

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں بیت المقدس اور یروشلم کی صورت حال کو سمجھنا ہوگا۔ یروشلم اس شہر کا نام ہے جہاں یہ مقدس احاطہ بیت المقدس کے نام سے موسوم ہے جسے ہیکل سلیمانی بھی کہا جاتا ہے یہ ایک احاطے کا نام ہے جس کی لمبائی اندازاً پندرہ سو (1500) فٹ ہے اور چوڑائی اندازاً ایک ہزار (1000) فٹ ہے۔ یہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک بڑا عمارتی کمپلیکس بنایا تھا جو ان کا سیکرٹریٹ تھا۔ اس کی تعمیر کے ساڑھے تین سو برس بعد بابل کے بادشاہ بخت نصر نے اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے تقریباً ستر سال بعد ان کو دوبارہ یہ جگہ تعمیر کرنے کی اجازت ملی اس لئے کہ اس وقت وہاں فارس کے بادشاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یہ جگہ کئی دفعہ مختلف حملہ آوروں کی طرف سے تباہی کا نشانہ بنتی اور بار بار تعمیر ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ پہلی بڑی تباہی کے ساڑھے چھ سو برس بعد یعنی 70ء میں رومی حکومت نے اس کو بالکل تباہ کر دیا، یہود کا قتل عام کیا اور زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ اس تباہی میں ہیکل کی صرف مغربی دیوار کا ایک حصہ محفوظ رہ گیا۔ یہی وہ دیوار ہے جسے اب دیوار گریہ (Wailing Wall) کہا جاتا ہے یعنی وہ جگہ جہاں یہودی آ کر اپنی عظمت رفتہ کی یاد میں روتے ہیں اور عبادات کرتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لئے مقدس ترین جگہ اور ان کا قبلہ ہے۔

اس دوسری تباہی کے پانچ سو ستر سال بعد یعنی 638ء میں مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے وقت میں یروشلم فتح کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس پوری جگہ کو، جہاں کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا، صاف کیا اور اس کے جنوب میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لئے مخصوص کر دی۔ یہی جگہ اب مسجد اقصیٰ ہے۔ موجودہ مسجد اقصیٰ کی لمبائی تقریباً ساڑھے چھ سو (650) فٹ اور چوڑائی اندازاً تین سو (300) فٹ ہے۔ غالباً امکان یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت اُن کی اصل مسجد اسی جگہ واقع تھی، اسی لئے حضرت عمرؓ نے خاص اسی جگہ کو مسجد ٹھہرایا۔ ورنہ وہ چاہتے تو اس تمام احاطے کو مسجد قرار دے سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے باقی احاطے کو نصرانیوں یا یہودیوں کے لئے ممنوع قرار نہیں دیا۔

درمیان میں اٹھاسی (88) سال کے ایک وقفے کے سوا پچھلے چودہ سو سال سے یہ پوری جگہ مسلمانوں کے قبضے میں رہی۔ 1967ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تاہم حکومتِ اسرائیل نے مسجد پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ اس جگہ کی چابیاں حکومتِ اردن کے حوالے کر دیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک مسجد کا کنٹرول یروشلم کے مسلم وقف کے پاس ہے۔

مسئلے کا ممکنہ حل:

مسئلہ فلسطین کے حل میں اس وقت تین معاملات سب سے زیادہ اہم ہیں۔

☆ ایک یہ کہ غرب اردن اور غزہ کی پٹی کا کتنا حصہ فلسطین کو دیا جائے؟

☆ دوسرا یہ کہ یروشلم کے مقدس مقامات کو کیسے تقسیم کیا جائے؟ اور

☆ تیسرا یہ کہ جو فلسطینی 1948ء میں مہاجر ہو گئے تھے۔ ان کی دوبارہ آبادکاری کہاں اور کیسے کی جائے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ دونوں علاقے سو فیصد فلسطینی ریاست کی عمل داری

میں دیئے جائیں۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں علاقوں خصوصاً غرب اردن میں اسرائیل نے بہت سی یہودی آبادیاں تعمیر کر لی ہیں۔ چنانچہ اگر ان میں سے کچھ آبادیوں پر فلسطین کی طرف سے لچک دکھائی جائے تو مناسب ہے۔ ویسے بھی فلسطینی ریاست کا اصل مسئلہ زمین نہیں ہے اس لئے کہ اردگرد کے عرب ممالک کے پاس بے تحاشہ علاقے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے کچھ علاقے (مثلاً صحرائے سینا) فلسطین کے حوالے کر کے اسے اسرائیل سے کئی گنا بڑا ملک بنا سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یروشلم کے مقدس مقامات کا ہے۔ جیسا کہ قارئین کے مطالعے میں آ چکا، اس مسئلے کا قابل عمل حل موجود ہے۔ وہ یہ کہ مسجد اقصیٰ اور یروشلم کا مسلم اکثریتی علاقہ، فلسطین کے حصے میں آئے اور دیوارِ گریہ، مغربی یہودی اکثریتی علاقے سمیت اسرائیل کو دیا جائے۔ جہاں تک قبۃ الصخرا کا تعلق ہے، اسے فلسطین اور اسرائیل کی مشترکہ عمل داری میں دیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اسرائیل، اسے مکمل طور پر فلسطین کو دینے پر رضامند ہو جائے۔ اس لئے کہ وہاں عام طور پر یہودی زائرین نہیں جاتے۔ اس پورے رقبے جسے الحرم الشریف بھی کہا جاتا ہے، کا ایک قابلِ عمل حل یہ بھی ہے کہ اسے سب زائرین کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے اور اقوام متحدہ کی ضمانت کے ساتھ اس رقبے پر اسرائیل اور فلسطین کی یکساں عمل داری ہو۔

تیسرا مسئلہ ان لاکھوں فلسطینیوں کا ہے جو 1948ء میں مہاجر ہو گئے تھے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سب کو واپس اپنے اپنے گھروں کو آنے کی اجازت دی جائے۔ ان کے سابقہ گھر موجودہ اسرائیل میں واقع ہیں۔ تاہم اسرائیل کبھی یہ بات نہیں مانے گا، اس لئے کہ اس طرح اسرائیل میں یہودی اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ تاریخ کا ایک سفاک جبر ہے کہ مہاجرین کے لئے عموماً واپس اپنے علاقے میں جانا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً افغانستان سے روسی افواج کو نکلے ہوئے پچیس برس ہو چکے، مگر افغان مہاجرین ابھی تک پاکستان میں ہی ہیں۔ بنگلہ دیش میں پچھلے چالیس برس سے لاکھوں بہاری، مہاجر کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر پاکستان ان کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ یہی صورت فلسطینی مہاجرین کی ہے۔ ان کی آبادکاری کی سب سے قابل عمل صورت یہ ہے کہ ان کو فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور اس کی ذمہ داری اقوام متحدہ اٹھائے۔



گیارہواں باب

اسرائیل سے سلام (Shalom)

''میں اکیس سال کی ہوں اور تم ساٹھ سال کے ہونے لگے ہو۔ میں صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تم کب تک ہزار سالہ پُرانی دُشمنی کا حساب چکاتے رہو گے۔ آؤ اپنی آئندہ نسلوں کا سوچیں اور ہزار سال کا بوجھ اُتار پھینکیں۔ اگر برطانیہ کی زمین ہم دونوں کو پناہ دے سکتی ہے تو سرزمین مقدس میں تو بہت گنجائش ہے۔''

امریکی سیاح اور ایک لطیفہ:

جب میں اسرائیل کے تل ابیب انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر 9 جنوری 2012ء کو اُترا تو پتا تھا مجھے کہاں جانا ہے، مسجد اقصیٰ اور دیوارِ گریہ۔

جانے سے پہلے مجھے بہت سے لوگوں نے وہ لطیفہ سُنایا تھا، جس میں ایک امریکی سیاح ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی ٹیکسی میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ٹیکسی والا پوچھتا ہے..... 'کہاں چلنا ہے'۔؟

امریکی اپنے سر کو سہلاتے کچھ یاد کرنے کی ناکام کوشش میں بڑبڑاتا ہے 'وہاں، جہاں بہت سے یہودی مل کر آہ و زاری کرتے ہیں'۔

ٹیکسی والا جوش سے سر ہلاتا ہے اور سمجھ گیا کا اشارہ کرتے ہوئے تل ابیب کی سڑکوں پر زِگ زیگ کرتا ایک دفتر نُما عمارت کے باہر بریک لگاتا ہے۔ امریکی حیرت سے آنکھیں سکیڑتا ہوا باہر نکلتا ہے اور گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر غصّے سے ڈرائیور کی طرف مُڑتا ہے جو ایک ہاتھ سے اُس عمارت پر لگے ہوئے بڑے سے بورڈ کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ امریکی اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھے بورڈ کے قریب پہنچتا ہے اور پڑھتا ہے 'ٹیکس آفس'۔

ڈرائیور چہرے پر پُراسرار قسم کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہتا ہے: ''آج کل یہودی یہیں آ کر روتے پیٹتے ہیں۔''

جب ہم تل ابیب انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اُترے تو میں قدرے نروس تھا۔ بچپن سے صیہونیوں کے بارے میں سُنی ہوئی کہانیاں، فلسطین، اسرائیل تنازعہ، پاکستانیوں کے ساتھ اُن کا درشت رویہ اور حال ہی میں بڑھتی ہوئی نسل پرستی۔ میں اندر ہی اندر سب کچھ بھگتنے کے لیے تیار تھا۔ آخر مسجد اقصیٰ میں جو جانا تھا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر ایوی شلیم سے ملاقات:

وہاں ہم نیویارک کی فورڈہم یونیورسٹی کے بلاوے پر موجود تھے۔ مذکورہ بالا کانفرنس اس لحاظ سے خاصی دلچسپ تھی کہ اس میں اسرائیل اور ترکی کے درمیان بگڑتے ہوئے تعلقات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ بہت سے محقق اس تحقیق میں مصروفِ کار تھے کہ کس طرح دونوں ممالک کے آپس کے تعلقات سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے بگڑ سکتے ہیں۔ اور جب ایسا بگاڑ پیدا ہو جائے تو بزنس پر مبنی رابطے کیسے متاثر ہوتے ہیں۔ غالباً اس موضوع کی بڑی وجہ ترکی کا اُردگان کی قیادت میں اُبھرتا ہوا اثر و رسوخ تھا اور دونوں ممالک کے درمیان بگڑتے ہوئے تعلقات جو کہ خاص طور پر ترکش فلوٹیلا پر اسرائیلی

حملے کے بعد دُھواں دینے لگے تھے۔

پروفیسر جوناتھن سٹوری (Professor Jonathan Story) کے علاوہ چار اور ماہرین بھی مدعو تھے، جنھوں نے تفصیل سے اسرائیل ترکی قضیے پر روشنی ڈالی۔ ترکی اور اسرائیل کی خوبیوں خامیوں کا تجزیہ کیا گیا اور مستقبل کے حوالے سے امکانات پر بحث کی گئی۔ تاہم سب سے مؤثر تقریر پروفیسر ایوی شلیم (Professor Avi Shlaim) کی تھی جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں سینئر پروفیسر تھے۔

''آپ لوگ کہتے ہیں معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ اپنے آپ کو دھوکا مت دیں۔ معاملہ بالکل سیدھا سادہ ہے۔' 'پروفیسر نے سپاٹ چہرے کے ساتھ ہاتھ ہوا میں اُٹھایا۔ ''اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور وہ یہ ناجائز قبضہ ہر روز مظلوم فلسطینیوں کے خون کی قیمت پر مستحکم کیے جا رہا ہے۔ اگر اس دُنیا میں انصاف نام کی کسی چڑیا کا وجود ہے تو اسرائیل کو اپنے شرم ناک رویئے پر معافی مانگتے ہوئے فلسطینی علاقوں سے نکل جانا چاہیے''۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہودی پروفیسر کے ان الفاظ کے بعد ہال میں ایک دَم سناٹا چھا گیا تھا۔ پروفیسر ایوی شلیم بعد میں ہمارے تھنک ٹینک فورم فار انٹرنیشنل ریلشنز ڈیویلپمنٹ یو کے کے دفاتر میں مختلف موضوعات پر لیکچرز کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاؤس آف کامنز کے پُرشکوہ دربار میں ہم ''فلسطینی ریٹرن سنٹر'' کی جانب سے منعقدہ تحریک آزادی فلسطین کے تیسرے میموریل ویک کی تقریب میں شامل تھے جس میں جیریمی کوربن ایم پی (Jeremy Corbyn MP)، سر جیرالڈ کاف مین ایم پی (Sir Gerald Bernard Kaufman MP)، ڈاکٹر میڈز گلبرٹ (Dr. Mads Gilbert)، لارڈ اینڈریو فلپس (Lord Andrew Philips)، بیرونیس جینی ٹونگ (Baroness Dr. Jenny Tong) اور فلسطینی ایمبیسڈر ٹو دی یو کے خطاب کر رہے تھے۔ ہال میں حیران کرنے والی بات 90 فیصد گورے تھے جب کہ اکّا دُکّا ایشین چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔

تقریب کے آغاز میں فلسطینی اور اسرائیلی علاقوں کے درمیان اُٹھائی گئی دیوار پر دومنٹ کی ڈاکومینٹری دکھائی گئی، جس میں کہا گیا تھا کہ ''اکیسویں صدی دیواریں توڑنے کی صدی ہے اور یہ دیواریں ہم مل کر توڑیں گے''۔ اس موقعے پر ''رِل'' نامی فلم کا بھی ذکر ہوا، جس میں ہندوستانی اداکارہ فریدہ پٹنو نے ایک فلسطینی لڑکی کا کردار ادا کر کے خاصی داد سمیٹی ہے۔

ستّر کے پیٹے میں سرکاف مین پوری مغربی دُنیا میں فلسطینیوں کے کٹر حامی سمجھے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے بنی صالح میں ہونے والے احتجاجی مظاہرے پر حال ہی میں کیے جانے والے اسرائیلی مظالم کا ذکر کیا اور ایک فلسطینی نوجوان کے بارے میں بتایا، جس کو آنسو گیس کا کنستر سر میں مارا گیا اور بعد میں اُس کی بہن کی تذلیل بھی کی گئی۔ ہال میں گہرا سکوت تھا اور سانسوں کے زیر و بم ملاحظہ کئے جا سکتے تھے۔

اگلی مقررہ امل نامی ایک فلسطینی خاتون تھیں، جن کے خاندان کے پندرہ افراد غزہ پر اسرائیلی حملے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ اُس نے اُن کی یاد کو پرچم بنا لیا تھا اور پوری دُنیا میں اسرائیل کا اصل چہرہ دکھانے کے لیے تقاریر کرنے جاتی تھی۔

''میں تھک چکی ہوں۔ میں اپنے مُردوں کو یاد کر کر کے نڈھال ہو چکی ہوں۔ میں صرف اس لیے گھر سے نکلی ہوں کہ دُنیا کو بتا سکوں کہ میرے خاندان کے وہ پندرہ لوگ صرف اعداد و شمار نہیں بلکہ گوشت پوست کے قلقاریاں مارنے والے زندہ افراد تھے جن میں گیارہ بچے تھے، جنھیں ابھی پوری زندگی جینا تھا'' امل نے اپنی بات کا آغاز کیا اور ہال میں تقریباً

تمام آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''میں تھک چکی ہوں تم مہذب لوگوں کی خالی خولی معذرتوں سے۔تم یہاں لندن کے پُرسکون شبستانوں میں بیٹھ کے کہتے ہو کہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔مگر یہ کافی نہیں ہے۔سڑکوں پر نکلو۔اپنی حکومت کا جینا دوبھر کر دو۔یاد رکھو برطانیہ والو، ارضِ فلسطین میں اسرائیل کا خنجر تمہاری حکومتوں نے ہی پیوست کیا تھا،تم ہی اس کو نکالنے کے ذمہ دار بھی ہو۔صرف معذرت کافی نہیں ہے''۔

جیریمی کوربن ایم پی اور بیرونیس جینی ٹونگ نے مزید لب کشائی کی۔برطانوی حکومت کو کھل کے کوسا گیا کہ جب کبھی پارلیمینٹ میں اسرائیل سے متعلق بحث کی جاتی ہے اور پوائنٹ آف آرڈر اُٹھایا جاتا ہے چند ماہ گزرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ابھی اسرائیلی حکومت کے ساتھ معاملات اُٹھانا باقی ہیں۔

''ناکارہ،ضدی اور نمائشی ڈھول او باما! سن لو، وقت اسرائیل کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔وقت فلسطینیوں کے ساتھ ہے۔ہمیں ہمدردانہ جذبات کا نہیں اقدامات کا انتظار ہے۔تم نے اسرائیلی وزیراعظم بیگن کو نوبل پرائز دیا جو کہ ایک اشتہاری دہشت گرد تھا۔اُسامہ بن لادن کو نوبل پرائز نہیں دیتے؟'' یہ آواز سر کاف مین کی تھی اور میں اُن کی جرأت پر حیران تھا۔

''برطانیہ کے لوگو! ہم تمہارے نمائندے ہیں۔ہم اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک فلسطین آزاد نہیں ہو جاتا''۔ایم پی جیریمی نے اپنا مکا ہوا میں بلند کیا اور ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

اسرائیلیو! تم ہولوکوسٹ کیسے بھول سکتے ہو:

ڈاکٹر گلبرٹ 1980ء سے غزہ میں ڈاکٹرز کے وفود لے کر جاتے رہتے تھے اور ''غزہ میں آنکھیں'' نامی کتاب کے مصنف بھی تھے۔

''سامعین! اگر شرافت، نجابت، وقار کو کسی پیکر میں دیکھنا ہو تو میرے ساتھ غزہ چلو''۔ڈاکٹر گلبرٹ کی آواز نمناک تھی۔'وہاں میں تمہیں دُنیا کے سب سے باوقار لوگوں سے ملواؤں گا جنھیں راکٹ، گولیاں اور تقریباً 60 سال سے خیموں میں قیام بھی بھکاری نہیں بنا سکا۔میں تمہاری معذور جمیلہ سے ملاقات کراؤں گا جو عرب سپرنگ کے چار بانیوں میں سے ایک ہے۔غزہ دُنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں کے لوگ غلیل لیکر ٹینک سے مقابلہ کرتے ہیں۔اسرائیلیو! تم ''ہولوکاسٹ'' کیسے بھول سکتے ہو جب تمہیں خیموں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس کر مارا گیا تھا۔کیا تمہیں فلسطینیوں کو دیکھ کے اپنے ''باپ دادا'' یاد نہیں آتے''۔ڈاکٹر کا خطاب ایک مسلسل گریہ تھا۔وہ بولتا جا رہا تھا اور سامعین اپنے آنسو ٹشو پیپر میں جذب کرتے جا رہے تھے۔

اسرائیلی ایک مورل فورس؟

ہال میں دو افراد کھڑے ہو گئے۔دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔'تم اسرائیل کے خلاف دہشت پھیلا رہے ہو۔فلسطینیوں کو ہیرو بنانا بند کرو۔کرنل رچرڈ کیمپ نے کہا تھا کہ اسرائیلی فوج دُنیا کی سب سے بڑی مورل فورس (Moral Force) ہے۔تم بھول گئے کہ ان فلسطینیوں نے اسرائیل پر پچاس ہزار سے زیادہ راکٹ پھینکے ہیں'۔ایک نے چیخ کر کہا۔

''ہاں، پچاس ہزار۔لیکن اُن راکٹوں سے کل تیرہ فوجی مرے جس میں سے پانچ اپنے دوستوں کی فرینڈلی فائرنگ

سے مارے گئے۔لیکن تم لوگوں نے دو ہزار فلسطینیوں کا خون کیا۔ یہ کیسی جنگ ہے جس میں صرف نہتے مرتے ہیں۔کرنل جھوٹا ہے۔ یہی جھوٹ بول کر تم لوگوں نے عراق اور افغانستان پر حملے کیے۔ یاد رکھو تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے اور آزاد فلسطینی ریاست قائم ہو کر رہے گی، ان شاءاللہ'۔ڈاکٹر گلبرٹ نے اپنی کتاب ہوا میں لہراتے ہوئے کہا اور تمام افراد ''ان شاءاللہ'' کہتے ہوئے اپنی نشستوں سے اُٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔دونوں شدت پسند یہودی چیخ چلا رہے تھے مگر اُن کی آواز تالیوں میں دب گئی۔

صیہونیت مخالف یہودی:

ہال میں کچھ سکوت ہوا تو مخصوص یہودی ٹوپی پہنے ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ میں ''صیہونیت مخالف'' یہودیوں کا نمائندہ ہوں۔تم لوگ اپنے مظالم پر مذہب، ہولوکوسٹ اور خدا کے منتخب بندے ہونے کا پردہ نہیں ڈال سکتے۔تمہیں فلسطینی زمین سے اُٹھنے والی آوازوں کا سامنا کرنا ہوگا'۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔'جوناتھن'، برٹش لہجے میں بولنے والی ایک گوری چٹی لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔'میں تمہارا نام بھی جانتی ہوں کیوں کہ تم ہر تقریب کو بدمزہ کرنے کے لیے آتے ہو۔ میں اکیس سال کی ہوں اور تم ساٹھ سال کے ہونے لگے ہو۔ میں صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تم کب تک ہزار سالہ پُرانی دُشمنی کا حساب چکاتے رہو گے۔آؤ اپنی آئندہ نسلوں کا سوچیں اور ہزار سال کا بوجھ اُتار پھینکیں۔اگر برطانیہ کی زمین ہم دونوں کو پناہ دے سکتی ہے تو سرزمین مقدس میں تو بہت گنجائش ہے۔

تمام افراد اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور تالیاں پیٹنے لگے۔جوناتھن نے اُٹھ کر شکست خوردہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر سر نیچے ڈال کے ہال سے باہر نکل گیا۔

مجھے لگا فلسطین اپنی آزادی کا مقدمہ جیت چکا ہے۔ مجھے یہ بھی لگا اب یروشلم جانا طے ہو گیا ہے۔

تو ہاں، میں اسرائیل میں تھا اور تل ابیب کے ایئرپورٹ پر میرے ساتھی پاسپورٹ پکڑے قطار میں تھے۔اور ایک ان ہونی ہو چکی تھی۔

ایئرپورٹ دُنیا کے باقی ایئرپورٹس کی طرح مصروف تھا۔اگرچہ ہیتھرو ایئرپورٹ والی لمبی قطاریں نظر نہ آتی تھیں۔ امیگریشن آفیسر خلافِ توقع کافی خوشگوار موڈ میں تھا اور ہم لوگ جلد ہی ایئرپورٹ سے باہر تھے۔تل ابیب کی ہوا میں کاٹ تھی جو لندن کی نسبت اور طرح سے چبھتی تھی۔

میرے ساتھ اس سفر میں شامل اکثر احباب نامی گرامی بزنس مین تھے اور اسرائیلی چیمبر آف کامرس نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالنے اور اُن کا دل موہ لینے کے لیے اُنھیں بلایا تھا۔شاید اس لیے امیگریشن اور دیگر مراحل کافی نرم تھے ورنہ ایئرپورٹ پر طرح طرح کے تفتیشی مراحل کی کہانیاں سننے کو ملتی رہی تھیں۔تاہم اس وقت اسرائیلی پاؤنڈز کے تعاقب میں تھے، اس لیے ایک طرح سے وی آئی پی پروٹوکول مل رہا تھا۔

ایئرپورٹ سے باہر آتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر جھانکا۔خلافِ توقع کوئی لمبے چوڑے انتظامات نظر نہ آئے۔نہ جانے کیوں میں اسرائیل کو ایک بڑی گیریژن سٹیٹ سمجھ رہا تھا جہاں ہر کونے میں کوئی نہ کوئی بندوق بردار موجود ہوگا۔اُس کے برعکس زندگی پوری ہماہمی سے دوڑی جا رہی تھی۔ماڈرن، صاف ستھرے اور تیز طرار تل ابیب میں لندن کی طرح لوگ سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

یہودیت اور صیہونیت:

یہاں اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوا کہ یہودیت اپنے آپ کو صیہونیت سے علیحدہ سمجھتی ہے۔ اِسی لیے بیشتر یہودی بھی اسرائیل کے فلسطین پر ڈھائے جانے والے مظالم پر نالاں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسرائیلی فضائیہ کے ایک ریٹائرڈ سینئر آفیسر اور ایک یہودی عالم ''ربائی'' سے یہاں تک سنتے پایا کہ جو غلطی امریکہ نے افغانستان اور پاکستان میں القاعدہ پیدا کر کے کی ہے اس سے بھی بڑھ کر اسرائیل نے الفتح کے خلاف حماس کی حمایت کر کے کی ہے۔ اسی دوران اسرائیل کی ایک کاروباری شخصیت نے یہاں تک کہا کہ اسرائیل ایک یہودی مملکت کے قیام کی خاطر تمام حدیں پھلانگتا ہوا دنیا بھر میں رسوائی کا باعث بن رہا ہے اور تنہائی کا شکار ہو رہا ہے۔ سب سے بڑا دھچکا مجھے اس بات سے لگا کہ کوئی پندرہ سو اسرائیلی خود اپنی حکومت کی نسلی منافرت پر مبنی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

ایک اور بڑی حیرت کا سامنا اُس وقت ہوا جب بہت سے یہودیوں کو 'صیہونیت' سے بغاوت کرتے دیکھا۔ ریٹائرڈ فوجیوں کی ایک تنظیم سے ملاقات ہوئی جو کہ فلسطینیوں کے حقوق کے لیے مہم چلا رہے تھے۔ ایک اندرونی فلائیٹ میں ایک بھرپور گھنی داڑھی والے یہودی مذہبی پیشوا 'ربائی' ساتھ بیٹھ گئے۔ درمیان میں گپ شپ ہوئی تو پاکستان سے تعلق کا سُن کر میں نے اُن کے چہرے پر خاص طرح کی مسکراہٹ اُبھرتے دیکھی۔

''یہ سب انکل سام کا کیا دھرا ہے'' ربائی نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''امریکیوں نے پہلے افغانستان میں جہاد کی فصل کاشت کی۔ پھر اب اُس کو کاٹنے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ یہی تجربہ اُنھوں نے یہاں الفتح کو دیوار سے لگانے کے لیے حماس کو پروان چڑھا کر کیا۔ تاہم اب جن بوتل سے باہر آ چکا ہے اور اب کسی طرح واپس بوتل میں جانے کے لیے تیار نہیں''۔

یہی نہیں اکثر یہودی بزنس مین اس امر پر پریشان دیکھے کہ ''صیہونی'' پنگوں کے باعث بہت سے ممالک اسرائیلی پراڈکٹ کا بائیکاٹ کر چکے تھے یا پھر پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ بزنس مینوں کو صرف پیسے کمانے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر صرف 'ٹریڈ' کے راستے ہی کھولے جائیں تو پھر راہ و رسم بڑھانے کے کافی بہانے نکل آتے ہیں۔

بن گوریان ہوٹل میں جہاں میرا قیام تھا، وہاں اور بھی دلچسپ صورتِ حال پیش آئی۔ جب ایک دن میں نے باورچی کو انٹرنیٹ پر پاکستانی آملیٹ بنانے کا طریقہ سیکھتے اور استعمال کرتے دیکھا۔ پتا چلا کہ وہ ساری کوفت میرے لیے اٹھا رہا تھا کہ میں پاکستانی ہونے کی وجہ سے شاید مقامی کھانوں سے تنگ آ چکا ہوں گا۔

ایک سرپرائز:

سب سے بڑا ''سرپرائز'' اُس وقت ملا جب 11 جنوری 2012ء کو سفر کرتے ہوئے ایک دم ٹیکسی کو بریک لگے اور کافی دیر تک لگے رہے۔ میرے سامنے سیکڑوں کی تعداد میں سیاہ فام مظاہرین تھے جنھوں نے ہاتھوں میں پلے کارڈ اور بینر اُٹھا رکھے تھے۔ ساتھ ہی وہ عبرانی زبان میں نعرے لگا رہے تھے اور ہوا میں مکے لہرا رہے تھے۔

معلوم ہوا کہ مظاہرین میں سے اکثر ایتھوپیا سے آئے ہوئے یہودی مہاجرین ہیں، جن کو اپنی ''جنت'' میں آ کر کچھ زیادہ اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا۔ مقابلہ سخت تھا اور اُن کا راستہ روکنے کے لیے کافی سفید فام یہودی موجود تھے۔ میں نے چند سیاہ فام نوجوانوں کو اپنے چہرے پر سفید پینٹ کرتے دیکھا۔ ایک اور پلے کارڈ بہت مشہور تھا' میں ایک سیاہ فام یہودی

ہوں اور مجھے خود پر فخر ہے''۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سفید فام یہودی سیاہ فاموں کو اپنے اندر جذب کرنے میں پس وپیش سے کام لے رہے ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی اور اسرائیلی معیشت:

اسرائیل کا دورہ حیرتوں سے بھرپور تھا۔

اسرائیل کے بارے میں عمومی تصور ایک بغل بچہ اور ''طفیلی'' ریاست کا تھا جو امریکہ کے خرچے پر پل رہا تھا۔ تاہم یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اسرائیل دنیا بھر کے ہائی ٹیک انڈسٹری میں صف اوّل کے ملکوں میں جگہ بنا چکا تھا۔ پتا چلا کہ اسرائیل اس وقت دُنیا کی 24ویں سب سے بڑی اور مستحکم معیشت ہے اور ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس پر اُس کا نمبر 15 واں ہے۔ یہ جان کر مزید حیرت ہوئی کہ ابھی حال ہی میں اسرائیل کو دُنیا کی مضبوط معیشتوں میں شامل کیا گیا جو 2008ء کے بین الاقوامی معاشی بحران سے زیادہ متاثر نہ ہوئی ہوں۔ اسرائیل کی چیمبر آف کامرس کی جانب سے ہمیں جدید ٹیکنالوجی سے لیس مارکیٹ کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ اسرائیل اس وقت کمپیوٹر ٹیکنالوجی، سوفٹ ویئر اور ٹیلی کمیونیکیشن میں دنیا میں صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ خفیہ طور پر پاکستان کی دفاعی اور فوجی ضروریات کے سامان کو اسرائیل ہی ترسیل کر رہا ہے جن میں فضائیہ سے لے کر ٹینک، راڈار اور اس طرح کی دیگر اشیا شامل ہیں۔ بعدازاں ''حیفہ'' میں ایک نامی گرامی بزنس مین سے ملاقات ہوئی، جس نے یہ بتا کر تو بم ہی پھاڑ دیا کہ پاکستان اور چین کے تعاون سے بننے والے جے ایف 17 تھنڈر (JF17 Thunder) میں اسرائیلی ٹیکنالوجی استعمال ہوئی ہے۔ مزید حیرت کا سامنا اُس وقت ہوا جب معلوم ہوا کہ ایمیزون (Amazon) کی مشہورِ زمانہ اِی بُک ریڈر کی ''کِنڈل'' (Kindle) اسرائیل میں ہی تیار ہوتی تھی۔ ''ڈیل'' (DELL) کمپنی کے دفتر جا کر معلوم ہوا کہ دُنیا بھر میں مشہور پروسیسر یہیں تیار کیے جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسرائیلی معیشت کا شمار اقوامِ عالم کی پائیدار اور ترقی یافتہ معیشتوں میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کہ ستر وہیں مضبوط ترین معیشت ہے۔ 2011 میں اسے سب سے پائیدار اور کرائسس کا مقابلہ کرنے والی معیشت کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہاں قدرتی گیس کی دریافت نے بھی مقامی معیشت کی روز افزوں ترقی میں سونے پہ سہاگہ کا کام کیا ہے۔

جبکہ اسرائیل کی اپنی خفیہ ایجنسی بھی امریکہ کے علاوہ خود اسرائیل میں بھی انتہائی رازداری سے اور دنیا بھر کی نظروں میں دھول جھونک کر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جس کا بھانڈہ جیمز بیمفورڈ (James Bamford) جیسے صحافی بھی بارہا پھوڑ چکے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کا تاریخی سحر:

اگلے چند دن اسی رولر کوسٹر میں گزرے۔ ہم سفر کر رہے تھے۔ تقریریں جھاڑ رہے تھے۔ کھانے کھا رہے تھے اور نت نئے لوگوں سے مل رہے تھے۔ میں بہت مصروف تھا یا مصروف رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمعہ تک مجھے ہر صورت وہ لمبا اور بے قرار کر دینے والا انتظار برداشت کرنا تھا جب تک حاضری کی نوبت نہ آ جائے۔

ہم نے جمعہ مسجد اقصیٰ میں ادا کرنا تھا۔ اس کے لیے ہمیں کوئی 65 میل کا سفر طے کر کے یروشلم پہنچنا پڑا۔

پھر وہ ساعت آ گئی جو جان پر بہت گراں گزرنی تھی۔ منزل کی طرف تیز اُٹھتے قدم۔ پہلے یروشلم کا نیا حصہ اور پھر پُرانا حصہ۔ کبھی اُترائی اور کبھی چڑھائی۔ کشادہ گلیوں سے ایک دم پُرانی اور تنگ گلیوں کا سفر۔ پھر ایک دم اُفق کھل سا گیا اور نظر کے سامنے ''ڈوم آف راک'' کا سنہرہ گنبد تھا۔ بچپن سے مسجد اقصیٰ کے نام پر اکثر یہی سنہری گنبد دکھائی دیتا تھا اور یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ مسجد گنبد سے پچھلی طرف ہے۔ وہاں پہنچ کر وہی کیفیت طاری ہوئی جو حرم پاک اور روضۂ رسول ﷺ پر پہنچ کر ہوتی تھی۔

مسجد اقصیٰ میں بھرپور ہجوم تھا۔ کچھ روایتی نمازی معمول سے نماز ادا کرتے ہوئے، کچھ وارفتگی سے اپنی پہلی یا دوسری حاضری کے جذب میں ڈوب کر جھکتے ہوئے، بس مجھے یہ یاد رہا کہ قبلۂ اوّل میں اللہ کے حضور جھکنے کا مزہ زندگی میں کسی بھی دوسری نماز سے کہیں زیادہ تھا۔ آنسوؤں کی ایک لمبی جھڑی میں، میں نے اپنے رب کو پکارا، ابّا جی کو یاد کیا اور اُن کی مغفرت کا طلب گار رہا۔ دُعا ختم کی تو ایک آسودگی کا احساس ہوا، جیسے قبولیت کا اعلان ہو چکا ہو۔

ارضِ فلسطین کی وسعت سب کو سما سکتی ہے:

اس بار غزہ کی پٹی پر نہ جا سکنے اور حالات کا قریب سے جائزہ نہ لے سکنے کا مجھے افسوس رہے گا۔ ایک موقع پر جب میں نے اسرائیلی حکومت کے ایک ذمہ دار سے فلسطینی علاقوں کی زبوں حالی کا شکوہ کیا تو جواباً یہ سننے کو ملا کہ وہ تو ان علاقوں کو پہلے ہی فلسطینی حکومت کے حوالے کر چکے ہیں اب وہ جانیں اور ان کا کام۔۔۔

ہم غزہ کی پٹی کا دورہ نہ کر سکے۔ فلسطینی علاقوں کی غربت کے بارے میں کہیں کوئی سوال اُٹھایا تو فوراً جواب ملا۔ ''وہ جان بوجھ کر غریب ہیں۔ حماس نے اپنے علاقوں کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا ہوا ہے تاکہ اس بہانے وہ دُنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ سکیں۔ اگر وہاں لوگ مفلوک الحال ہیں تو فلسطینی اتھارٹی کی کرپشن کی وجہ سے اور کرپشن کرنا اُن کی ذاتی چوائس ہے۔''

تاہم اسرائیلی اور فلسطینی علاقوں کے درمیان موجود دیوار پھن پھیلائے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ دُور سے دیوار کے پار علاقوں کی حسرت، تنگی اور گھٹن کا ایک تاثر تھا جو ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

میں جب یروشلم پہنچا تو وہاں سے ایک عدد فلسطینی رومال لیا اور وہی پہن کے پھرتا رہا۔ یاد رہے کہ اس قدیمی پہناوے کو یاسر عرفات نے قبولِ عام بخشا تھا۔ دیوارِ گریہ کے پاس مجھے دو اسرائیلی فوجی نظر آئے۔ ایک عورت اور ایک نوجوان مرد۔ دونوں جدید فوجی لباس پہنے ہوئے مکمل طور پر مسلح تھے اور اُن کی بندوقیں تنی ہوئی تھیں۔ میں وہاں رُکا تو وہ چونکے۔ تاہم یہ جان کر کہ میں وہاں تصویر بنانے کے لیے ٹھہرا ہوں، ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تصویر اب بھی میرے کیمرے میں محفوظ ہے۔ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے کاندھے پر ہیں اور میں فلسطینی رومال میں دو اسرائیلی وردیوں کے درمیان کھڑا ہوں جب کہ بندوقیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں اور بندوقوں کو زمین کی طرف ہی جھکنا چاہیے، اس سے پہلے کہ وہ دوسرے انسانوں پر تان لی جائیں۔

مجھے ہاؤس آف لارڈز والی فلسطینی لڑکی کی آواز پھر اپنے کانوں میں سُنائی دی۔ ''ایما نوئل، خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ ارضِ فلسطین مجھے اور تمھیں دونوں کو سنبھال لے گی۔ اُس پر پہرے مت بٹھاؤ، قدغنیں مت لگاؤ، اس ماں کی آغوش میں بہت جگہ موجود ہے''۔

بارہواں باب:

اسرائیلی تلخ رویوں کا مہمان نوازی میں بدلنا

2016ء میں مجھے ارضِ مقدس کا دوسرا سفر کرنے کا موقع ملا۔جس کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ 2014 میں میرے ایک مسیحی دوست ریورینڈ رانا خان کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی۔مختصر سی بات چیت میں انھوں نے مجھے ارضِ مقدس یروشلم میں ملاقات کرنے اور ایک مذہبی تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔شومئ قسمت کہ دیگر امور کی مصروفیات کے سبب یہ سفر نہ ہوسکا اور جب 2016ء میں دوبارہ دعوت ملی تو اس بار موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔والدِ گرامی کی خواہش بھی یہی تھی کہ ارضِ مقدس کی زیارت کو جاؤں۔اپنے بیٹے عمر قریشی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تو گویا ''نیکی اور پوچھ پوچھ'' کے مصداق وہ تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔

سینٹ جارجز کالج یروشلم القدس میں تعلیمی پروگرام:

یہ سفر نہ صرف اس لیے بھی ایک خاص اور مقدس سفر بن گیا کہ بیت المقدس کی زیارت پیشِ نظر تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک ''بین المذاہب'' تعلیمی پروگرام میں شرکت بھی کرنا تھی وہ بھی بشپ ڈاکٹر رچرڈ چیتھم (Dr. Richard Cheetham) اور شیخ ابراہیم موگرا جیسی دو اہم اور عیسائیت اور اسلام کی دو نمائندہ شخصیات کے ساتھ۔

یہ پروگرام 1920ء سے قائم شدہ سینٹ جارجز کالج یروشلم القدس جیسی ایک ایسی تاریخی عمارت میں منعقدہ ہونے جارہا تھا جو ہر رنگ نسل اور مذہب کے لوگوں کو اپنے ہاں خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ کمیونٹی کے تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی معاملات نمٹانے میں بھی پیش پیش ہے۔

لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ کے ٹرمینل پانچ سے ہماری پرواز نے اُڑان بھرنا تھی۔برٹش ائرویز کے عملے کی رہنمائی میں ہم نے اپنے لیے منتظر ایک بس میں قدم رکھا اور روانہ ہوگئے۔بعض مسافر تو طویل رہداری کی وجہ سے بھی شکوہ کناں تھے۔

میری سیٹ ایک ایسے یہودی مسافر کے ساتھ تھی جو اپنے روایتی مذہبی لباس میں تھا۔عمر نے پرواز سے قبل موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جتنا ممکن تھا ای میل کرنے کی ٹھان لی اور اسی کام میں لگ گیا۔اتنے میں یہودی شخص نے عمر سے امریکی صدارتی الیکشن کے امیدواروں کی ہونے والی بحث کے نتائج پوچھے تو عمر نے اپنے موبائل سے دکھا دیئے۔نتائج دیکھتے ہی اس نے پیش گوئی کردی کہ اب کے ٹرمپ آیا ہی آیا (اور ایسا ہی ہوا) ہلری کلنٹن کی ممکنہ ہار اور ٹرمپ کی صدارت کے بارے میں اس کے کئی خدشات بجا تھے۔ہماری بات چیت تاوقتِ پرواز جاری رہی۔یہاں یہ دیکھنے میں بھی آیا کہ خاطر و مدارت اور سہولیات کی رسائی سے متعلق یہودی مسافر گویا ''وی آئی پی'' کا درجہ رکھتے ہیں، یعنی کھانا اُن کو سب سے پہلے دیا جاتا ہے تاکہ اُن کے کھانے میں غلطی سے کسی قسم کا غیر کوشر کھانا شامل نہ ہوجائے۔(یاد رہے کہ یہودی بھی مسلمانوں کی طرح جانور کو حلال کر کے کھاتے ہیں اور یہ کھانا صرف اور صرف یہودیوں کی دکانوں پر ہی میسر ہوتا ہے مذہب پر سختی سے کاربند رہنے والے یہودی کسی غیر یہودی کے حلال کردہ کھانے پر اعتبار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔)

ارضِ مقدس پہ پہنچنے کی خوشی سب چہروں پہ عیاں تھی مگر کچھ ہی لمحوں بعد عجیب کیفیت اور بدمزگی کا شکار ہوگئے جب

صغریٰ اور آصف کو مزید پوچھ گچھ اور تشویش کے لیے انتظار گاہ میں روک لیا گیا۔صورتِ حال دیکھی نہ گئی تو عمر اور میں بشپ چیتھم کی ہمراہی امیگریشن آفیسر کی طرف چل دیے اور اپنے ساتھ لائے ہوئے دعوت نامے دکھائے تاکہ گروپ کے ارکان کی گلوخلاصی ہو۔مگر ہوا یہ کہ انھوں نے عمر کو بھی روک لیا اور اس سے بھی پوچھ گچھ شروع کر دی۔ بخدا ایسا رویہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔مگر عمر اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا اور اپنے آپ کو ہر طرح کے حالات و واقعات میں سرخرو دیکھنے کے عزمِ مصمم سے اس مشکل مرحلے میں بھی خود اعتمادی دکھانے میں کامیاب ہوا۔گروپ کے دیگر اراکین بھی آہستہ آہستہ ملتے گئے اور کارواں دوبارہ ایک ساتھ ہو گیا۔تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہمارے ارکان جلد ہی واپس لوٹ آئے تو بشپ نے خوشگوار موڈ میں کہا ''سینٹ جارج کالج میں پہنچتے ہی ہمیں وہی مقام اور احترام ملے گا جو ایک واجب العزت مہمان کا حق ہے''

سینٹ جارج کالج کے لاجسٹک اور آپریشنل آفیسر بشارہ خورے نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ہم بس میں سوار نخلستانِ کالج میں سرِ شام جا پہنچے۔کالج کے ڈین گریگری جینکن نے کھلے دل سے ہمارے وفد کا استقبال کیا۔یوں تو یہاں کی فضا ہی ایسی ہے گویا آپ گھر سے چلے ہوں اور گھر ہی آن پہنچے ہوں مگر یہاں میزبانی کی کیا ہی بات ہے۔انتہائی عمدہ کھانے نہایت پرتکلف انداز میں پیش کیے گئے۔ساتھ ساتھ علمی ادبی اور امن و آشتی کے پرچار کی گفتگو کا لطف اپنی جگہ۔آرچ بشپ اور گیسٹ گارڈن کے نام سے قائم دو باغات تو گویا دنیا بھر کے پھولوں اور درختوں سے بھرے ہوئے ہیں جو کالج کی شان و شوکت میں اضافہ کیے ہوئے ہیں۔

دیوارِ گریہ:

یہ قبل مسیح زمانے کی 19 میٹر اونچی دیوار یروشلم کے قدیم شہر (جو کہ تقریباً 220 ایکڑ پر محیط ہے) میں واقع ہے۔اسکو دیوارِ گریہ کے علاوہ کوٹیل (COTEL) یا مغربی دیوار (WASTERN WALL) کے طور پر جانا جاتا ہے اس دیوار کی زیارت یہودیوں کے لیے حج کا درجہ رکھتی ہے۔اسکا بہت سا حصہ رومیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا یہ دیوار (MOUNT OF OLVIES) پر واقع ہے جو کہ حرم الشریف کے نام سے پہچانا جاتا ہے اس جگہ پر سنہری گنبد والی مسجد (DOME OF THE ROCK) قبۃ الصخرا بھی واقع ہے۔جو کہ عبدالملک نے 688 میں تعمیر کیا تھا۔حرم الشریف کے اندر قدیم قبرستان بھی موجود ہے۔

مسجدِ اقصیٰ اور دیوارِ گریہ کا سحر:

اگلے روز سورج کی کرنوں نے مجھے بیدار کیا اور خوشگواری میں یہ جان کر اور بھی اضافہ کر دیا کہ عمرِ عزیز نے آج ایک بار پھر بیت المقدس کے سفر کا شرف بخشا ہے۔ایک مسلمان کے لیے مکہ و مدینہ کے بعد یہی تو محترم و مکرم جگہ ہے۔والدِ گرامی کی شفقت بھری سرگوشی یہاں بھی ساعتوں میں رس گھولتی رہی۔یہاں ہر طرف لوگ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے نظر آتے ہیں اور ہر رنگ، نسل کے مرد عورت اور بچے گروہوں کی صورت ایک سجدہ یہاں ادا کرنے کھنچے چلے آتے ہیں۔

چونکہ ہمارے ساتھ یہودی ارکان بھی تھے تو ان کی معیت میں دیوارِ گریہ کے سائے میں ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔یہاں میرا سامنا ایک یہودی یرمیکائیل کے ساتھ ہوا۔بات چیت کے دوران پتہ چلا کہ وہ پاکستان اور جاپان سمیت دنیا بھر کی سیاحت کر چکا ہے۔سچائی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا کبھی بدھ مذہب اختیار کیا اور کبھی عیسائیت۔بالآخر یہاں ایک بار پھر اس نیت اور غرض سے آیا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہودیت ہی اس کا سچا مذہب تھا جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔

اتنے میں میری نظر ایک نوعمر یہودی لڑکے پہ پڑی جو اپنی دنیا میں مگن دیوارِ گریہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا دھوائیں کے مرغولے چھوڑتا آ رہا تھا۔ وہاں پہ مقیم ایک محافظ سے نظریں چار ہوتے ہی کچھ دیر سنبھلا اور بالآخر دیوارِ مقدس کے احترام میں محافظ کی روک ٹوک پہ سگریٹ بجھا دیا گیا۔

ابتدائی طور پر تو ہمارا مسلم وفد ہی مسجدِ اقصیٰ کو جانے والا تھا مگر بعد میں عیسائی اراکینِ وفد بھی ساتھ ہو لیے۔ یہاں بھی آصف پاسپورٹ کی چیکنگ کے لیے ایک بار پھر دھر لیا گیا۔ (یاد رہے کہ آصف لندن میں میٹرو پولیٹین پولیس کا آفیسر تھا لیکن اس کے باوجود اسرائیلی سیکورٹی آفیسران نے اُس سے کوئی رعایت نہ برتی)۔ جبکہ ہم نے اس موقع پر ارد گرد قائم دوکانوں پہ نظر ڈالی۔ ان راہوں پہ چلے جن پہ ایک وقت میں خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر جنابِ عیسیٰ روح اللہ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے قدموں کی زینت بخشی تھی۔

مسجدِ اقصیٰ میں چونکہ صرف مسلمانوں کو داخلے کی اجازت ہے اس لیے ہمارے کچھ معزز اراکین کو یہاں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مسلمانی کی شرط اس لیے بھی رکھی گئی کیوں کہ پہلے ایک یہودی نے یہاں داخل ہوتے ہی عبادت میں محو مسلمانوں پہ فائرنگ کر دی تھی جس سے بیس کے قریب معصوم لوگ جان کی بازی ہار بیٹھے تھے۔

ہم جیسے ہی آگے بڑھے فوجیوں کو اپنا محاذ سنبھالے پایا۔ یہ سوال بار بار پوچھا گیا آیا ہم مسلمان ہیں؟

دونوں طرف ایک عظیم الشان درختوں کی قطار خوش آمدید کہہ رہی تھیں اور مطلع ابر آلود تھا، بادل کے ٹکڑے رہ رہ کے سورج سے آنکھ مچولی کر رہے تھے۔ پانچ منٹ کا مسجدِ اقصیٰ کے اندرون تک یہ فاصلہ بھی عجیب اثر انگیز مرحلہ تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم عظیم الشان گنبد کے سامنے تھے۔ سورج کی کرنیں سنہری گنبد کو بوسہ دیتی اپنی منزل کو گامزن تھیں۔ سفید رنگ کے ساتھ ساتھ نیلی، سنہری اور سبز رنگ کی ٹائیلیں مسحور کن نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ ہمارے دائیں جانب نیچے کو جاتیں سفید رنگ کی سیڑھیاں جن کے زینوں پہ بڑے بڑے سفید پتھر ایستادہ تھے۔ یہیں سے ایک بار پھر نظریں سنہری گنبد پہ پڑیں۔ یاد رہے کہ یہ سنہری گنبد والی مسجد، مسجدِ اقصیٰ نہیں ہے بلکہ یہ قبلہ کی جانب سیاہ گنبدوں والی مسجد ہے جہاں لوگوں کا جمِ غفیر اس کوشش میں دکھائی دیا کہ پہلی دو صفوں میں شامل ہو سکیں۔ دور کچھ فاصلے پہ صدر دروازہ نظر آیا جس میں سرخ قالین بچھا تھا۔

مسجدِ اقصیٰ کے پیش امام شیخ ولید سیام کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی قریشی ہاشمی ہوں تو انتہائی محبت، احترام اور عقیدت سے پیش آئے۔ مسجد کی خدمت کا اعزاز بھی یہاں کے قریشی ہاشمی خاندان کو حاصل ہے۔ ہم نے یہاں حاضرین کے روزِ مرہ سے لے کر سکیورٹی ایشوز سمیت کئی پہلوؤں پہ بات چیت کی۔

عربوں کی نسل کشی اور ''بھوتوں کا شہر، یروشلم'':

14 مارچ 2015ء صبح اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ایک بار پھر جلوہ گر ہے۔ یہاں علی الصبح ہی کچھ حادثات پیش آ چکے ہیں جس کا سیدھا سا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمارے وفد کے ارکان کو ایک بار پھر سکیورٹی چیکنگ کے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگلے ہی لمحے ہمیں یہ جاں گسل خبر ملی کہ اسرائیلی فوجیوں نے ہیبرون شہر کا اندرونی داخلہ بند کر رکھا ہے اور ہمارا دورہ بھی کینسل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں چرچ آف انگلینڈ کے زیرِ انتظام ایک سکول میں جانے کا اتفاق ہوا اور یہاں زیرِ تعلیم بچوں سے بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا جو مسلم بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ بچوں کی عمر دس سے گیارہ سال کے درمیان ہے ان کے نشست و برخواست سے جدید لائف سٹائل کے ساتھ ساتھ روایتی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ یہ بچے بھی فٹ بال کھیلنے کے دلدادہ ہیں۔ موسیقی اور شاپنگ سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں کی پرنسپل سوزن کھائیو سے ملاقات بھی

ہوئی۔ ان کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ رعنائیوں سے بھرپور شہر یروشلم اب ''بھوتوں کا شہر'' کہلائے جانے کی منزل تک جا پہنچا ہے۔ سکیورٹی خدشات کے پیشِ نظر بچے شام چھ بجے کے بعد گھر کی چار دیواری میں قید ہو کے رہ جاتے ہیں، جہاں ان کے کھیل کود پہ اثر پڑتا ہے وہاں گلیوں میں بھی سرِ شام اُلّو بولنے لگتے ہیں۔ اور یہاں زندگی بے یقینی کی کیفیت کا ہر وقت شکار رہتی ہے۔ کسی بھی سنسناتی گولی کا شکار کسی بھی لمحے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ سوال پوچھا گیا کہ اگر اس طرح کے خوف و ہراس میں آپ کے بچے برطانیہ میں رہ رہے ہوں تو آپ کی اور اُن بچوں کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اسی دوران ایک اور دس سالہ بچہ بول اٹھا: ''ہماری سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ امن کے دنوں میں خالی پڑی گلیوں میں گھوم لیں۔ یہاں نہ تو کوئی پارک ہیں اور نہ کھیل کے میدان ہیں۔ ایسے گھٹن زدہ ماحول میں تو نہ خود زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں''

ایک اور ننھا طالب علم بول اٹھا: ''ہم ہر وقت خوف کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ تو کہیں جا سکتے ہیں اور نہ ہی سکون سے رہ سکتے ہیں۔ گذشتہ برس ہمارا رملہ جانا ہوا تو سکیورٹی چیکنگ کے نام پر چھ گھنٹے دیر سے گھر لوٹے تو یہاں سب فکر مند تھے''

آج صبح کے ایک واقعے بارے بات چیت کی تو پتہ چلا کہ ایک فلسطینی موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ایک بچے کے بقول ایسے حالات میں آپ اپنی جان بچانے کی غرض سے خطرے سے بھاگ بھی نہیں سکتے کیوں کہ اسرائیلی فوجیوں کے بقول ہم کوئی ''خطرناک چیز'' ان سے چھپانے کی غرض سے بھاگ رہے ہیں اور گولی ہی آخری حل ہے یعنی صرف شک کی بنیاد پر ہماری موت سے اسرائیلی فوجیوں کی زندگی کا تحفظ یقینی بنایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ گولیوں کی گھن گرج سے سہما ہوا ایک بچہ بھاگا جا رہا تھا کہ اسرائیلی فوجیوں نے بیک وقت پچاس راؤنڈ فائر کر کے ننھی سی جان کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ اور ایک لڑکا بولا کہ اس کو محض اس لیے گولی سے بھون ڈالا گیا کہ اس نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے اور اسرائیلی فوجیوں کو گولی مارنے کا اس سے بڑا جواز اور کیا چاہیے تھا؟

ایک اور بچے نے تو یہ کہہ کر ہماری حیرت دوگنا کر دی کہ اس کا ایک پندرہ سالہ دوست صرف اس لیے گرفتار کر لیا گیا تھا کہ اس نے فلسطینی آزادی کے متعلق فیس بک پیج کو لائک کیا اور کچھ ویڈیوز بھی شیئر کیں۔ اخیر میں سکول کی پرنسپل نے کہا کہ ہم بچوں کو اپنے والدین کے بغیر سکول سے باہر کہیں بھی جانے نہیں دیتے۔ عمر کے کہنے پہ انہوں نے بتایا کہ وہ بچوں کو ان کا بچپنا لوٹانے میں کسی بھی قسم کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، ان کے دائرہ اختیار ہی میں کچھ نہیں۔

ایک اور بچے نے میڈیا کے کردار بارے بتایا کہ ایک بھی اسرائیلی فوجی کی موت پورے میڈیا کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے جبکہ سیکڑوں فلسطینی جوانوں کی ہلاکت گویا ان کے لیے کوئی خبر ہی نہیں۔ وہ بچوں، عورتوں اور سیکڑوں مردوں کی موت کو محض سکیورٹی خدشات کا جواز بنا لیتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان بچوں کی آنکھوں میں چمک ہے، خوف و ہراس کی فضا میں شب و روز گزارنے کے باوجود ان میں امیدوں اور روشن مستقبل کے دیے جلتے ہیں۔ یہ بھی کیمبرج اور اوکسفورڈ جیسی یونیورسیٹوں میں تعلیم پا کے اپنا اور اپنی قوم کا مستقبل سنوارنا چاہتے ہیں۔ یہ بچے تنہا تو کچھ نہیں کر سکتے۔ اب یہاں دنیا کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کو حق دیں، آزادی دیں۔ مسلم دنیا خاص طور پر پاکستان کہ جو سعودی عرب اور امریکہ کا قریبی اتحادی بھی ہے اور ایک جوہری طاقت کا حامل بھی، فلسطینیوں کے مسائل حل کرنے میں اپنا اثر رسوخ دکھائے۔

تیرہواں باب:

بین الاقوامی تعلقات: مفہوم، تقاضے

بین الاقوامی تعلقات دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو حکومتی سطح پر دو ممالک کے درمیان ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو عوامی سطح پر ہوتے ہیں۔ دو قوموں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے یہ دونوں نوعیت کے روابط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکومتی سطح پر تجارت، ثقافت اور دوسرے شعبوں میں تعاون اور قربت کے لیے معاہدے ہوتے ہیں جن کے تحت وفود کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے اور مختلف نوعیت کی سرگرمیاں ترتیب دی جاتی ہیں۔ سماجی یا عوامی سطح پر غیر سرکاری تنظیمیں دوسرے ملک کی سماجی تنظیموں سے مل کر باہمی دلچسپی کے امور پر مشترکہ پروگرام بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان اور بھارت میں موجود مختلف صحافتی اور سماجی تنظیمیں مل کر سیمینارز، کانفرنسوں وغیرہ کا انعقاد کرتی ہیں اور دیگر سرگرمیاں ترتیب دیتی ہیں۔ برطانیہ جرمنی اور فرانس کی آپس کی دشمنی کسی سے پوشیدہ نہیں اور عالمی جنگیں لڑنے سے ان کا جس قدر نقصان ہوا اُس سے انہوں نے سبق سیکھا اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے یورپ کے تمام ممالک ایک لڑی میں پرو کر یورپی مارکیٹ اور یورپی کرنسی بنا کر اپنی معیشت کو استحکام دیا گیا۔

ٹیکنالوجی کے فروغ کی وجہ سے آج کی دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت ماضی کے مقابلے میں کم ہوگئی ہے، اس وجہ سے افراد کے درمیان باہمی روابط میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دو اقوام کے درمیان باہمی معاملات اگر درست نہ ہوں یا کشیدگی پائی جاتی ہو تو اس کا اثر افراد کے تعلقات پر بھی پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود ریاستی حکمت عملی اس تعلق کو ایک خاص حد سے بڑھ کر روک نہیں سکتی۔ مثال کے طور پر پاکستان اور بھارت میں کشیدگی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ثقافتی اور سماجی سطح پر رابطہ کسی نہ کسی صورت باقی رہتا ہے۔

انسانوں کے درمیان کشیدگی کم کرنے کے لیے چونکہ رابطہ ضروری ہے، اس لیے اسلام بھی اقوام عالم میں قرب اور رابطہ کا علمبردار ہے۔ وہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ دوسری اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جائیں اور ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے خیر خواہی اور انصاف کے ساتھ باہمی سطح پر معاملات کئے جائیں۔ ان سطور میں کوشش کی گئی ہے کہ اقوام کے درمیان تعلقات کے ضمن میں نہ صرف اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے بلکہ اس حوالے سے تجاویز بھی دی جائیں۔

اسلام اور بین الاقوامی تعلقات:

درج ذیل سطور میں اس انتہائی اہم اور حساس موضوع کو زیر بحث لایا جا رہا ہے اس لئے کئی جرائد و رسائل اور کتب کے مطالعہ کے علاوہ علما کرام سے مشاورت اور راہنمائی لی گئی بالخصوص حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب فقہی مقالات سے سیر حاصل استفادہ کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر جہاں جہاں اقتباسات لئے گئے ہیں وہاں نشان دہی کر دی گئی ہے۔

ہم پہلے بھی آیات واحادیث کی روشنی میں عرض کر چکے ہیں کہ غیر مسلم ممالک کے ساتھ مصالحت اور امن پسندی اگر مسلمانوں سے متصادم نہ ہوتو وہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ...(1)

''اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں، تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ''

لیکن حالت امن میں یہ تعلقات عدل وانصاف، غمخواری، تعاون علی الخیر اور دفع شر کی بنیاد پر مبنی ہوں گے۔

عدل وانصاف:

تمام مسلمانوں کو ہر حالت میں عدل و انصاف کرنے کا حکم ہے جس کا ذکر ہم جہاد کے باب میں بھی کر چکے ہیں۔ مسلمان کو کسی بھی حالت میں ظلم کی اجازت نہیں۔ چاہے خیر کے لیے شر سے ہی مقابلہ کیوں نہ ہو۔ یا غیروں کے مقابلے میں اپنے ہی کھڑے کیوں نہ ہوں۔ قرآن مسلمان سے انصاف کا متقاضی ہے۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ(2)

''اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ یا قرابت والوں کا۔(3)''

اور اسلام نے اس کی تاکید کی ہے کہ ہر مسلمان پر عدل وانصاف واجب ہے، حتیٰ کہ ان غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرنے میں بھی جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی ہو۔

اسی سورۃ کی دوسری آیت کریمہ میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ کسی قوم کے ساتھ بغض اور عداوت مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ مسلمان اس قوم کے ساتھ عدل وانصاف کے خلاف سلوک کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (4)

''اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ (اللہ کے احکام کی پابندی) کے لیے ہر وقت تیار ہو، (اور) انصاف کی گواہی دینے والے ہو۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو۔ انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''(5)

معاہدہ کی پاسداری:

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے عدل وانصاف کے احکام میں سے ایک وعدہ اور مصالحت کی شرائط کی پاسداری بھی ہے۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (6) ''اور پورا کیا کرو تم لوگ اپنے عہد کو، بیشک عہد کی باز پرس ہوگی۔''

ایفائے عہد کی اہمیت:

وعدہ کی پاسداری کے احکام قرآن مجید اور احادیث میں کئی جگہ بیان کیے گئے ہیں اور یہ احکام صرف کتابوں کی زینت نہیں، بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اور ان کے بعد بھی مسلمان اس کی ایسی روشن مثالیں چھوڑ کر گئے ہیں کہ دوسری کسی قوم میں بھی ایفائے عہد کی ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد حضرت یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے، کفار قریش نے ان دونوں کو پکڑ لیا، اور ان سے یہ وعدہ اور عہد لے کر ان کو چھوڑا کہ تم دونوں مدینہ منورہ جاؤ گے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر قتال نہیں کرو گے۔ یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ پہنچے، اس وقت غزوہ بدر تیار تھا، ان دونوں نے یہ ارادہ کیا کہ ہم بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شریک ہو جائیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا: ''تم دونوں واپس جاؤ ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہیں''۔(7)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں صحابہؓ کے عہد اور وعدہ کی وجہ سے ان کو جنگ میں شرکت سے منع فرما دیا، اور دعا کی کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے خلاف مدد طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ غزوہ بدر کفر و اسلام کا پہلا معرکہ تھا اور اس غزوہ میں مسلمان اپنی تعداد بڑھانے کے زیادہ محتاج تھے۔

یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حد درجہ احتیاط تھی کہ حالت امن میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ دھوکہ اور بدعہدی سے پرہیز فرمایا۔

غیر مسلموں سے اظہار ہمدردی کا حکم:

حالت امن میں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات صرف عدل و انصاف اور وفاداری کی حد تک مقید نہیں ہوتے، بلکہ یہ تعلقات اظہار ہمدردی اور احسان کرنے کا بھی تقاضا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔(8)

اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اُن کے ساتھ تم کوئی نیکی یا انصاف کا معاملہ کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اظہار ہمدردی کی درخشندہ مثالیں:

(۱) ''ایک مرتبہ مشرکین مکہ کو شدید قحط لاحق ہو گیا، جس کے نتیجے میں وہ لوگ جانوروں کی ہڈیاں اور کھالیں کھانے پر مجبور ہو گئے (حضرت) ابوسفیان جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ آئے، اور کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان پر سے یہ قحط ہٹا دیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کیلئے بارش کی دعا کی، جس کے بعد بارش ہوئی اور قحط کی مصیبت ان سے دور ہو گئی۔''(9)

(۲) حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ ''السیر الکبیر'' میں فرماتے ہیں:

''ابن مروان خزاعیؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت مجاہدؒ سے کہا کہ مشرکین میں سے ایک شخص کے ساتھ میری قرابت داری ہے، اور میرا اس کے ذمہ مال ہے، کیا وہ مال میں اس کے لئے چھوڑ دوں؟ انہوں نے فرمایا، ہاں، اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔''

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ''اسی سے ہم دلیل لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی مشرک کے ساتھ صلہ رحمی کرنا چاہے وہ مشرک قریبی رشتہ دار ہو، یا دور کا رشتہ دار ہو، چاہے وہ حربی ہو، یا ذمی ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔''

اس کی دلیل حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے:

''ایک مرتبہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی، نماز کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ پھیرا، جب میں ادھر متوجہ ہوا تو وہ حضور اقدس ﷺ تھے، آپ نے فرمایا: کہ کیا تم مجھے ابن قرفہ کی بیٹی ہبہ کر دو گے؟ میں نے کہا: جی ہاں، چنانچہ میں نے ابن قرفہ کی بیٹی حضور اقدس ﷺ کے حوالے کر دی، اور حضور اقدس ﷺ نے وہ بچی ان کے ماموں حزن بن ابی وہب کے پاس بھیج دی، حزن بن ابی وہب بھی مشرک تھا، اور وہ بچی بھی مشرکہ تھی۔''

''اور جس زمانے میں مکہ مکرمہ میں قحط پڑا، اس زمانے میں حضور اقدس ﷺ نے پانچ سو دینار مکہ مکرمہ بھیجے، اور ابوسفیان ابن حرب اور صفوان بن امیہ کو دینے کا حکم دیا، تاکہ یہ دینار مکہ مکرمہ کے فقراء میں تقسیم کر دیئے جائیں، ابوسفیان نے ان دینار کو قبول کر لیا، لیکن صفوان بن امیہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے ذریعہ ہمارے نوجوانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔''(10)

تاریخ اسلام میں اس جیسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جو مثالیں ہم نے اوپر ذکر کیں، یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ کفر اور شرک سے بغض مسلمانوں کو غیر مسلمین سے صلہ رحمی اور ہمدردی چھوڑنے پر آمادہ نہیں کرتا، بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ صلہ رحمی اور ہمدردی ان مکارم اخلاق میں شمار ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے لئے حضور اقدس ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے۔

بھلائی کے کاموں میں باہمی تعاون:

کفر و شرک کے ساتھ بغض و عناد مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کرتا کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنے، اور ظلم اور شر کو دور کرنے، اور کمزوروں، ضعیفوں، ناداروں کے ساتھ مدد کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیں، بلکہ نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون شریعت اسلامیہ کے ان مبادی میں سے ہے جس کا حکم قرآن کریم میں آیا، چنانچہ کفار پر ظلم اور زیادتی نہ کرنے کے سیاق میں قرآنی احکام وارشادات جگہ جگہ آئے ہیں اور کسی قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم (ان پر) زیادتی کرنے لگو۔ اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے''۔(11)

اس آیت کا شان نزول مفسرین نے یہ بیان کیا ہے:

''حدیبیہ کے سال میں مشرکین مکہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا، اس

لئے بعض مسلمانوں نے یہ چاہا کہ چونکہ مشرکین مکہ نے ایام صلح میں مناسک حج وعمرہ ادا کرنے سے ہمیں روک دیا تھا ،اس لئے ہم ان سے انتقام لیں گے،اس پر یہ آیت نازل ہوئی،جس میں مسلمانوں کو انتقام لینے سے روک دیا گیا۔''

لہٰذا اس آیت میں جس تعاون کا ذکر ہے وہ غیر مسلمین کے ساتھ تعاون کو بھی شامل ہے، کیونکہ یہ آیت غیر مسلمین کے سیاق میں ہی نازل ہوئی تھی۔

لہٰذا اگر غیر مسلمین کے پاس انسانیت کے نفع کے لئے کوئی ایسا لائحہ عمل اور طریقہ کار ہو،جس میں شریعت اسلامیہ کے معارض کوئی بات نہ ہو تو مسلمانوں کیلئے اس طریقہ کار اور منصوبے میں شریک ہونا،اور اس بارے میں غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنا مستحسن ہے،خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''حلف الفضول'' میں غیر مسلموں کے ساتھ شرکت کر کے اس کو ثابت کر دیا۔

حلف الفضول اور اس کی اہمیت:

اس حلف کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ ''زبید'' کا ایک شخص سامان تجارت لے کر مکہ مکرمہ آیا، عاص بن وائل نے وہ سامان اس سے خرید لیا، عاص بن وائل نے اس کا حق (اس سامان کی قیمت) روک لیا ''زبیدی'' نے اپنے حلیفوں سے اس ظلم کے خلاف مدد طلب کی، ان سب نے عاص بن وائل کے خلاف مدد کرنے سے انکار کر دیا، اور اس کو ڈانٹ کر بھگا دیا، جب ''زبیدی'' نے یہ برائی دیکھی تو قریش مکہ سے مدد طلب کی۔

قریش مکہ نے ذیقعدۃ کے مہینے میں کھڑے ہو کر قسم کھائی اور اللہ کے نام پر آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کے خلاف اور مظلوم کی مدد کیلئے ایک ہاتھ کی طرح ہو جائیں گے، جب تک سمندر میں ایک اون کے برابر تری رہے گی، یہاں تک کہ مظلوم کو اس کا حق ادا کر دیا جائے، چنانچہ قریش نے اس معاہدہ کو ''حلف الفضول'' کا نام دیدیا، اس کے بعد وہ لوگ عاص بن وائل کے پاس گئے، اور اس سے ''زبیدی'' کا سامان چھینا، اور زبیدی کے حوالے کر دیا۔

'حلف الفضول'' پہلا معاہدہ تھا جس میں انصاف اور مظلوم کی نصرت کی بنیاد پر اہل عرب نے ایک دوسرے سے عہد لیا تھا۔

بعد کے زمانے میں ''حلف الفضول'' ایک اصل بن گئی، جس کو بطور حجت اور بطور دلیل پیش کیا جانے لگا، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کو درست قرار دیا تھا اور ظہور اسلام کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

لَوْ دُعِيتُ بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ

''اگر زمانہ اسلام میں بھی مجھے اس قسم کے حلف اور معاہدے کیلئے دعوت دی گئی تو میں اس کو ضرور قبول کرلوں گا۔''

مفتی محمد تقی عثمانی صاحبؒ اس واقعہ کے فائدہ کے تحت لکھتے ہیں:

''حلف الفضول کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برقرار رکھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے جائز، بلکہ مستحسن ہے کہ وہ غیر مسلمین کے ساتھ ایسے معاہدے میں شریک ہوں جس کا مقصد مظلوم کی مدد کرنا، اور ظلم کو دفع کرنا ہو، اور دوسرے اچھے مقاصد ہوں جو انسانیت کیلئے مفید ہوں۔ اور جب مسلمان تعاون علی الخیر کیلئے اس طرح کے معاہدے میں شامل ہو جائیں گے تو اس کے نتیجے میں وہ ہر مظلوم کی مدد کریں گے، جو اس معاہدے کے تحت شامل ہوگا، چاہے وہ مظلوم مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو۔''(12)

فتح مکہ اور صلح حدیبیہ

فتح مکہ کی کامیابی کا سبب بھی یہ بنا کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے حلفاء بنی خزاعہ کی مدد فرمائی تھی، جو کہ غیر مسلم تھے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

''صلح حدیبیہ میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ عرب کے قبائل کو اختیار ہے کہ وہ اس معاہدہ صلح میں جس فریق کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں، یا حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ہو جائیں یا قریش کے ساتھ ہو جائیں، قبیلہ بنو خزاعہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ معاہدے میں شامل ہو گیا تھا، جبکہ قبیلہ بنو بکر قریش کی طرف ہو گیا تھا، اور بنی بکر اور بنی خزاعۃ کے درمیان پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی، اس معاہدہ صلح کے نتیجے میں امن قائم ہو گیا تو قبیلہ بنو بکر نے یہ ارادہ کیا کہ اس امن کے زمانے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنو خزاعہ سے اپنا انتقام لے لیں، چنانچہ بنو بکر کے کچھ لوگوں نے قبیلہ بنو خزاعہ میں رات گزاری، اور چند لوگوں کو قتل کر دیا، اور اس معاہدے کو توڑ دیا، اور قریش مکہ نے ہتھیاروں کے ذریعہ قبیلہ بنو بکر کی مدد کی، اور خفیہ طور پر قریش کے سرداروں نے ان کے ساتھ مل کر قتال کیا۔

اس واقعہ کے بعد قبیلہ بنو خزاعہ کے ایک شخص عمرو بن سالم خزاعی حضور اقدس ﷺ کے پاس گئے، اور آپ کے اور قبیلہ بنو خزاعہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی یاد دہانی کرائی، اور آپ سے مدد اور نصرت طلب کی، حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا: ''نُصِرْتَ يَا عَمْرَو بْنَ سَالِمٍ'' ''اے عمرو بن سالم تمہاری مدد کی جائے گی''

اس کے بعد آپ ﷺ نے قریش مکہ کو پیغام بھیجا کہ (چونکہ تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا) تین باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لو (۱) یا تو قبیلہ خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کرو (۲) یا قبیلہ بنی بکر جنہوں نے زیادتی کی ہے، ان کے معاہدے سے بری ہو جاؤ (۳) یا ان کے درمیان اور حضور اقدس ﷺ کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کو ختم کر دو۔ قریش مکہ نے تیسری بات یعنی معاہدہ توڑنے کو اختیار کر لیا، جس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ان سے جہاد کیا اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔(13)

تو حضور اقدس ﷺ نے قبیلہ بنو خزاعہ کی ہر طرح سے مدد کی، اور صلح حدیبیہ کے امن معاہدہ کو توڑنے کا سبب بھی ان کی مدد بنی، جس کی انتہاء اس پر ہوئی کہ حضور اقدس ﷺ کفار قریش کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور بالآخر مکہ فتح ہو گیا۔

مشترک مقاصد، اور ان کاموں میں جن کا نفع وسیع پیمانے پر تمام انسانیت کو پہنچتا ہو، ایسے کاموں میں مسلمانوں کا غیر مسلمین کے ساتھ تعاون کرنا اسلام اور مسلمانوں کی کشادہ دلی پر دلالت کرتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات اور مسلمان:

مسلمانوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے بین الاقوامی قانون کی تدوین پر توجہ دی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کا پہلا تحریری معاہدہ بھی ''میثاق مدینہ'' تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے نواحی قبائل کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان فقہاء کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے بین الاقوامی قانون کے اصول وضوابط مرتب کیے۔ اس حوالے سے سب سے پہلی کتاب، امام زید بن علی کی ''المجموعہ فی الفقہ'' ہے جس میں اس موضوع پر بحث کے ایک باب میں

وہ انٹرنیشنل (International Laws) زیر بحث لائے ہیں۔ اور اسے انہوں نے ''کتاب السیر'' کا نام دیا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات سے مراد حکمران (حکومت) کا وہ طرز عمل ہے جو وہ اجنبیوں (دوسری اقوام) کے ساتھ حالت جنگ یا حالت امن میں ملحوظ رکھے یہ رائے بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب امام ابوحنیفہؒ نے لکھی ،یعنی امام زید کی کتاب میں تو محض ایک باب تھا، امام ابوحنیفہ نے پوری کتاب لکھی۔ ان کے مشہور شاگرد امام محمد شیبانیؒ نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں۔

گویا مسلمانوں نے ابتدا ہی سے اس موضوع کو اپنی علمی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس کے حوالے سے قرآن وسنت کے منشاء کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ ابتدا میں ریاست اس شکل میں نہ تھی، جیسی آج ہے، اس لیے قوانین بھی زیادہ وسعت لیے ہوئے نہیں تھے، جدید دور کے مسلمان علما نے اس پر مزید وسعت کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات، دور حاضر کے تناظر میں:

آج مسلمان دنیا کی متعدد ریاستوں میں منقسم ہیں اور یہ سب ریاستیں اقوام متحدہ کی رکن ہیں۔ ان ریاستوں نے ساری دنیا کے ساتھ ایک متفقہ چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں جو آج کے دور میں بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد ہیں۔ اس چارٹر کا اگر قرآن مجید اور ارشادات پیغمبر بالخصوص خطبہ حجۃ الوداع سے تقابل کیا جائے تو حیرت انگیز مماثلت سامنے آتی ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع سے چند اقتباسات:

''سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہیں ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس سے معافی مانگتے ہیں۔ اسی سے توبہ کرتے ہیں اور ہم اللہ ہی کے ہاں اپنے نفسوں کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے تو پھر کوئی اسے بھٹکا نہیں سکتا اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا بندہ اور رسول ہے۔

اللہ کے بندو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید اور اس کی اطاعت پر پُرزور طور پر آمادہ کرتا ہوں اور میں اسی سے ابتدا کرتا ہوں جو بھلائی ہے۔

لوگو! میری باتیں سن لو مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں تم سے اس قیام گاہ میں اس سال کے بعد پھر کبھی ملاقات کر سکوں۔

ہاں جاہلیت کے تمام دستور آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

خدا سے ڈرنے والا انسان مومن ہوتا ہے اور اس کا نافرمان شقی۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد میں سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

لوگو! تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی حرام ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت کرتے ہو۔ دیکھو عنقریب تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہو۔

جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے میں ملیامیٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو باطل کیا جاتا ہے وہ ربیعہ بن حارث عبدالمطلب کے بیٹے کا ہے۔ (ربیعہ بن حارث آپ کا چچیرا بھائی تھا جس کے بیٹے عامر کو بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا)

تمہارے غلام تمہارے ہیں جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار نہیں۔

لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے۔

میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

خطبہ حجۃ الوداع کی اہمیت:

یہ خطبہ تمام دینی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس کا نقطہ آغاز اللہ اور اس کے بندے کے درمیان صحیح تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور بھلائی کی تلقین کرتا ہے۔

آج اس معاملے میں ہم اسلام کی تعلیمات کا زیادہ لحاظ نہیں رکھتے۔ مسلمانوں میں آج کل فیصلوں کی بنیاد شرعی احکام سے زیادہ ان کے جذبات ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک ملک کے مسلمان اس بات کو ملحوظ رکھے بغیر کہ کسی دوسرے ملک کے ساتھ ان کی حکومت نے کیا معاہدے کر رکھے ہیں یا دوسری قوم کے ساتھ اسلام تعلقات کے باب میں کیا نصیحت کرتا ہے، ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ کسی شرعی دلیل کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس سے اقوام کے باہمی تعلقات میں جو تلخی پیدا ہوتی ہے اور جس طرح جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، وہ ہر ہوش مند آدمی پر واضح ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان معاملات میں شرعی احکامات کو پیش نظر رکھیں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ ہم اقوام کے باہمی تعلقات میں امن اور بھائی چارے کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔

مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ سلوک:

بے شک ''اسلام'' پوری انسانیت کو صرف ایک اللہ پر ایمان لانے اور تمام رسولوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اور زندگی کے تمام معاملات اور حالات میں اللہ کی شریعت پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے، لیکن ''اسلام'' ان چیزوں پر ایمان لانے کیلئے کسی پر جبر و اکراہ، زور و زبردستی نہیں کرتا، بلکہ دعوت کے طریقے اور عملی اسالیب سے دلائل قائم کر کے حجتوں کی روشنی میں اور شک و شبہات دور کرتے ہوئے یہ کام انجام دیتا ہے، تاکہ جس شخص کا اسلام لانے کا ارادہ ہو، اس کے سامنے حق ظاہر ہو جائے۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۵۶)

ترجمہ: ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔ اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اللہ

خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ۔''(14)

اسلام انسانیت کی بنیاد پر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرنے سے منع نہیں کرتا بشرطیکہ وہ معاملات عدل وانصاف ، ہمدردی، تعاون علی الخیر اور دفع شر، دفع ظلم اور نیکی اور صلہ رحمی کی بنیاد پر ہوں بلکہ اسلام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ حقوق انسانی جس میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ان حقوق کے احترام کی بنیاد پر غیر مسلموں کے ساتھ زندگی گزاریں لہٰذا اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ غیر حالت جنگ میں غیر مسلموں کو ایذاء و تکلیف دیں چاہے وہ تکلیف بدنی ہو یا ذہنی ہو، فقہائے کرام نے یہاں تک فرمایا ہے کہ:

''اگر کوئی مسلمان کسی یہودی یا مجوسی کو'' کافر'' کہے اور اس سے اس کو تکلیف ہو تو وہ مسلمان گنہگار ہوگا۔''(15)

مسلم ممالک کے غیر مسلم باشندوں کے احکام:

وہ غیر مسلم ذمی جو اسلامی ملکوں میں معاہدہ اور امان کے ساتھ رہتے ہیں، ''اسلام'' ان کے انسانی اور شہری حقوق کا اعتراف کرتا ہے اور ان حقوق کے بارے میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا، سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ کرنے میں خلل انداز ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص ایسے معاہد نفس کو قتل کردے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول کا ذمہ ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا، ایسا شخص جنت کی خوشبو نہیں پائے گا جبکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پائی جائے گی۔''(16)

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا، آپ نے فرمایا:

''خبردار! جو شخص کسی معاہد ذمی کے ساتھ ظلم کرے یا اس کے حق کو کم کرے اور اس کی طاقت سے زیادہ کا اس کو مکلف کرے یا اس کی کوئی چیز اس کی خوش دلی کے بغیر لے تو قیامت کے روز میں اس کی طرف سے دلیل میں غالب آنے والا بنوں گا۔''(17)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین غیر مسلم اہل ذمہ کے حقوق کی حفاظت کا بہت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے وفد سے فرمایا:

''شاید مسلمان ذمیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں''

جواب میں انہوں نے کہا: ''ہمیں تو صرف حقوق کی ادائیگی کا علم ہے۔''(18)

فقہائے مسلمین بھی ہمیشہ حکام کو اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ اہل ذمہ کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اور ان کے حالات کی نگرانی کریں۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بادشاہ ہارون رشید کو غیر مسلم ذمیوں کے بارے یہ وصیت کی:

''اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے، آپ کیلئے مناسب یہ ہے کہ وہ اہل ذمہ جو آپ کے نبی اور آپ کے چچا کے بیٹے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ میں ہیں، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، اور ان کا خیال کرنا، تاکہ ان پر ظلم نہ ہوجائے، اور ان کو ایذاء مت دینا، اور ان کو کسی ایسے کام کرنے کا مکلف مت بنانا جس کی ان کے اندر طاقت نہ ہو۔''(19)

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں شام پر صالح بن علی کی حکومت تھی، جو عباسی حکومت کے ایک حکمران تھے ، انہوں نے جبل لبنان کے تمام ذمیوں سے لڑائی کی، اور ان کو جلاوطن کردیا۔ کیونکہ جبل لبنان کے بعض ذمی امیر المؤمنین

کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور انہوں نے نیا طریقہ اختیار کرلیا تھا اس وقت حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل خط لکھا جس میں ان کو اس عمل پر ملامت کی۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بوڑھے یہودی کے پاس سے گزرے جو لوگوں سے سوال کر رہا تھا، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آئے اور اپنے ذاتی مال میں سے اس کو کچھ دیا، اور پھر اس کو بیت المال کے خازن کے پاس بھیجا، اور اس سے کہا کہ اس کو دیکھو، اور جزیہ دینے والوں کو دیکھو اللہ کی قسم! اگر ہم نے ان کی جوانی کے زمانے میں ان کا جزیہ کھایا، اور پھر بڑھاپے میں ہم ان کو ذلیل کردیں تو یہ ہم نے انصاف نہیں کیا۔ اور یہ صدقات تو فقراء اور مساکین کیلئے ہیں، فقراء تو مسلمان ہیں، اور یہ ذمی اہل کتاب میں سے ہیں، مساکین میں داخل ہیں، پھر آپ نے اس سے جزیہ اور ٹیکس ختم کردیے۔(20)

دارالاسلام، دارالکفر، دارالامن، اور دارالحرب کی حقیقت:

بندہ کی زندگی مغربی ممالک میں گذری اور بہت سے مسائل کے بارے میں شدت سے یہ احساس ہوا کہ ان کے بارے میں مسلمان اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کبھی ایسی حرکات کر بیٹھتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر معاشرے کے سامنے آتی ہے جس کے نتیجہ میں عام غیر مسلم جو اسلام کے عالی اوصاف کی وجہ سے اسلام کی طرف طبعی میلان رکھتے ہیں یا مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں سے دور ہوجاتے ہیں اسی طرح وہ مسلمان جو عملی زندگی میں کمزور ہیں وہ بھی دین اسلام کے بارے میں طرح طرح کے اشکالات کا شکار ہوجاتے ہیں ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ان میں سے کچھ مسائل کے بارے میں صحیح اسلامی تعلیمات قارئین کے سامنے آجائیں انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی نقطہ نظر سے مسلمان تین قسم کے ممالک میں رہ رہا ہوتا ہے جو کہ بالترتیب (۱) دارالاسلام (۲) دارالحرب، (۳) دارالکفر ہوسکتے ہیں۔ اور ان اصطلاحات کے بارے میں یورپی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ایک قسم کا اضطراب پایا جاتا ہے اور بعض مسلمانوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مسلم اقلیت والے ممالک، خاص طور پر جہاں کے حکمران غیر مسلم ہوں، ان ممالک کی حیثیت مسلمانوں کے لیے دارالحرب کی ہے۔ جبکہ دارالحرب سے مراد ایسا ملک ہوتا ہے جہاں غیر مسلم حکومت کی سرپرستی میں مسلمان کی جان، مال اور عزت محفوظ نہ ہو۔ لہٰذا مسلمانوں کو ان کے ساتھ خود کو حالت جنگ میں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ''دارالاسلام'' دارالکفر اور ''دارالحرب'' کی تعریفات مستند علما کرام کی تحریروں کی روشنی میں نقل کردی جائیں تاکہ اس بارے میں صحیح اسلامی تصور واضح ہوجائے۔

دارالاسلام:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دارالاسلام کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جو مسلمانوں کے قبضے میں ہو اور اس پر ان کا مکمل تسلط اس طرح قائم ہو کہ وہاں انہی کے احکام جاری اور نافذ ہوتے ہوں۔'' چنانچہ علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ ''دارالاسلام'' کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

''دارالاسلام اس جگہ کا نام ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہو۔''(21)

اور جامع الرموز میں ''الکافی'' کے حوالہ سے اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''دارالاسلام وہ ہے جس میں مسلمانوں کے امام (سربراہ) کا حکم چلتا ہو اور مسلمان اس میں امن سے رہتے ہوں۔''

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مزید فرماتے ہیں:

''اگرچہ مسلمانوں کے تسلط میں ہونے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک میں تمام احکام اسلامی شریعت کے مطابق جاری ہوں، لیکن اگر مسلمان حکمرانوں کی غفلت سے اس میں شریعت کا مکمل نفاذ نہ ہو، تب بھی اگر اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، تو اسے دارالاسلام ہی کہا جائے گا۔ جامع الرموز کی مذکورہ بالا عبارت میں جو کہا گیا ہے کہ اس ملک میں ''مسلمانوں کے امام کا حکم چلتا ہو''۔ اس سے بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہاں حکم سے مراد تمام احکام شریعت ہیں۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کے زیر تسلط کسی ملک میں شریعت کے تمام احکام نافذ نہ ہوں تو اسے دارالاسلام نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، درحقیقت کسی ملک کے دارالاسلام قرار پانے کیلئے اصل بات یہ ہے کہ اس پر مکمل اقتدار مسلمانوں کو حاصل ہو، اور انہیں اپنے احکام جاری کرنے کی مکمل قدرت حاصل ہو۔ پھر اگر وہ اپنی غفلت یا کوتاہی سے اسلام کے تمام احکام جاری نہ کریں تو یہ ان کے لیے شدید گناہ ہے، اور ان پر واجب ہے کہ تمام احکامِ شریعت کو نافذ کریں، لیکن ان کی اس مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ملک دارالاسلام کی تعریف سے خارج نہیں ہوتا۔''(22)

دارالکفر اور دارالامن:

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اکثر و بیشتر فقہاء کرام ''دارالکفر'' کو ''دارالحرب'' کے نام سے ذکر کرتے ہیں جس سے بعض اوقات یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ جس ملک پر بھی غیر مسلموں کا تسلط ہو، اور اس پر انہی کے احکام چلتے ہوں، وہ ''دارالاسلام'' سے ہر وقت جنگ کی حالت میں ہوتے ہیں کیونکہ ''حرب'' کے معنی ہی جنگ کے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کرام بکثرت ''دارالحرب'' کا لفظ ''دارالکفر'' کے معنی میں استعمال فرماتے ہیں، اور اس ملک پر بھی اس کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو دارالاسلام کے ساتھ حالت جنگ میں نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو، یا مسلمان وہاں امن وامان کے ساتھ رہتے ہوں، ورنہ درحقیقت ''دارالکفر'' کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ''دارالکفر'' جس کے ساتھ کوئی صلح کا معاہدہ نہ ہو اور نہ وہاں مسلمانوں کو امن کے ساتھ اپنے دینی شعائر قائم کرنے کی اجازت ہو۔ ایسا ''دارالکفر'' ہی ٹھیٹھ لفظی معنی میں ''دارالحرب'' ہوتا ہے، وہاں جو مسلمان رہتے ہوں، ان کے ذمہ واجب ہے کہ وہ وہاں سے کسی ایسی جگہ ہجرت کر جائیں جو یا تو ''دارالاسلام ہو''، یا ایسا ملک ہو جہاں وہ کم از کم اپنے دینی احکام پر امن کے ساتھ عمل کر سکیں۔

اور ''دارالکفر'' کی دوسری قسم وہ ہے جہاں اگرچہ حکومت تو غیر مسلموں کی ہے، لیکن وہاں مسلمان اپنے دینی شعائر قائم رکھنے میں آزاد ہوں، اور حکومت کی طرف سے ان پر اپنے دینی احکام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ایسی جگہ کو ''دارالامن'' کہا جاتا ہے۔ دارالامن میں بہت سے احکام دارالاسلام کی طرح ہوتے ہیں۔ یورپ، امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا وغیرہ میں بسنے والے مسلمان دارالحرب میں نہیں بلکہ دارالامن میں رہ رہے ہیں جہاں ان کو مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اُن کے جان، مال وعزت محفوظ ہیں۔ ابتداء اسلام میں اس کی مثال حبشہ تھا، مکہ مکرمہ میں چونکہ دین پر عمل کرنے والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جارہی تھیں، اس لئے بہت سے صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پر مکہ مکرمہ سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے، حالانکہ اس وقت حبشہ پر بھی غیر مسلموں کی حکومت تھی، اور اس لحاظ سے وہ

''دارالکفر'' تھا، لیکن چونکہ مسلمانوں کو وہاں اپنے دین پر عمل کرنے کی اجازت تھی، اس لئے وہ ساتھ ساتھ ''دارالامن'' بھی تھا، چنانچہ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''اسلام میں ہجرت دو طرح ہوئی ہے، ایک تو دارالخوف سے دارالامان کی طرف منتقل ہوکر، جیسے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے ابتدائے اسلام میں حبشہ کی طرف ہجرت کی، تاکہ مکہ کے مشرکوں کے شر وفساد سے امن میں آجائیں، یا جیسے بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت فرمانے اور اسلام کے احکام کے استقرار سے پہلے مکہ سے مدینہ گئے، اور ہجرت کی دوسری قسم دارکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونا ہے، اور اس قسم کی ہجرت اس وقت ہوئی جب مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اقتدار قائم ہوگیا۔''(23)

دارالحرب:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ''دارالحرب'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کسی ملک کو ''دارالحرب'' یا ''دارالکفر'' قرار دینے کیلئے بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اس پر اقتدار غیر مسلموں کا ہو، اور وہاں انہی کا حکم چلتا ہو، چنانچہ جامع الرموز میں ''الکافی'' کے حوالہ سے ''دارالحرب'' کی تعریف یہ کی گئی ہے:

''دارالحرب وہ ملک ہے جس میں کافروں کے سردار کا حکم چلتا ہو۔''

یہاں تک کہ اگر غیر مسلم حکمرانوں کا اقتدار مکمل ہو، اور اسی اقتدار کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو اپنے شعائر یا اپنی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت دیدی ہو، تب بھی وہ دارالکفر ہی رہے گا، محض اس اجازت کی وجہ سے دارالاسلام نہیں بن جائے گا، کیونکہ مکمل اقتدار انہی غیر مسلموں کو حاصل ہے اور وہ جب چاہیں اس اجازت کو واپس لے سکتے ہیں۔

گویا کہ ہماری نظر میں دارالحرب سے مراد ایسی غیر مسلم ریاست ہے جہاں مکمل طور پر حکومتی سرپرستی میں مسلمانوں کی جان، مال اور عزت غیر محفوظ ہو۔ لہٰذا ایسی غیر محفوظ صورتِ حال کی وجہ سے ایسی ریاست میں رہنے والا مسلمان خود کو حالت جنگ میں سمجھے گا۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ''دارالاسلام'' ''دارالکفر'' اور ''دارالحرب'' کی تعریفات مستند علما کرام کی تحریروں کی روشنی میں نقل کردی جائیں تاکہ اس بارے میں صحیح اسلامی تصور واضح ہوجائے۔

چودھواں باب:

موجودہ عالمی انتشار پر اسلامی نقطہ نظر

گزشتہ صفحات میں عالمی افراتفری، امت کی کسمپرسی اور اقوام عالم کے دوہرے معیار کی حوالہ جات کی مدد سے نشاندہی کی گئی ہے۔اس کتاب کے لکھنے کے پورے سفر کے دوران بس ایک چیز انتہائی وضاحت کے ساتھ سامنے آئی ہے کہ اس عالمی انتشار، اقوام عالم کے انسانیت سوز رویوں اور امت مسلمہ پر ظلم وستم کی نشاندہی آقائے دوجہاں e نے اپنے ارشادات میں چودہ سو سال پہلے مفصل بیان فرمادی تھی۔

مثال کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دین پر چلنا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔کمینے لوگ عزت دار کہلائیں گے، امانت دار بہت کم ہوں گے۔لیڈر منافقین، رذیل اور فاسق ہوں گے۔نااہل لوگوں کے پاس عہدے ہوں گے۔جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا کہا جائے گا۔قطع رحمی عام ہوگی۔

ایسے حالات کس وقت اور کیوں پیدا ہوں گے۔اور مسلمان کس طرح پستی اور زوال کی طرف تیزی سے گامزن ہوں گے اور کیونکر اغیار کے گھیرے میں ہوں گے؟ اس کے بھی اسباب بیان فرمادیئے، یہ تمام حالات قیامت سے پہلے دنیا میں ظہور پذیر ہوں گے۔پھر قیامت سے پہلے کچھ بڑے بڑے واقعات ہونے ہیں یعنی امام مہدی علیہم الرضوان کا ظہور کب اور کہاں ہوگا؟ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کہاں اور کیسے ہوگا؟ یاجوج ماجوج کی قوم کا نکلنا، یہودیوں کا ایک جگہ (اسرائیل میں) اکٹھا ہونا، دجال کا نکلنا اور پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا دجال کو ختم کرنا اور پھر پوری دنیا میں امن قائم ہونا۔گویا یہ بڑی بڑی علامات قیامت کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسانیت پر بالکل واضح کردیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختلف احادیث کے مطابق اُس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک مندرجہ ذیل علامات پوری نہ ہوجائیں۔

۱) دخان (دھواں) قرآن کی سورت دخان میں اس کا ذکر ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب یہ دھواں نکلے گا تو مومن کو تو صرف زکام سا محسوس ہوگا لیکن منکرین خدا اور منافقین کے کانوں میں گھس جائے گا جس سے ان کے سر ایسے ہوجائیں گے جیسے انہیں آگ پر بھون دیا گیا ہو۔

۲) امام مہدی علیہم الرضوان کا ظہور۔

(۳) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول۔

(۴) دجال کا نکلنا۔

(۵) دابۃ، یعنی دابۃ الارض جو ایک نہایت ہی عجیب وغریب جانور ہوگا، یہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔

(۶) آفتاب کا (مشرق کی بجائے) مغرب سے طلوع ہونا۔

(۷) یاجوج ماجوج کا نکلنا۔یاجوج ماجوج کی دیوار ٹوٹ جائے گی۔وہ جہاں سے گزریں گے وہاں کا پانی پی کر ختم کردیں گے۔

(۸) زمین میں دھنس جانے کے تین واقعات۔ایک مشرق، ایک مغرب اور ایک جزیرۃ العرب میں۔
(۹) یمن سے ایک آگ کا نکلنا، جس سے مومنین بھاگ کر شام میں پناہ لیں گے۔

سیدنا امام مہدی علیہم الرضوان کا ظہور:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میرے اہل بیت سے ایک شخص خلیفہ ہوگا جس کا نام میرے نام کے موافق ہوگا۔'' ایک دوسری روایت میں عبداللہ بن مسعودؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''دنیا اُس وقت تک ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص عرب کا بادشاہ ہوجائے گا جس کا نام میرے نام کے مطابق (یعنی محمد) ہوگا۔حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اگر زمانہ (یعنی قیامت میں) سے ایک ہی دن باقی رہ جائے گا (جب بھی) اللہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص (امام مہدی) کو بھیجے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے معمور کردے گا جس طرح وہ (اس سے قبل) ظلم سے بھری ہوگی۔

ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ مہدی میری نسل اور فاطمہؓ کی اولاد سے ہوگا۔حضرت ام سلمہ سے ہی ایک اور روایت ہے کہ ایک خلیفہ کی وفات کے وقت (نئے خلیفہ کے انتخاب کے وقت مدینہ میں) مسلمانوں کے اندر اختلاف ہوگا۔ایک شخص (یعنی امام مہدی اس خیال سے کہ کہیں اُن کو خلیفہ نہ بنادیا جائے) مدینہ سے مکہ چلے جائیں گے۔مکہ کے کچھ لوگ (جو انہیں بحیثیت مہدی کے پہچان لیں گے) ان کے پاس آئیں گے اور انہیں مکان سے باہر نکال کر حجرِ اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان اُن سے (خلافت کی) بیعت کریں گے۔.....امام مہدی بحالتِ خلافت 7 سے 9 سال تک زندہ رہیں گے۔اور مسلمان اُن کی نمازِ جنازہ ادا کریں گے۔

ابواسحٰق البیہقیؒ روایت کرتے ہیں کہ سیدنا علیؓ نے اپنے برخوردار سیدنا حسنؓ کو دیکھتے ہوئے کہا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اِسے سید کے لقب سے نامزد کیا۔اِس کی اولاد سے ایک شخص پیدا ہوگا اُس کا نام وہی ہوگا جو تمہارے نبی کا اسمِ گرامی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اُن کا نام میرے نام پر اور اُن کے والد کا نام میرے والدِ گرامی کے نام پر (یعنی محمد بن عبداللہ) ہوگا۔گویا کہ کوئی بھی ایسا مدعی جو سید النسل یعنی اہل بیت میں سے نہ ہوگا اُس کا دعویٰ باطل ہوگا، جس طرح احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ بالکل غلط ہے کہ مرزا صاحب نہ تو مدینہ، مکہ یا شام گئے اور نہ ہی وہ سید یعنی اہل بیت میں سے تھے بلکہ وہ یعنی مرزا صاحب مغلوں کی سب کاسٹ ''مغل برلاس'' میں سے تھے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول:

قرآن وحدیث کی روشنی میں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب نہیں کیا گیا تھا۔بلکہ اللہ نے اپنی قدرت سے اُن کو چوتھے آسمان تک اُٹھالیا تھا۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا (۱۵۷) بَلْ رَفَعَهُ اللهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۵۸)

اوران کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا۔ اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں۔ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انہوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا۔

بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ بڑی زبردست حکمت والے ہیں۔(1)

كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَاءِ فِيكُمْ وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

اے میری اُمت! (فرحت و مسرت اور حیرت کے سبب) کیا عجیب حال ہوگا تمہارا؟ جب (حضرت مسیح عیسیٰ) ابن مریم (علیہما السلام) آسمان سے اُتریں گے، تمہارے اندر اور تم میں سے امام و پیشوا ہوں گے۔(2)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے دنیا پر نزول قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

دجال کے فتنے کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ عیسیٰ u کا نزول دمشق کے مشرقی جانب سفید مینارے کے پاس فرمائیں گے۔ ہلکے زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ہوں گے۔ اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے کندھوں پر رکھے ہوں گے۔ آپ کے سر سے سفید اور چمکدار پانی کے قطرے گریں گے۔ اس زمانہ میں مسلمان کم ہی ہوں گے اور وہ بیت المقدس میں ہو سکتے ہیں۔ دجال کو مغرب میں مسیح مخالف یعنی (Anti Christ) کہا جاتا ہے اور یہ لوگ بھی عیسیٰؑ اور دجال کے آنے اور ان کے درمیان معرکے پر یقین رکھتے ہیں۔ امام مہدی علیہ السلام فجر کی نماز کے مصلیٰ پر ہوں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ امام مہدی پیچھے ہٹ کر عیسیٰ علیہ السلام کو امامت کا کہیں گے لیکن وہ کہیں گے کہ اقامت آپ کے پیچھے پڑھی جا چکی ہے لہٰذا آپ امامت کروائیں۔ لہٰذا امام مہدی ہی نماز پڑھائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد امام مہدی علیہ السلام اور ان کے رفقا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنانے کا اعلان کریں گے۔ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے بعد زندگی بہت خوشگوار ہو جائے گی۔ نکاح کے بعد وہ 19 سال زندہ رہیں گے اور اُن کی اولاد ہوگی۔ روضہ اقدس پر پہنچ کر سلام کریں گے تو جواب ملے گا۔ پھر اُن کی طبعی موت ہوگی، اور مسلمان نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔ حضور e کے ساتھ روضہ اقدس میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما آرام فرما رہے ہیں۔ چوتھی قبر کی جگہ ابھی موجود ہے۔ جہاں سیدنا عیسیٰ u دفن ہوں گے۔

دجال کا نکلنا۔ اللہ کی طرف سے سخت امتحان:

امام مہدی علیہم الرضوان کے ظہور اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد اللہ تعالیٰ امت کو ایک سخت ترین امتحان میں ڈالنے کے لیے دجال کو نکالیں گے۔ دجال جو کہ سخت پیچیدہ بالوں والا نوجوان ہوگا۔ ایک آنکھ سے بدنور ہوگا۔ شام اور عراق کے درمیان ایک راستہ پر نمودار ہوگا۔ انتہائی طاقتور ہوگا اور تیز رفتار ہوگا۔ ایک قوم کو دعوت دے گا کہ وہ اسے خدا تسلیم کرے۔ وہ مان لیں گے۔ بادل اُس کے حکم پر برسیں گے۔ زمین اس کے حکم پر فصلیں اگائے گی۔ اس قوم کے مویشی انتہائی صحت منداور دودھ دینے والے ہوں گے۔ گویا امت ایک سخت امتحان سے گزرے گی۔

دجال پھر ایک دوسری قوم کے پاس جائے گا۔ اپنی خدائی کا دعویٰ کرے گا تو یہ قوم اسے رد کر دے گی۔ ظاہری طور پر یہ قوم ابتلاء کا شکار ہوگی اور قحط زدہ ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اس امتحان میں سرخرو کریں گے۔

دجال ایک ویرانے سے گزرے گا تو ویرانہ خزانے اُگل دے گا۔ وہ ایک نوجوان کو قتل کرے گا پھر اُسے زندہ کرے گا۔ دجال چالیس دن زندہ رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا۔ دوسرا دن ایک مہینے کے برابر، تیسرا دن

ایک ہفتے کے برابر، باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ مکہ اور مدینہ کے علاوہ کوئی خطہ باقی نہیں رہے گا جو اُس سے بچا ہو۔ اُس وقت مدینہ کے سات بڑے دروازے ہوں گے۔ وہ جہاں سے بھی داخل ہونے کی کوشش کرے گا، فرشتے ننگی تلواریں لے کر اس کے سامنے آجائیں گے، پھر وہ مدینہ سے باہر ہی پڑاؤ ڈالے گا۔ پھر خون ریزی ہوگی اور مدینہ کی سرزمین سے منافقین کو باہر پھینک کر پاک کر دیا جائے گا۔

نماز فجر سے فارغ ہو کر عیسیٰ علیہ السلام دروازہ کھلوائیں گے تو اس کے پیچھے دجال اپنی ستر ہزار فوج کے ساتھ موجود ہوگا اور ان کے سامنے ایسے پگھلنے لگے گا جیسے پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔ چنانچہ اُسے موجودہ اسرائیل لُد (Lud)، (جو کہ تل ابیب (Tel Aviv) کے ساتھ ہے) کے مشرقی دروازے پر اپنے بھالے (Spear) سے اس کو جہنم رسید کریں گے۔

یاجوج ماجوج کا نکلنا:

دجال کے فتنے اور عیسیٰ u کے نزول کے بعد اللہ اپنی قدرت سے یاجوج ماجوج کی قوم کو نکالیں گے۔ لوگ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے کہ یاجوج ماجوج کی دیوار (جو کہ ذوالقرنین نے تعمیر کی تھی) توڑ دی جائے گی اور وہ زمین پر فساد برپا کریں گے۔ اُن سے کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا۔ یہ قوم اُردن کے ایک دریا بحیرہ طبریہ جو کہ بیت المقدس سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے، سے گزرے گی اور پانی کے نام ونشان کو مٹا دے گی۔ اللہ کے حکم پر عیسیٰ u مومنین کو لے کر کوہ طور پر چڑھ جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ کی بددعا سے یاجوج ماجوج ختم ہو جائیں گے۔ ان کی لاشوں کو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے بڑے بڑے پرندے اٹھا کر لے جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ زبردست بارش کر کے زمین کو دھو دیں گے۔ زمین تمام خزانے اگل دے گی۔ خوب برکتیں ہوں گی۔

استنبول (ترکی) پر یورپی قوتوں کا قبضہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت سے پہلے ایک واقعہ ضرور ہوگا کہ اہل روم (یعنی یورپی ممالک) اعماق، یا دالق کے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ یہ مقامات شام کے شہر حلب کے نزدیک واقع ہیں۔ مدینہ عربی میں شہر کو کہتے ہیں اور اس سے مراد حلب ہے۔ یہ یاد رہے کہ احادیث میں شام سے مراد آج کا شام نہیں جس کا دارالحکومت دمشق ہے بلکہ پرانا شام جو کہ لمبائی میں دریائے فرات، عراق سے لے کر العریش تک (جہاں سے مصر شروع ہوتا ہے) اور چوڑائی میں جزیرۃ العرب سے بحیرہ روم تک پھیلا ہوا تھا۔ گویا آج کے کئی ممالک استنبول، اردن، فلسطین (بمعہ اسرائیل)، لبنان، شام، طرابلس، انطاکیہ وغیرہ سب اس کے حصے تھے۔

رومیوں کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کا ایک لشکر مدینہ سے پیش قدمی کرے گا۔ ان کی جنگ ہوگی۔ ایک تہائی مسلمان بھاگ جائیں گے، ایک تہائی شہید ہو جائیں گے اور ایک تہائی لڑ کر جنگ جیت جائیں گے۔ پھر یہ آئندہ ہر فتنے سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد جلد ہی یہ لوگ قسطنطنیہ یعنی ترکی کے دارالخلافہ استنبول کو فتح کریں گے۔((3

یہاں موجودہ حالات کے تناظر میں دیکھیں تو دو چیزیں سامنے نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ شام بالخصوص حلب میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ دوسرے پوری دنیا سے یہودی اسرائیل میں اکٹھے ہو چکے ہیں۔ اس سارے واقعہ میں حیران کن بات یہ ہے کہ ترکی ایک ابھرتی ہوئی سیاسی اور اقتصادی قوت ہونے کے باوجود پھر یورپی لوگوں کے تسلط میں آجائے گا اور پھر اس کے بعد مسلمان جنگ کر کے ترکی کو واپس لیں گے۔ پھر اس کے بعد دجال آئے گا۔

پندرہواں باب:

قیامِ امن کے لئے آسان حل.....مخلوق کے لئے خالق کا نظام

اُمتِ مسلمہ کی دگرگوں صورتِ حال چاہے فلسطین و کشمیر کی ہو، عراق و شام کی ہو، افغانستان و چیچنیا کی ہو، لیبیا و یمن کی ہو، یا برما میں روہنگیا مسلمانوں کی ہر طرف مسلمان ہی چکی میں پس رہے ہیں اور عجیب بہانوں سے مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے اور مسلمان ممالک کے وسائل پر قبضہ کر کے ان کا بے دریغ استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن اِس سارے معاملے میں ایک دوسری حقیقت بھی ہے جسے مسلمان نظر انداز کرتے آرہے ہیں کہ اپنی غلطی کا احساس اور خود احتسابی سے صرفِ نظر کرنا اور دل کو بہلانے کے لئے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانا۔ ہمیں غور کرنا ہوگا کہ عراق اور ایران کی لڑائی، عراق کا کویت پر قبضہ، افغانستان کی تباہی اور پھر عراق اور لیبیا اور یمن کی بربادی اور روہنگیا مسلمانوں کا قتلِ عام اور پھر اُن کا اپنے آبائی وطن سے زبردستی انخلا جیسے مسائل کے حل کے لیے بحیثیت ایک قوم کے ہم نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ شواہد یہی بتاتے ہیں کہ ہم نے اس معاملے میں نہ صرف ملی بے حمیتی کا ثبوت دیا بلکہ ہم تو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بن کر آگے آگے چل رہے تھے۔ بالخصوص پاکستان، سعودی عرب اور ترکی کو اپنے کردار کے متعلق نئے زاویئے سے دیکھنا ہوگا اور آئندہ کے لئے ایک مثبت لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ کیا ہم نے علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار میں پنہاں افکار کو سامنے رکھا؟

منفعت ایک ہے اِس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک

ابھی افغان، پاک صورتِ حال کو دیکھ لیجیے کہ پاکستان نے 70,000 جانیں قربان کیں 60 بلین ڈالر کا نقصان کیا۔ کس کے لئے؟ امریکہ کی نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کو چلانے کے لئے افغانستان کے خلاف نہ صرف زمینی اور ہوائی راستے دیئے بلکہ ہوائی اڈے بھی فراہم کیے۔ اور اب صدر ٹرمپ کے حالیہ بیان نے ہمارے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہے کہ ہم دہشت گردی کو ہوا دے رہے ہیں۔ گویا ہمارے ساتھ معاملہ کچھ ایسے ہے کہ:

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

اگرچہ مسلمان ممالک کی مختلف تنظیمیں جیسا کہ اسلامی تعاون کی تنظیم (Organisation of Islimic Cooperation - OIC) عرب وزرائے خارجہ کانفرنس رابطہ العالمی الاسلامی اور 41 ممالک کے فوجی اتحاد وغیرہ موجود ہیں، مگر مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی ہیں۔

جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی مسائل کے حل کے لیے تمام ممالک نے مل کر اقوامِ متحدہ جیسا ایک اہم ادارہ بنایا تاکہ مسائل جنگ کی بجائے ڈائیلاگ سے حل کیے جائیں لیکن اب یہ تاثر کافی طاقت پکڑتا جارہا ہے کہ اقوامِ متحدہ میں بھی طاقتور ممالک اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرواتے ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اب یورپین یونین یا نیٹو اپنی مرضی کے فیصلے کر کے اقوامِ متحدہ کو ربڑ سٹیمپ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ کئی مواقع پر اقوامِ متحدہ کو ویسے ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس سے یہ ادارہ اپنی اہمیت کھو چکا ہے اسرائیل اور ہندوستان کی طرف سے فلسطین اور کشمیر سے متعلق اقوام

متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی کر کے جس طرح متواتر مذاق اُڑایا جاتا ہے اگر ان کی طرح کوئی مسلم ملک ایسے کرتا تو اس کی لیبیا، عراق، شام اور افغانستان کی طرح اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی۔

گردش دوراں کا اندازہ لگائیے کہ 2017ء کے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں صدر ٹرمپ نے اقوامِ متحدہ کی صحیح کلاس لی کہ امریکہ اقوامِ متحدہ کو سب سے زیادہ مالی امداد فراہم کرتا ہے یعنی اقوامِ متحدہ کے رواں دوسالہ بجٹ 5.4 بلین امریکی ڈالر کا 22% یعنی 2.1 بلین امریکی ڈالر کا بوجھ امریکہ اُٹھاتا ہے اور امریکہ اب خوش نہیں کہ فیصلے اُن کی خواہشات کے عین مطابق نہیں ہوتے۔ لہٰذا انہوں نے اقوامِ متحدہ کو خبردار کیا کہ وہ اپنی امداد کو 40% تک کم کر دیں گے۔ اگر امریکہ کی نہ سنی گئی۔ امریکی صدر نے اپنے ایک بیان میں اقوامِ متحدہ کی امداد بند کرنے کا کہا کہ اگر وہ فلسطین کو تسلیم کریں گے یا اُس کی کوئی مدد کریں گے۔ کسی اسلامی ملک کی جرأت نہیں ہوئی کہ اسرائیل کی اس قدر حمایت کرنے پر امریکہ سے سوال ہی پوچھ لیں کہ بل کلنٹن نے تو خود دو ریاستی منصوبے پر فلسطین اور اسرائیل کو عمل کرنے کے لئے کہا تھا۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادیں موجود ہیں۔ لیکن فلسطینیوں کی زندگی اجیرن کر دی گئی ہے۔ اور مقبوضہ علاقوں میں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے خلاف یہودیوں کے لئے نئی بستیاں تعمیر کی جارہی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ افغانستان میں روسی خفت اور اُس کی شکست وریخت کے بعد اقوامِ عالم میں طاقت کا توازن بگڑ گیا اور امریکا ایک واحد سپر پاور کے طور پر سامنے آیا۔ جس سے امریکی ارباب اختیار و اقتدار میں طاقت ور ہونے کا ایک عجیب احساس پیدا ہوا اور دنیا بھر میں پھر سے ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' جیسا جنگل کا قانون لاگو ہو گیا۔ جس کا اندازہ مختلف امریکی صدور کے بیانات، حرکات وسکنات سے ہوتا ہے۔

روس سے سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسلحہ کے ڈیلروں کو کوئی ایک اور دشمن چاہیے تھا جس سے ٹکراؤ کی صورتِ حال پیدا کر کے اسلحہ کو بیچا جائے اور اس بار پھر اسلام کو بطور دشمن چنا گیا اور مسلمان ممالک کو اسلحہ کی منڈی اور ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنایا گیا اس کا برملا اظہار بھی کیا گیا۔ میڈیا نے ایسی منظر کشی کی کہ جیسے پوری دنیا میں اسلام سب سے بڑا خطرہ ہے اور اب اسلام ہی ایک ایسا دشمن ہے جو کہ مستقلاً مغرب کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ مغربی اقدار کو سب سے اعلیٰ قرار دیا گیا اور اسلامی اقدار کو مغربی اقدار کے منافی قرار دیا گیا۔ طالبان اور داعش کی طرز پر جعلی فلمیں تیار کر کے مسلمانوں کو ظالم اور درندوں کے طور پر پیش کیا گیا جس سے اسلاموفوبیا کو مغربی ممالک میں خوب پذیرائی ملی اور اسلامی سٹیٹ (داعش)

اسلامی جہاد، اسلامی دہشت گردی، اسلامی انتہا پسندی، اسلامی شدت پسندی جیسی اصطلاحات وضع کی گئیں اور جان بوجھ کر میڈیا کے ذریعے متعارف کروا کر مغرب کی عوام میں خوف وہراس پیدا کیا گیا۔ اس میں ایک چیز ہمیں سمجھنی اور قبول کرنی ہوگی کہ کچھ اپنے ناعاقبت اندیش لوگوں نے بھی اپنے قول وفعل سے اغیار کے لئے زمین ہموار کی۔ لیکن واللہ خیر الماکرین کے مصداق برطانیہ میں سکارٹ لینڈ کی علیحدگی کی تحریک زوروں پر ہے۔ پورا یورپ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی لپیٹ میں ہے۔ امریکہ میں آئے روز شہروں کے شہر طوفانوں اور سیلابوں کی زد میں ہیں، کروڑوں لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ سالانہ ہزاروں کے حساب سے جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کیونکہ حکومتی مشینری داخلی معاملات کی بجائے خارجی معاملات میں دلچسپی رکھتی ہے۔ صرف 2017ء میں ستمبر کے آخر تک تقریباً 7000 لوگ گن شوٹنگ سے مارے گئے اور تقریباً 15000 زخمی ہوئے۔ جبکہ 2016ء میں 15000 لوگ اور 2015ء میں 33635 امریکی، امریکہ کے

اندر گولیوں کے نشانہ بنے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قذافی، صدام اور اسد کے تمام ادوار میں مل کر بھی اتنے لوگ نہیں مارے گئے۔ دنیا کس طرف جارہی ہے کیا اپنے خالق کو بھول گئی ہے۔؟ صرف دنیا ہی ہے کیا؟ آخرت کی فکر نہیں کیا؟ امریکی اور یورپی تو ملتِ ابراہیمی سے ہیں۔ خدا کے ماننے والوں میں سے ہیں۔ آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں۔

چنانچہ ان مسائل کو اپنا موضوع بناتے وقت میرا احساس یہ ہے کہ وقت کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس مذہب کو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جارہا ہے دراصل وہی ساری دنیا میں امن کا ضامن ہے۔ اسلام ہی اس وقت وہ دین ہے کہ جو اقوامِ عالم کو امن کی دولت سے مالا مال کرسکتا ہے۔ اسلام ساری انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ اس رحمت سے سارے عالم کو فیضیاب ہونا چاہیے۔ کیا اِس وقت اُمت کو ''دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا'' کرنے کے لئے اپنی خود احتسابی کی ضرورت نہیں؟ اور پھر کونسی ایسی حکمت عملی ہوگی کہ امت اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرسکے۔

اس کتاب میں جہاں ہم نے گزشتہ صدی کی پچھلی چند دہائیوں میں رونما ہونے والے اہم مسائل، وجوہات اور نتائج کی نشاندہی کی ایک کوشش کی ہے وہاں کچھ حل بھی بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ حل صرف اور صرف دنیاوی ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ مکالمہ، گٹھ جوڑ، طاقت کا حصول جیسے اقدامات شامل ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم ممالک کے وسائل پر بالواسطہ اور بلاواسطہ قبضہ کیا گیا لیکن اپنا مطمع نظر قطعاً یہ نہیں کہ ہم ایک معذرت خواہانہ رویہ اپنا کر اپنی ملی اور قومی حمیت کا سودا کرکے چپ ہوکر بیٹھ جائیں۔ بلکہ ہمیں دنیاوی ترقی کی طرف بھی پورے انہماک سے کام جاری رکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کے دور میں بھی جنگی اعتبار سے اُس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مادی ترقی کی گئی۔ یعنی تلوار، نیزہ، تیر اور ڈھال جیسے مروجہ ہتھیار بنائے گئے۔

یہ قرین انصاف نہیں کہ صرف امریکا یا مغرب پر تنقید کرکے کتاب کو مکمل کردیا جائے بلکہ جہاں انہیں اور مسلمانوں کو اصلاحِ احوال کی تجاویز دی گئی ہیں وہاں اس اہم ترین نقطہ کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق کو کیونکر ان صعوبتوں سے گزارے گا۔ مجھ سے کئی لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے صدر جنرل مشرف ایک ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ایک امریکی کال پر بالکل ڈھیر ہوگئے۔ اور امریکہ کو اپنے ایک اسلامی برادر ملک پر 9/11 کے بعد حملے کے لئے تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مملکت خداداد پاکستان کی شناخت اسلامی جمہوریہ ہے اور علامہ اقبال اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی اور مذہبی افکار پر ہم نے ''پاکستان کی نظریاتی اساس'' والے باب میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اور میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات جب ہماری ذاتی زندگی میں لاگو نہیں ہوں گی تو ہم اجتماعی بہتری کی توقع کیسے کرسکتے ہیں؟ اور ملک کو ایک فلاحی اسلامی اور جمہوری ریاست کیسے بنا سکتے ہیں؟ اور یہ کہ کیا ہم نبی آخرالزمان، سیدالانبیاء والمرسلین ﷺ کے متعلق علامہ اقبال کے اِس شعر کو بھول گئے:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

ہمارے خیال کے مطابق عالمی امن کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ علاقائی سوسائٹی میں جب کبھی فساد برپا ہوا ہے تو اُسے ختم کرکے امن کے قیام کے لئے انبیاء کرام مبعوث فرمائے گئے۔ اب پوری کائنات پر اور قیامت کی صبح تک آخری نبی مکرم حضور ﷺ کو خاتم النبیین وختم الرسل بنا کر مبعوث کیا گیا کہ جب پوری دنیا جہالت اور کفر وعصیان اور فسق وفساد میں ڈوبی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع آدم پر احسان فرمایا آپ کو ایک نسخہ کیمیا دے کر بھیجا

کہ اب قیامت تک کتاب اللہ اور اُسوہ رسول اللہ پر عمل کرو گے تو امن قائم ہوگا۔ اسی نکتے پر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے: ''مخلوق پر جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا، امن نہیں ہوگا۔'' خالق کے نظام کو سمجھنے کے لئے اہل علم و دانش کے علمی حلقوں میں بیٹھ کر صحیح علم حاصل کرنا ہوگا اور اس علم کا اطلاق اپنی ذات اور اہل خانہ پر کرنا ہوگا تبھی بات آگے چل سکتی ہے۔

فراعین وقت ہوں یا قیصر و کسریٰ جیسی ہولناک قوتیں اور اُن کا ظلم و ستم اُس کا خاتمہ خالق کائنات کے قانون کے ذریعے سے کیا گیا۔ جب مسلمانوں نے کسریٰ پر حملہ کیا تھا تو ان لوگوں نے یہ سوال کیا تھا کہ تمہیں کیا چیز یہاں لے کر آئی ہے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے تا کہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف نکالیں، اور لوگوں کو دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کی طرف نکالیں، اور مذاہب کے مظالم سے اسلام کے عدل کی طرف نکالیں۔ اب جب دنیاوی، مادی ترقی کے لحاظ سے ہم دوسری اقوام سے بہت پیچھے ہیں اور ہمارے نام نہاد سیاسی رہنما قومی غیرت و حمیت کا بھی سودا کر چکے ہیں تو کیسے ممکن ہوگا کہ بحیثیت مسلم امہ ہماری ساکھ بھی بحال ہو اور امن عامہ کا قیام بھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں تقویٰ کو اختیار کرتے ہوئے نفس کی اصلاح کر کے پستی سے نکلنا ہوگا۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی طرف گامزن ہونا ہوگا۔ جس کا احقر سب سے زیادہ محتاج ہے اور اس محتاجی کو دور کرنے کا ایک حل اہل اللہ کے ساتھ تعلق کو جوڑنا ہوگا کہ

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
گو نشیند در حضورِ اولیا
یک زمانہ صحبتِ با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

اور قرآن حکیم نے ہی ہمیں درس دیا ہے کہ ہدایت و نصرت و کامیابی صرف متقین کیلئے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاں مدمقابل کے خلاف بھرپور قوت تیار کرنے کا حکم دیا ہے وہاں یہ بھی حکم دیا ہے کہ ظاہری قوت کے ساتھ مسلمانوں کی باطنی قوت بھی ایسی ہو کہ جہاں اسباب میں کمی ہو وہاں ان کی روحانیت اور تعلق مع اللہ ان کے حق میں ہتھیار کا کام دے جیسے خلیفہ دوم اور مراد ختم الرسل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں منبر رسول ﷺ پر بیٹھے ہوئے حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی اے ساریہ پہاڑ کی طرف! اب مدینہ سے حضرت ساریہ سیکڑوں میل دور ایک جنگ کی کمان سنبھالے ہوئے تھے اور حضرت عمر نے ان کو پیچھے سے دشمن کے وار سے خبردار کیا، اور حضرت ساریہ نے اس پکار کو سنا اور مدینہ میں آ کر اس کا تذکرہ بھی کیا، گویا تقویٰ اور روحانیت دونوں اطراف میں اس درجہ کی تھی کہ بغیر کسی مروجہ ظاہری مواصلاتی نظام کے پیغام کی ترسیل اور وصولی کی گئی۔ تو گویا جب تک مسلمان تقویٰ اور روحانی تعلق کو اس نہج پر لے جانے کی کوشش نہیں کریں گے، کامیابی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگی، اور عین ممکن ہے کہ اُن کی ہر کاوش، ہر عمل اور عبادت سب کچھ تصنع کے زمرے میں آ کر منہ پر ماردی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہدایت قرآن مجید کی سورت مائدہ کی آیت نمبر ۱۰۵ میں ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ...(1)

اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر ہوگے تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اُس وقت وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے ہو۔

''کفار کی جو گمراہیاں پیچھے بیان ہوئی ہیں ان کی وجہ سے مسلمانوں کو صدمہ ہوتا تھا کہ اپنی ان گمراہیوں کے خلاف واضح دلائل آ جانے کے بعد اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے بار بار سمجھانے کے باوجود یہ لوگ اپنی گمراہیوں پر جمے ہوئے ہیں۔ اس آیت نے ان حضرات کو تسلی دی ہے کہ تبلیغ کا حق ادا کرنے کے بعد تمہیں ان کی گمراہیوں پر زیادہ صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اب زیادہ فکر خود اپنی اصلاح کی کرنی چاہیے۔''(2)

اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ تکریم وہ شخص ہے جس نے تقویٰ کی چادر اوڑھ رکھی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا متقیوں کے ساتھ ہو جانا:

تقویٰ کی عظیم الشان برکات میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت و تائید کے ذریعے اہلِ تقویٰ کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ اُن کی حفاظت فرماتے ہیں اور اُن کے معاملات سدھارنے میں ان کی اعانت فرماتے ہیں، اِس حقیقت پر دلالت کناں آیات میں سے دو درج ذیل ہیں۔

(۱).....وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (2)

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے۔

حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں درج کرتے ہیں کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے اور اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نصرت و تائید کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں متقی لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔(4)

(۲).....اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔(5)

یقیناً اللہ تعالیٰ متقی اور نیکی کرنے والے لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے: سو یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتے ہیں، ان کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلے میں ان کی نصرت، تائید اور مدد فرماتے ہیں۔(6)

اِس ناچیز کو اپنی کوتاہیوں کے احساس کے ساتھ ساتھ فکرِ اصلاح ہے اس لیے اپنی سمجھ کے لئے اس تحقیق میں پڑا ہوں۔ کچھ چیزیں قارئین کی بھی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اپنی اصلاح اور کماحقہٗ ایمان پر قائم رہنے کا مطلب ہے کہ قرآن سے رہنمائی لے کر تاویل کے راستے سے بچ کر تعمیل کے جذبے کو اختیار کر کے اپنی زندگی میں سنت، اطاعت، خشوع، خضوع اور اخلاص و تقویٰ کو معمول بنانے سے ہم من حیث الامت عالمی سطح پر اپنی ساکھ بحال کرا سکتے ہیں ورنہ ہماری تذلیل اسی طرح جاری رہے گی۔ ذیل میں تقویٰ کے بارے میں کچھ علمی مبحث پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

تقویٰ کیا ہے: باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں:

ترجمہ: ''تقویٰ گناہوں پر اصرار نہ کرنا اور عبادت سے دھوکہ نہ کھانا ہے۔'' جس کا مطلب ہے اپنے آپ کو گناہ کے

بار بار کرنے سے روکنا۔ اور جو اس میں کامیاب ہو گیا وہ متقی ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنی عبادت پر غرور نہ کرے۔(7)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہ ہے کہ آپ کو اپنا نفس کسی سے بہتر نظر نہ آئے۔

یعنی سارے بنی آدم کو اپنے سے اعلیٰ وارفع متصور کرے اور دل میں یہ کہے کہ میں تو گناہوں اور معاصی کا پتلا ہوں اس لئے میں کسی بھی آدمی سے افضل نہیں ہوسکتا ہوں، یہی تقویٰ ہے۔

علامہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے تقویٰ کے بارے میں استفسار کیا، تو انہوں نے کہا کہ: آپ کبھی خاردار راستے میں چلے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''ہاں!'' انہوں نے دریافت کیا: تو آپ نے کیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا: میں آستین چڑھالیتا ہوں اور محتاط ہوجاتا ہوں، انہوں نے فرمایا: سو یہی تقویٰ ہے۔(8)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے لے کر صحابہ کرام ؓ کے سو سالہ دورِ زریں صفات اور پھر تابعین تبع تابعین، اولیاء، اتقیاء سے لے کر اکابر علما شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید وغیرہم جیسی ہستیوں کے تقویٰ پر غور کریں وہ کتنے متقی لوگ تھے۔ ان حضرات کی زندگیوں میں اپنے اپنے دائرہ عمل میں امن قائم تھا۔ قومی اور ملی اعتبار سے جب تک ہم ایمان وتقویٰ میں قرونِ اول کے معیار کو نہیں اپنائیں گے۔ دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں مکی دور والے پیغمبرانہ طریقے کو اختیار نہیں کریں گے، تب تک ہمیں ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً۔ والی نوید مسرت نہیں سنائی دے گی۔

تقویٰ کی راہ میں رکاوٹ:

آج مسلم امہ کی حالتِ زار دیکھ کر مسلمانوں میں فطری طور پر یہ احساس شدت اختیار کر گیا ہے کہ کسی طرح امت مسلمہ کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے۔ ہر طرف مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کا رونا رویا جاتا ہے۔ اور اس پسماندگی کو دور کرنے کے لیے رول ماڈل کے طور پر مغرب کو پیش کیا جاتا ہے، اور زبان کی جولانیاں دکھا کر محفل گرم کرنے کے بعد نشست برخاست ہوجاتی ہے۔ یعنی عملی طور پر یہ سارے احساسات زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف تو ہماری ساری توانائیاں صرف دوسروں کی خامیاں دیکھ کر ان پر تنقید کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہم اسی تنقید کو ہی مسئلہ کا حل سمجھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ ایسی ناگفتہ بہ صورت حال کے حل کے لیے ہم نے گزشتہ سطور میں تقوی کی اہمیت وضرورت اور افادیت کو بیان کیا ہے، مندرجہ ذیل سطور میں ہم اس چیز کا جائزہ لیں گے کہ تقوی کے حصول کی راہ میں کون سی چیزیں رکاوٹ ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق متقی بننے کے راستے میں انسان کے لئے سب سے بڑی دو رکاوٹیں ہیں یعنی انسان کے دو بڑے دشمن بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) شیطان۔ (۲) نفس انسانی۔

انسان سے شیطان کی دشمنی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔۔۔ بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔)(9

دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ''بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے پس تم اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو۔(10)

نفس امّارہ، نفس لوّامہ، نفس مطمئنہ:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نفس انسانی انسان کا بہت بڑا دشمن ہے۔قرآن مجید میں نفس کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ (۱)نفس امّارہ (۲)نفس لوّامہ (۳) نفس مطمئنہ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنا معبود اپنی خواہشِ نفس کو بنالیا ہے اور اللہ تعالی نے اس کو علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔''(11)

اور حضرت ابو مالک اشعری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دو پہلو کے درمیان ہے۔(12)

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے آیت کریمہ ان النفس لامارۃ بالسوء کے تحت ان اقسام کی وضاحت کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اس میں ہر نفس انسانی کو امّارۃ بالسوء یعنی برے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے ایک سوال فرمایا: کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ، تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس سے زیادہ برا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔(13)

اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔''

مفتی اعظم مزید فرماتے ہیں کہ ''نفس انسانی برے ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورہ قیامہ میں اسی نفس انسانی کو لوّامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے، لا اقسم بیوم القیامۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ، اور سورہ والفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، یاایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربك۔اسی طرح نفس انسانی کو ایک جگہ امّارۃ بالسوء دوسری جگہ لوّامہ، تیسری جگہ مطمئنہ کہا گیا ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو امّارۃ بالسوء یعنی برے کاموں کا تقاضا کرنے والا ہے لیکن جب انسان خدا اور آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوّامہ بن جاتا ہے یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنے والا جیسے عام صلحائے امت کے نفوس ہیں اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچا دے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے صلحائے امت کو یہ حال مجاہدہ وریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا۔اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطائے خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے۔اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے۔''(14)

شیطان و نفس سے بچاؤ کی تدابیر:

اب نفس اور شیطان کے مکر و فریب سے بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟ قرآن وسنت میں اس کو جا بجا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہاں ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبۃ الوداع کا ایک اقتباس نقل کر رہے ہیں، جو ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ عاصم بن عدیؒ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مرض الوفات میں لوگوں کو جمع کرایا اور حمد وثناء کے بعد آخری خطبہ یہ دیا:

''اے لوگو! دنیا سے محتاط رہو اس پر اعتماد نہ کرو کیونکہ یہ بڑی دھوکہ باز ہے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اس کو محبوب رکھو۔ ان میں سے ایک سے محبت کی وجہ سے دوسری سے بغض پیدا ہوگا، اور اس امت کے آخری طبقہ کی اصلاح و درستگی اسی طرح ہوگی جس طرح پہلے طبقہ کی ہوئی تھی۔''(15)

حضرت ابوبکرؓ کے اس خطبہ کا ہر لفظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے آپؓ نے یہ جو ارشاد فرمایا کہ امت کے آخری طبقہ کی اصلاح اسی طرح ہوگی جس طرح پہلے طبقہ کی ہوئی تھی۔ یہی بات ہمارے اس باب کا موضوع ہے کہ امت مسلمہ کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟ قارئین اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو خیر القرون کے طرز زندگی کے مطابق ڈھال لیں، تو ہم بھی سیدھے راہ پر آجائیں گے۔ اور ہماری حالتِ زار درست ہوجائے گی۔ خیر القرون کے دور میں ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر زیادہ کرتا تھا آج ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں پر تبصروں اور تنقید پر تو زور لگایا جاتا ہے لیکن اپنی اصلاح کی رتی بھر پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر ہماری یہی حالت رہی تو ہم کبھی بھی فلاح حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا پڑے گا اور خود احتسابی کی عادت ڈالنی ہوگی ،قرآن مجید میں اسی خود احتسابی کی عادت پیدا کرنے کے لیے تقویٰ پر زور دیا گیا ہے، اور تقویٰ کا مطلب ہی یہی ہے کہ جلوت وخلوت میں ہر وقت یہ فکر دامن گیر ہو کہ ہم نے ایک دن اللہ تعالی کے سامنے پیش ہونا ہے، جب ہر شخص کو یہ فکر رہے گی تو ان شاء اللہ معاشرہ حقیقی اصلاح کی طرف گامزن ہوجائے گا لیکن یہ تقوی گھر بیٹھے حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے اہل تقوی کی صحبت اختیار کرنا ضروری ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ۔''(16)

یہ حل اگرچہ مسلمانوں کی حالتِ زار کو سامنے رکھ کر تجویز کیا گیا ہے لیکن اس کا اطلاق دوسرے مذاہب کے لوگوں پر بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص ملتِ ابراہیمی سے جڑے ہوئے مذاہب کے ساتھ تو اِس حل کا پرانا تعلق ہے۔ ملتِ ابراہیمی سے منسلک تینوں مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام) کی قیادت اور مذہبی سکالرز اگر اپنے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا کریں تو عام انسان اس کی افادیت کو سمجھ سکیں گے۔ اللہ کا ڈر، نفس کی اصلاح، اخلاق کا اعلیٰ معیار، انسانی جان کی قدر و قیمت، اپنے اوپر دوسرے انسانوں کے حقوق، ہمسائے کے حقوق، انسانی بہتری اور فلاح کا جذبہ تو تمام مذاہب کا خاصہ ہے۔ تو آیئے ہم کیوں نہ اِن اقدار کو کامن سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کو قریب لائیں۔ اور اسلحہ کے تاجروں اور موت کے سوداگروں کو مذہبی قوتوں کی طرف سے ایک واضح پیغام جائے کہ مذاہب امن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ امن کے پیامبر ہیں اور غیر مذہبی، لادین قوتوں کو مذہب کے نام پر قتل وغارت گری، بدامنی اور تباہی وبربادی کا ماحول قائم نہیں کرنے دیں گے۔ شاید مغرب میں مذہب اور سیاست کو پھر سے مل کر کام کرنا ہوگا تاکہ لادینی عناصر سے معاشرے کا تحفظ کیا جاسکے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حاصل کلام:

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میرے لبرل دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اب وہ یہ کہنا شروع کر دیں گے: ''لو جی! طٰہٰ قریشی تو اچھا خاصا آدمی تھا، اس کو کیا ہو گیا؟ یار یہ تو مولوی ہو گیا۔ لو جی! یہ بندہ بھی کام سے گیا۔'' بس ایک لمبا تبصرہ شروع ہو جائے گا۔

میری ان دوستوں سے گزارش ہے کہ یہ کتاب کسی ایک مسلک کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ مختلف مسالک اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اگر ایران، سعودی عرب یا پاکستان پر تنقید کی گئی ہے تو وہ صرف حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اصلاحِ احوال کے لئے ہے۔

میں نے مغرب میں اس صورتِ حال کو اعلیٰ سطح پر بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ میرے تجزیے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ تمام مذاہب اس افراتفری کے ماحول کو پیدا کرنے والے ''اسلحہ کے سوداگروں'' سے تنگ ہیں لیکن بے بس ہیں۔ لہٰذا انھیں مفاہمت اور افہام و تفہیم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

مزید یہ کہ میں نے بے شک مغربی جدید تعلیم حاصل کی لیکن میرا ایک مذہب بھی ہے اور ہر مذہب کا ایک دائرہ ہوتا ہے لہٰذا اگر میں اپنے آپ کو مسلمان کہوں گا تو پھر اسلام کے مقرر کردہ دائرے میں رہ کر ہی کام کرنا ہوگا۔

''مخلوق کے لئے خالق کا نظام'' کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے وہ صرف مسلمانوں کو سامنے رکھ کر ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کے لیے کی گئی ہے کیونکہ اللہ چونکہ سب کا خالق ہے کہ ساری مخلوق اُسی کی پیدا کردہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور مخلوق میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ سے حسن سلوک کرے۔

لہٰذا یہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کہ اگر دنیا میں امن قائم کرنا ہے تو خالق کے قانون کا اطلاق کرتے ہوئے مخلوق کو سرخرو کرنا ہوگا۔ اور یہ سوچ دنیا اور آخرت یعنی دونوں جہانوں کی کامیابی کے لیے ایک مرکزی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہرحال اِس تحقیقی کاوش میں ایک غیر جانبدار مبصر اور تجزیہ نگار کے طور پر کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے اربابِ اختیار و اقتدار کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس کے ضمیر کو جھنجوڑا جائے کہ ایک دوسرے کا باہمی وقار، ''جیو اور جینے دو'' کی پالیسی، ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' جیسے قانونِ جنگل کا خاتمہ، وسائل و ذخائر کی منصفانہ تقسیم، ملکی اور عالمی قوانین کی حکمرانی وغیرہ کے ذریعے سے ہی دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اور اس امن کی بدولت دنیا میں سیاسی اور معاشی استحکام آ سکتا ہے۔ اس کے لئے انتہائی خلوص کے ساتھ امت مسلمہ کو اس کی بے حمیتی، اپنے آپ کو ''جسد واحدہ'' نہ سمجھنے اور لسانی و علاقائی تعصّبات کی بدولت نقصانات اُٹھائے جانے کا احساس دلانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مسلم دنیا کے پاس وسیع وسائل و ذخائر ہونے کے باوجود اُس کی عوام خط غربت سے نیچے زندگی کیوں گزار رہی ہے؟ افغانستان، لیبیا، عراق اور شام، یمن کے ناگفتہ بہ حالات عالمی ضمیر کو نہیں جھنجوڑ رہے؟ اسلامی تعاون کی تنظیم (OIC) اور عرب لیگ مل کر ملتِ اسلامیہ کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں کیوں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے؟ اس نکتے پر بھی غور

کرنے کی ضرورت ہے کہ ان اداروں کے لئے یہ کیونکر ضروری ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی افادیت کو بحال کریں؟ عالمی جنگوں کے نقصانات یعنی کروڑوں انسانی جانوں کا زیاں، کھربوں کا مالی نقصان، پہلی بار ایٹمی اسلحہ کا امریکہ کی طرف سے استعمال اور اس کے مضر اثرات سے ہم نے کیا سبق سیکھا؟ ہٹلر، مسولینی، سٹالین، ماؤزے تنگ، ٹونی بلیئر، بش اور کلنٹن جیسے لوگوں کی طرف سے کروڑوں جانوں کا نقصان، ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟ یہ قتل و غارت گری بھی ''نظریات'' کی بنیاد پر کی گئی تھی اور یقینی طور پر یہ ''نظریات'' اسلامک آئیڈیالوجی سے نہیں لئے گئے تھے۔

اقوامِ عالم کی بے حسی اور دوہرے معیار کی طرف رُخ کرتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ مغربی اقوام اور اقوام متحدہ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان جیسے مسائل کا حل تو فوراً آزاد ریاستوں کی شکل میں نکال لیتے ہیں کیونکہ وہاں غیر مسلموں کے حقوق کی بات تھی۔ جبکہ فلسطین اور کشمیر کے مسلمان سسک سسک کر جی رہے ہیں اور خوف و دہشت کے ذریعے اُن کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل نفسیاتی مریض بنتی جا رہی ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ یہ مسلمان قومیں، اقوام متحدہ یا امریکہ کے ''انسانی حقوق'' اور جمہوریت والے لائحہ عمل کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کروا سکیں؟

اقوام متحدہ کی واضح قراردادوں میں ہے کہ فلسطینی علاقوں میں یہودی نئی بستیاں نہیں بنائی جائیں گی۔ دنیا کے اعتراض کے باوجود یہودی آبادکاری کا سلسلہ جاری ہے اور فلسطینی بچوں کا قتل عام جاری ہے۔ فلسطینی صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ عیسائی بھی ہیں لیکن بتدریج فلسطینی عیسائیوں کو یورپ اور امریکہ میں آباد کیا جا رہا ہے۔ شاید صدر ٹرمپ نے امریکی سفارت خانہ ''القدس'' میں منتقل کرنے کا اعلان اسرائیل کو فلسطین کش اقدامات کرنے کے انعام کے طور پر دیا ہے۔ لہٰذا میں اپنے یہودی کزنوں کو یہ احساس دلانا چاہوں گا کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو بین الاقوامی دھارے سے علیحدہ نہ کریں۔ اور اپنے وقار کا خیال۔ رکھیں کہ آنے والے دنوں میں اُن کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

حقیقت میں برطانیہ کے اندر سروے کے مطابق آدھے سے زیادہ عوام مذہب سے بیزار ہیں۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی، معاشرتی اور معاشی ہولوکوسٹ کسی مذہب یعنی عیسائیت کی وجہ سے ہوا ہے؟ یا پھر اسلحہ کے سوداگروں، گلوبلائزیشن کے ٹھیکے داروں اور وسائل پر قبضہ گروپوں کے لالچ اور حرص کی وجہ سے ہے؟

اس بات کو بھی ہمیں دیکھنا ہوگا کہ مغرب میں سیاستدانوں اور میڈیا کا اسلاموفوبیا کو پھیلا کر دائیں بازو کی انتہا پسند اور شدت پسند تنظیموں کے لئے راہ ہموار کرنا بین الاقوامی طور پر کون سے منفی اثرات مرتب کر رہا ہے۔ کیونکہ ان رویوں کی وجہ سے اب ایسے لوگ لوکل، علاقائی، ملکی اور یورپی انتخابات میں باقاعدہ نشستیں حاصل کر کے بعض اوقات ملک کی دوسری یا تیسری بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آ رہے ہیں۔

مغرب میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے دوہرے معیار نے عوام میں کس طرح ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی ہے۔ دہشت گردی ایک قبیح جرم ہے۔ لہٰذا دہشت گرد کے جرم کے ساتھ اُس کے مذہب کو نشانہ نہ بنایا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے مذاہب کے درمیان غلط فہمیاں بڑھیں گی اور بداعتمادی کی خلیج میں مزید اضافہ ہوگا۔

سابقہ سوویت یونین کا افغانستان میں شکست و ریخت کے بعد نئے سرے سے عالمی پلیٹ فارم پر اپنی طاقت کا اظہار کرنا، کمیونسٹ چین کا سرمایہ دارانہ نظام کی گلوبلائزیشن کو اپناتے ہوئے ایک عالمی طاقت کے طور پر اُبھرنا اور مسلم دنیا کا اُن کی طرف جھکاؤ ایسی حقیقتیں ہیں جس کا امریکہ کو شاید حقیقی معنوں میں ادراک نہیں ہوا۔ لہٰذا آئندہ آنے والے

برسوں میں مسلم دنیا ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوگی۔

سرمایہ دارانہ نظام کا لیڈر ملک امریکہ بیس کھرب ڈالر کا مقروض ہو اور دیگر مغربی ممالک بھی اربوں ڈالرز کے مقروض ہوں تو اس نظام کی افادیت پر بھی ایک سوالیہ نشان اُٹھتا ہے۔ تو کیا اسلام اِن نظاموں کا متبادل ہوسکتا ہے؟ اگرچہ اس کا تجربہ موجودہ دور میں ابھی تک کسی ملک میں نہیں کیا جاسکا۔

عراق جنگ میں نام نہاد مہلک ہتھیاروں سے متعلق ٹونی بلیئر کا جھوٹ، برطانیہ کے وزیر خارجہ رابن کک کا استعفیٰ اور پراسرار موت، برطانوی سائنسدان ڈاکٹر کیلی کی پراسرار موت نے مغربی معاشرے، پارلیمنٹ کی خودمختاری، اور انسانی حقوق پر کئی سوال اُٹھائے ہیں۔ لہٰذا شام کے خلاف قرارداد کا پاس نہ ہونا اِس بات کا ثبوت ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین عراق کے متعلق قرارداد کے پاس کرنے اور عراق پر حملے اور قبضے سے خوش نہیں تھی۔ امریکی صدارتی امیدوار اور امریکی فوج کے سابقہ سربراہ جنرل ویزلی کلارک کا 7 اسلامی ممالک پر امریکی حملہ اور تباہی امریکہ کی جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل جیسے اداروں کو غیر جانبدارانہ تحقیق کرنا ہوگی کہ کس طرح اسلحہ کے سوداگر اور تیل کے تاجر کمزور ممالک پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی اور پھر اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔

کیا مغربی اقوام نے نیٹو کے ڈپٹی کمانڈر جنرل نک کارٹر کے افغانستان اور عراق سے متعلقہ چشم کشا بیانات سے کوئی سبق حاصل کیا؟ یعنی جنگوں کی بجائے عوام کی مرضی سے کوئی سیاسی حل نکالا؟ کیا نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے 16 سال مکمل ہونے کے بعد بھی افغانستان میں امن قائم ہوسکا؟ کیا طالبان کا کنٹرول افغانستان سے ختم کردیا گیا؟ تو پھر کیوں نہ افغانستان میں طالبان کے ساتھ ڈائیلاگ (جس طرح برطانیہ نے شمالی آئرلینڈ میں IRA کے ساتھ کیا) کرکے ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے۔

صرف یورپ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا انتہا پسندی اور دہشت گردی کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ یورپ کے تقریباً ہر اہم ملک میں دہشت گردی کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہورہی ہیں۔ عالم اسلام سے پناہ گزینوں کی تعداد اب کروڑوں میں پہنچ چکی ہے۔ اس انسانی المیے کا محرک کون ہے؟ اس پر اقوامِ عالم کو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ایسے مخدوش حالات کی موجودگی میں امن ممکن ہے؟ تو کیا میں یورپین یونین کے اربابِ اختیار واقتدار سے یہ توقع کرسکتا ہوں کہ وہ دنیا میں اِس عدم استحکام اور دہشت گردی کے عوامل کو جان کر اس کے حل کے لئے ایک مضبوط، مربوط اور جامع پالیسی بنا کر اپنی عوام کو سکھ کا سانس مہیا کرنے والا ماحول دیں گے؟

امریکی انجینئروں اور سیاستدانوں کی تحقیق کے مطابق 9/11 کی حکومتی رپورٹ ایک جھوٹ کا پلندہ تھی۔ اور یہ کہ CIA اس گھناؤنے جرم میں شریک تھی۔ اس پر بین الاقوامی برادری نے کس ردِعمل کا اظہار کیا؟ تو کیا عام آدمی اقوامِ متحدہ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کے مطابق جنگوں کو روکنے میں ناکام کیوں ہوئی؟ کیا اس نظام سے متبادل کوئی طریقہ کار وضع کرنا ہوگا جس سے جنگیں رُک سکیں؟

اسلام میں جس وضاحت سے انتہا پسندی، دہشت گردی اور قتل وغارت گری کی مذمت کی گئی ہے کیا مسلم دنیا اس مؤقف کو مغربی دنیا کے سامنے صحیح معنوں میں پیش کرسکی ہے؟ کیا ہم دارالامن، دارالکفر اور دارالاسلام جیسی اسلامی اصطلاحات کی صحیح تشریح عوام کے سامنے پیش کرسکے ہیں؟ کیا OIC ایک بے بس، مجبور اور بے اختیار ادارے کی طرح

اغیار کا آلۂ کار بن کر کام کرتی رہے گی؟ یا خود کو اقوام عالم کے لئے کوئی با مقصد کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لائے گی؟

افغانستان، پاکستان اور بھارت میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو روکنے کے لئے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ بھارت اور پاکستان کے لئے یہ ممکن کیوں نہیں کہ وہ برطانیہ، جرمنی اور فرانس کی طرح اپنے اختلافات کو بھلا کر ''جنگ نہ کرنے کا پچاس سالہ منصوبہ'' بنائیں جس کے تحت دونوں ممالک اپنے دفاعی بجٹ کا ایک فیصد کم کریں اور پانچ سال کے لئے بتدریج اسی طرح بجٹ کو ایک فیصد کم کرتے رہیں۔ دفاعی بجٹ سے کم کی گئی رقم کو تعلیم اور صحت کے بجٹ میں استعمال کیا جائے جس سے براہِ راست عوام مستفید ہوگی۔ اور اس کی مانیٹرنگ کا ایک مؤثر انتظام ہو۔

انتہا پسندی، دہشت گردی اور جہاد کو ایک لڑی میں پرونے والوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ اسلام تو میانہ روی، برداشت اور عفو و درگزر کا درس دیتا ہے نہ کہ قتل و غارت گری کا۔ شاید مغرب اور عالم اسلام کو مل کر اسلامی تاریخ کے جھروکوں سے ایسی مثالیں تلاش کرنا ہوں گی کہ آنے والی نسلیں اعتدال کی راہ اپنانے کے ساتھ ساتھ سائنسی ترقی میں بھی اپنے عظیم ماضی کی یاد تازہ کر سکیں۔

مغربی عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے اربابِ اختیار و اقتدار کے جنگجو رویوں کو احتساب کی چھلنی سے نکالیں۔ کہ کس طرح اُنہوں نے جنگ کا ماحول خود ہی پیدا کیا اور بڑی مکاری کے ساتھ مسلمانوں ہی کے تعاون سے مسلمانوں پر جنگیں مسلط کر دیں۔ اگرچہ اس پوری تحقیق میں اکثر صیہونی سیاست دانوں، بینکاروں اور اداروں کے نام آئے ہیں لیکن مسلمان ممالک نے بھی اپنی کم مائیگی، کم علمی، بے دینی اور بے حمیتی کا ثبوت دیا کہ وہ اِس صیہونی سازش کو کامیاب بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مغرب اپنی جمہوری روایات و اقدار کا تحفظ ضرور کرے لیکن پاکستان، ترکی، ایران، افغانستان اور ملائیشیا جیسے اسلامی ممالک کی نظریاتی اساس کو چیلنج نہ کرے۔ کیونکہ یہ عالمی امن کے لئے انتہائی خطرناک قدم ہوگا۔ ''کہ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی''!

والسلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

References ..... حوالہ جات

حرفِ آغاز:

1. www.theguardian.com, Sep 21, 2017
2. Top 15 Defence Budgets 2015-International Institute for Strategic Studies
3. Military expenditures by Country-Stockholm International Peace Research Institute-World [Military expenditures, 2017 Fact Sheet (for 2016)]
4. 2016's Shocking Homelessness Statistics by Social Solutions
5. BBC News education by Hannah Richardson 01 December 2016
6. World War I casualties From Wikipedia
7. World War II casualties From Wikipedia
8. Highest death toll from a civil war-www.guinnessworldrecords.com
9. The New York Times By BILL KELLER, February 4, 1989 Argumentii Fakti, by historian Roy Medvedev,, February 3, 1989
10. The worst genocides of the 20th and 21st Centuries by Piero Scaruffi
11. The Independent 17 September 2010
12. NCB News, by M. Alex Johnson, March 10, 2008
13. The New York Times, By BEN WHITE and MICHAEL M. GRYNBAUM, SEPTEMBER. 15, 2008
14. https://www.investopedia.com, September 15, 2017
15. The Time Magazine September 16, 2008
16. The Telegraph, By Philip Aldrick, and Jeremy Warner, 24 September 2011
17. www.forbes.com, March 28, 2016
18. www.economicshelp.org, September 16, 2017
19. The Guardian, Patrick Butler, Monday 29 May 2017
20. Independent, Charlie Cooper, Thursday 14 April 2016
21. The Christian Science Monitor, By Peter Ford, SEPTEMBER 19, 2001
22. The Time Magazine, September 21, 2001
23. The Guardian, June 20, 2016
24. The News, May 26, 2017
25. CBC News, Canada, Nov 26, 2017
26. The Washington Post, June 8, 2017
27. Tillerson-Saudi textbooks, www.c-span.org/video/?c4684129/tillerson-saudi-textbooks, Jun 15, 2017 and www.housaloaded.com
28. Sura Hurat
29. Quran
30. Quran
31. Record number of British people have 'no religion' - The Independent www.independent.co.uk, September 4, 2017
32. British Social Attitudes: Record number of Brits with no religion, September 4, 2017

www.nacta.gov.pk/NAPPoints20.htm https://www.globalresearch.ca, May 21, 2015, The Pentagon's Strategy for World Domination: Full Spectrum BBC News, bbc.co.uk, Boy becomes Palestinian martyr news, 2 October, 2000

پہلا باب

1. The Time Magazine, Anders Behring Breivik's Manifesto: Template for Terrorism, by William Boston, July 24, 2011
2. 59 Dead, 500 Hurt in Las Vegas Music Festival Shooting - NYMag nymag.com/daily/intelligencer/2017/10/mandalay-bay-shooting.html Oct 2, 2017 and ABC News, 47 guns, loaded high-capacity magazines found in Vegas shooter's hotel suit, By MEGHAN KENEALLY, October 4, 2017
3. CNN, June 13, 2016, by Ralph Ellis, Ashley Fantz, Faith Karimi and Eliott C. McLaughlin, Orlando shooting: 49 killed, shooter pledged ISIS allegiance
4. CNN, October 3, 2016, American deaths in terrorism vs. gun violence
5. The New York Times, Sep 26, 2016, U.S. Murders Surged in 2015
6. The Guardian, Thursday 27 April 2017, Violent crime rising in England and Wales, Alan Travis
7. BBC News www.bbc.co.uk, Apr 12, 2017, Gun crime in London increases
8. http://www.gunviolencearchive.org, 2016
9. BBC NEWS, Sep 2, 2005, London bomber video aired on TV
10. Suloh Hudaibia
11. HuffPost UK, by Louise Ridley, February 15, 2015, The Holocaust's Forgotten Victims: The 5 Million Non-Jewish People Killed By The Nazis
12. Telegraph www.telegraph.co.uk, Jul 30, 2014- Something to fight for: the rise of Adolf Hitler
13. Pew Research Center, www.pewresearch.org, February 9, 2015, Europe's Jewish population
14. Pew Research Center, www.pewresearch.org, NOVEMBER 29, 2017, BY CONRAD HACKETT- 5 facts about the Muslim population in Europe
15. Pakistan Today, www.pakistantoday.com.pk, Aug 24, 2017, Trump's unlimited war in Afghanistan
16. www.ft.com, May 17, 2017, China takes 'project of the century' to Pakistan - Financial Times
17. How will CPEC Boost Pakistan Economy ?DELOITTE
18. Brookings institute, Mar 17, 2015, The impact of Libyan middle-class refugees in Tunisia
19,20.
21. Telegraph, Jul 21, 2013, The betrayal of Dr David Kelly, 10 years on
22. Telegraph, January 10, 2007, Robin Cook's anti-Blair legacy is set in stone
23. The Guardian March 17, 2003, Cook resigns from cabinet over Iraq
24. The Bureau of Investigative Journalism, October 2, 2016, Fake News and False Flags
25. www.genious.com, Seven Countries in Five Years, General Wesley Clark
26. Daily Mail Online, Oct 12, 2006, by SARAH SANDS, Sir Richard Dannatt : A very honest General
27. Human Rights First, Mar 23, 2017, GTMO By the Numbers Fact Sheet
28. CNN, April 10, 2017, Iraq Prison Abuse Scandal Fast Facts

29. Libya Crude Oil Production by Year, https://www.indexmundi.com and United States Energy Information Administration
30. www.foreignpolicyjournal.com,Jan 6, 2016, by Brad Hoff , Hillary Emails Reveal True Motive for Libya Intervention
31. www.globalresearch.ca, Apr 29, 2011, The Libyan War, American Power and the Decline of the Petrodollar
32. The Guardian, May 25, 2017, by Alia Brahimi, Why Libya is still a global terror threat

33. CNN Library, October 17, 2017, Syrian Civil War Fast Facts
34. www.huffingtonpost.com, by Munawar A Anees, It's ISIS vs. the World, Not Islam vs. the World | HuffPost
35. www.infowars.com, Nov 6, 2015, by Alex Jones, Rand Paul: "Look Where ISIS Gets Its Weapons From"
36. www.cnbc.com, June 16, 2014, How ISIS managed to acquire $2B in assets
37. UNHCR, www.unhcr.org, Jun 20, 2016, Global forced displacement hits record high
38. The independent, www.independent.co.uk, September 13, 2017
39. www.cbc.ca, September 18, 2017, Trudeau calls on Suu Kyi to condemn violence against Rohingya
40. www.independent.co.uk, March 10, 2016, Most literate nation in the world? Not the US

دوسرا باب

1. www.chevron.com, October 27, 1997, Consortium formed to build Central Asia gas pipeline
2. www.referenceforbusiness.com, Unocal Corporation Company Profile
3. Statement by John J. Maresca, Vice President, Unocal Corporation, Feb 12, 1998
4. Yvonne Ridley, In the Hands of the Taliban
5. The New York Times, www.nytimes.com, September 17, 2001, AFTER THE ATTACKS
6. CNN.com, November 6, 2001, You are either with us or against us
7. The Guardian, www.theguardian.com, September, 22, 2006, Bush threatened to bomb Pakistan, says Musharraf
10. Architects & Engineers for 9/11 Truth
11. ABC News, abcnews.com, May 2, 2011, Video released in December 2001 shows Osama Bin Laden's 9/11 Confession (2001)
12. ABC News Video, October 29, 2004, Osama Bin Laden Video Message Video

13. Global Research, https://www.globalresearch.ca, September 8, 2005, The 9/11 Commission Report: A 571 Page Lie
14. Video for statement of Malcolm Howard CIA agent, www.youtube.com, July 14, 2017, CIA Agent Confesses and www.Seekingthetruth.info On Deathbed: 'We Blew Up WTC7 On 9 11
15. www.documentingreality.com, September, 11, 2001, The Eleventh Day - Anthony Summers.pdf Documenting Reality
16. www.globalresearch.ca, May 21, 2015, The Pentagon's Strategy for World Domination: Full Spectrum

17. Veterans PTSD Statistics, www.veteransandptsd.com
www.thebalance.com, Oct 9, 2017, War on Terror: Facts, Costs, Timeline (Bush Statement)
18. www.usnews.com, Sep 9, 2016, Report: Post-Sept. 19. Wars Have Cost $4.79 Trillion
19 A. U.S. will seek billions more to support Afghan military efforts - The ... Https://www.washingtonpost.com/...billions...afghanistan.../3b6bb0b8-2f3d-11e6-b9d...
Jun 18, 2016

20. www.theguardian.com, Jun 28, 2013, 'We should have talked to Taliban' says top British officer
21. www.channel4.com, Afghanistan: a war we should be in?
22. www.youtube.com, Dialogue with South Asian Free Media Association (SAFMA)
23. www.youtube.com , Supporting Peace One Day's Global Truce NGO Coalition
24. www.youtube.com, Speaking at the Conservatives The Bow Group Summer Reception
25. www.youtube.com, https://vimeo.com/63323624, Democracy in Pakistan - Action (Commissioned by the Foreign & Commonwealth Office (FCO)
26. www.youtube.com, Perspectives with Faisal Qureshi

تیسرا باب

1. IRA bomb kills Lord Mountbatten: Guardian reporting from 1979 | UK ...
https://www.theguardian.com › World › UK News › Monarchy May 19, 2015
2. Margaret Thatcher: Seconds from death at the hands of an IRA bomber
www.telegraph.co.uk › News › Politics › Margaret Thatcher Apr 8, 2013
3.. www.theguardian.com, Oct 22, 2015, Sign of the times of racism in England that was all too familiar
4. crssblog.com, March 30, 2017, BEYOND BOUNDARIES AFGHANISTAN – PAKISTAN TRACK 1.5/ II

https://en.wikipedia.org/wiki/Durand_Line

چوتھا باب

(1) اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، قوانین کی اسلامی تشکیل۔ سلسلہ دوم، جلد چہارم، اکتوبر 2003ء ص viii
(2) ews Clippings, Archives of Freedom Movement (AFM) (University of Karachi) vol. 3 March-April 1938
(3) , January 1939, Yusufi: Speeches, Statements and Messages of Quaid-e-Azam 3:1334
(4) خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پبلشرز نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۸۳
(5) Yusufi: speechse, Statements and Messages of Quaid-e-Azam Volume-3, p 1334
(6) wordpress.com/2009/12/20/quaid-e-azam and holy quran
(7) قائداعظم کے بیانات، جلد چہارم۔ ترجمہ: اقبال احمد صدیقی۔ پبلشرز۔ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع ۱۹۹۸ء ص ۲۶۰ تا ۲۶۴
(8) قائداعظم کے بیانات، جلد چہارم۔ ترجمہ: اقبال احمد صدیقی۔ پبلشرز۔ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع ۱۹۹۸ء ص ۲۸۰
(9) قائداعظم کے بیانات، جلد چہارم۔ ترجمہ: اقبال احمد صدیقی۔ پبلشرز۔ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع ۱۹۹۸ء ص ۲۳۰ تا ۲۴۱
(10) قائداعظم کے بیانات، جلد چہارم۔ ترجمہ: اقبال احمد صدیقی۔ پبلشرز۔ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع ۱۹۹۸ء ص ۲۷۰
(11) خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پبلشرز نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۸۴
(12) قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم۔ جلد چہارم، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۳ء ص viii
(13) قائداعظم محمد علی جناح: موہن داس کرم چند گاندھی جی کے نام خط، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء۔ خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۸۳

(14) Latter: (From M.A Jinnah to M.K.Ghnadhi, 17 september 1944, Jinnah - Ghandhi Talks(September 1944 Dehli)

(15) قوانین کی اسلامی تشکیل ،سلسلہ دوم۔جلد چہارم،اسلامی نظریاتی کونسل،حکومت پاکستان،اکتوبر۲۰۰۳ء ص viii بحوالہ(Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, Ed. Syed Shareefuldeen Peerzada, pp210

(16) قوانین کی اسلامی تشکیل ،سلسلہ دوم۔جلد چہارم،اسلامی نظریاتی کونسل،حکومت پاکستان،اکتوبر۲۰۰۳ء ص viii بحوالہ (Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, Ed. Syed Shareefuldeen Peerzada, pp210-211

(17) allurdbooks.blogspot.com/2010/12/quaid-e-azam/islam and Pakistan.htmi

(18) مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں۔مرتبہ:جمیل الدین عالی۔ص۴۳

(19) قوانین کی اسلامی تشکیل ،سلسلہ دوم۔جلد چہارم،اسلامی نظریاتی کونسل،حکومت پاکستان،اکتوبر۲۰۰۳ء ص ix بحوالہ(Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, Ed. Syed Shareefuldeen Peerzada, pp210-211

(20) روزنامہ ڈان 30 جون 1947ء

(21) Speech and Statements (1947-48)pp28

(22) (سید قاسم محمود، ''قائداعظم کا پیغام''ص۱۰۳)

(23) (سردار محمد چوہدری ''فرمودات قائداعظمؒ روش روش روشن'' لاہور ۲۰۰۱ء ص۷۶)

(24) (سردار محمد چوہدری ''فرمودات قائداعظمؒ روش روش روشن'' لاہور ۲۰۰۱ء ص۷۶)

(25) اسلامی نظریاتی کونسل،ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی (فصل اول) ص46-45

(26) اسلامی نظریاتی کونسل،ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی (فصل دوم)

قائداعظم کی جدوجہد کا نظریاتی رُخ اور ان کے بیانات

(سردار محمد چوہدری ''فرمودات قائداعظمؒ روش روش روشن'' لاہور ۲۰۰۱ء ص۷۶)

چھٹا باب

Hillary Clinton speaks out about US links with Taliban
Www.youtube.com

1۔المائدة، ۵:۷۷

2۔سورہ النساء ۴: ۱۷۱

3۔سورۃ الحدید: ۲۷

4۔سورہ الاعراف ۷: ۳۱

5۔سورہ المائدہ ۵: ۸۷

6۔صحیح بخاری، حدیث: ۳۹، ج ۱، ص ۱۶

7۔سنن نسائی، حدیث 3057 باب التقاط الحصٰی، سنن ابن ماجہ، حدیث: 3029 باب قدر حصی الرمی

8۔صحیح البخاری ، حدیث: ۶۹، ج ۱ ، ص ۲۵

9۔صحیح بخاری: حدیث 701، باب اذا طول الامام وکان للرجل حاجۃ فخرج فصلی، راوی جابر بن عبداللہ

10۔صحیح بخاری: 90 باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم اذا رأی ما یکرہ راوی ابو مسعود انصاریؓ

11۔صحیح بخاری، حدیث 5861 باب الجلوس علی الحصیر ونحوہ، صحیح مسلم حدیث 215 (اور امام نسائی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے)

12۔صحیح بخاری، حدیث 1975 باب حق الجسم، فی الصوم، راوی عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ۔

13۔http://nacta.gov.pk/NAPPoints20.htm

14۔سورۃ المائدۃ ۵: ۲

15۔سورہ الحج ۲۲: ۳۹، ۴۰

16۔سنن ابو داؤد باب فی العصبیۃ حدیث : ۵۱۱۹

17۔سنن ابو داؤد باب فی العصبیۃ حدیث : ۵۱۲۰

18۔سنن ابن ماجہ باب العصبیۃ حدیث : ۳۹۴۹

19۔سنن ابن ماجہ ، باب لصاحب الحق سلطان حدیث : ۲۴۲۶

20۔سنن ترمذی ، حدیث 3165 باب و من سورۃ الانبیاء

21۔شبلی نعمانی، سیرت النبی، جلد دوم

ساتواں باب

1 (سنن ابوداؤد ص 292 حدیث 2548، راوی سہل بن حنظلہ)

2 (سنن ابوداؤد ص 340 حدیث: 2567، باب فی الوقوف علی الدآبۃ، راوی حضرت ابو ہریرہؓ)

3 (صحیح مسلم، ص 375، باب الکشف عن معایب رواۃ الحدیث)

4۔(سنن ابوداؤد، حدیث: 5239 باب فی قطع السدر۔ راوی عبداللہ بن حبشیؓ)

5۔(المائدة : ۳۲)
6.ابن کثیر۔ج3ص94)
7۔(الحجرات : ۱۳)
8.(صحیح بخاری،حدیث:۱۲۳)
9۔(صحیح بخاری، کتاب الجہاد،حدیث:۲۸۱۰)
(10)۔(سنن ابو داؤد، حدیث2516باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا،راوی حضرت ابو ہریرہؓ)
11.(الحج :۳۹،۴۰)
12۔البقرة: ۱۹۰
13.(الانفال : ۳۹)
14.(البداية والنهاية ، ج: ۷ ، ص: ۳۹)
15.(فقہی مقالات: ج۲)
16۔(صحیح مسلم ،حدیث:1731 کتاب الجهاد والسیر)
17.(ابوداؤد، کتاب الجہاد،حدیث:۲۶۱۴)
18۔(بخاری ، باب قتل الصبيان فی الحرب، حدیث : ۳۰۱۴)
19.(مؤطاامام مالک،حدیث:۱۶۲۷اوجامع الاصول لابن کثیر)
20.(صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب۱۰،حدیث:۳۹۸۷)
21.(دلائل النبوة للبيهقی، ج: ۴ ، ص: ۲۱۹)
22۔(فقہی مقالات ج۲بتغیر)
23۔(کتاب الاموال ، لابی عبید ، ص: ۱۷۵)
24۔(فقہی مقالات ج۲)
25۔(صحیح بخاری حدیث نمبر۲۹۴۲)
26۔(الانفال : ۶۱)
27۔(صحیح بخاری ، کتاب الشروط،حدیث:2731،راوی مسور بن محترمہؓ)
28.(التوبة ۷)
29.(فقہی مقالات ج۲بتغیر)
30۔(سورة الانفال ۸:۷۲)
31.(سورة الانفال ۸:۵۸)
32۔سورہ المائدہ:۳۶
33.(صحیح مسلم،حدیث:77 ج ۱ ص ۱۲ راوی حضرت ابو ہریرہؓ)

آٹھواں باب

1۔ The Transfer of Power in India by V . P. Manan صفحہ 113

2۔ (Jewish Encyclopedia. Retrieved 20 January 2014.

نواں باب

1۔ ((Jewish Encyclopedia. Retrieved 20 January 2014.

2۔(مسئلہ فلسطین از ڈاکٹر فاروق خان۔صفحہ 144)

3۔ ("The Balfour Declaration". Israeli Ministry of Foreign Affairs. 2013.

دسواں باب

1۔مسئلہ فلسطین از ڈاکٹر فاروق خاں صفحہ 154

تیرہواں باب

1.(الانفال : ٦١).

2 . (النساء : ١٣٥)

3۔(تفسیر عثمانی: ج ا،ص ۴۶۳)

4۔(المائدة: ٨)

5۔ (آسان ترجمہ قرآن: ج ا،ص ۳۲۸)

6۔ (بنی اسرائیل :٣٤)

7.(صحيح مسلم .حديث:1787 كتاب الجهاد والسير، باب الوفاء بالعهد)

8۔ (الممتحنة:٨)(آسان ترجمہ قرآن: ج ۳،ص ۱۷۱۸)

9۔ (صحيح البخارى ، كتاب الاستسقاء ، حديث: ٤٨٢١)

10. (شرح السير الكبير للسرخسى ، باب صلة المشرک :ج : ١ ، ص: ٦٩)

11. (آسان ترجمہ قرآن: ج ا،ص ۳۲۳)

12۔(فقہی مقالات: ج ٦)

13۔(سیرت ابن ہشام، ج:۲،ص:۳۹)

14۔(آسان ترجمہ قرآن: ج ا،ص ۱۶۲)

15۔(الفتاوى الهنديه ، ص: ٢٣٨ ، كتاب الحظر والاباحة: الباب الرابع)

16.(ترمذى، كتاب الديات،باب ماجاء فيمن قتل نفسا معاهدة ، حديث: ١٤٠٣)

17۔(ابو داؤد ، كتاب الخراج والامارة ، باب تعشير أهل الذمة ،حديث :٣٠٥٤،)

18۔(تاريخ الطبرى ج ۴ ص ۲۱۸)

19.(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۲۵۷)
20. (کتاب الخراج لابی یوسف ص۲۵۹)
21۔(شرح السیر الکبیر باب۱۲۷ ج۴ص۸۶)
22۔(اسلام اور سیاسی نظریات)
23۔(اسلام اور سیاسی نظریات: مؤلفہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم)

چودھواں باب

1۔سورۃ النساء: آیت:۱۵۸۔۱۵۷ ترجمہ: آسان ترجمۃ القرآن۔از:۔مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
2۔(سنن مسلم شریف: ج۱ص۸۷)
3۔نزول مسیح اور علاماتِ قیامت۔از:۔حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ''ترجمہ وتشریح: مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

پندرھواں باب

1۔(سورہ المائدہ: آیت۱۰۵)
2۔(آسان ترجمہ قرآن، مفتی محمد تقی عثمانی، جلد۱، ص۳۷۱۔۳۷۲)
3۔(البقرہ:۱۹۴)
4۔(تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۲۴۵)
5۔(النحل،۱۲۸)
6۔(تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۶۵۳)
7۔(تفسیر مظہری، ج۱، ص۱۸)
8۔(تفسیر قرطبی، ج۱، ص۱۶۱۔۱۶۲)
9۔(یوسف :۵)
10. (فاطر:۶)
11۔(الجاثیۃ:۲۳)
12۔(اعتلال القلوب للخرائطی: ج۱، ص۲۶)
13۔(قرطبی)
14۔(معارف القرآن: ج۵، ص۸۶، ۸۷)
15۔(تاریخ المدینہ لابن شبۃ: ج۲، ص۶۶۷)
16۔(التوبۃ : ۱۱۹)

تصاویر کے حوالہ جات

Https://commons.wikimedia.org/wiki/File:Muhammad_al-Durrah_second_diff.jpg
Http://www.ukprogressive.co.uk/romney-to-push-elderly-into-poverty-homelessness/article
Https://www.theway.co.uk/news/people-relying-on-uk-food-banks-rises-by-53-this-year
Https://www.google.com.pk/search?safe=active&hl=en&biw=1440&bih=745&tbm=isch&sa
Https://joinhomebody.com/blog/2016/9/24/there-are-60000-homeless-people-in-nyc-right-now
Https://www.gettyimages.com/photos/abu-ghraib-prison
Https://www.pinterest.com/pin/533254412115072871/
https://www.pinterest.com/pin/533254412115072871/
Https://en.wikipedia.org/wiki/Guantanamo_Bay_detention_camp
Http://www.alamy.com/stock-photo-tony-blair-mask-with-blood-on-his-hands-at-demonstration-outside-parliament

کتابیات

اس کتاب کی تیاری کے دوران متفرق ممالک کے اسفار کیے اور درج ذیل کتب سے بھرپور استفادہ کرنے کا موقع ملا ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

شمار	نام کتاب	مصنّف/مؤلف	سنِ اشاعت
1	تفسیر معارف القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ	1984
2	تفسیر عثمانی	شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ	2001
3	تفسیر قرطبی	ابوعبداللہ محمد ابن احمد ابن ابوبکر القرطبی	2001
4	آسان ترجمہ قرآن	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ	2011
5	بخاری شریف	امام محمد ابن اسمٰعیل بخاری رحمہ اللہ	2009
6	مشکوٰۃ شریف	الامام ولی الدین بن محمد بن عبداللہ	2006
7	مجمع الزوائد	الحافظ امام نورالدین علی الھیثمی	1999
8	فقہی مقالات	حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ	
9	علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ	
10	قوانین کی اسلامی تشکیل	علامہ محمد اسد	
11	فرموداتِ قائداعظم روش روش روشن	سردار محمد چودھری	2001
12	مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں	جمیل الدین عالی	2003
13	قائداعظم کی جدوجہد کا نظریاتی رُخ اور ان کے بیانات	اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ	2003
14	خطباتِ عثمانی	پروفیسر محمد انورالحسن شیرکوٹی	2003
15	تاریخ المدینہ	ابن شبۃ	
16	اسلام اور سیاسی نظریات	مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم	

یادداشت

یادداشت

یادداشت



ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم سے ممبر آف برٹش ایمپائر (MBE)
کا اعزاز وصول کرتے ہوئے بکنگھم پیلس فروری 2010

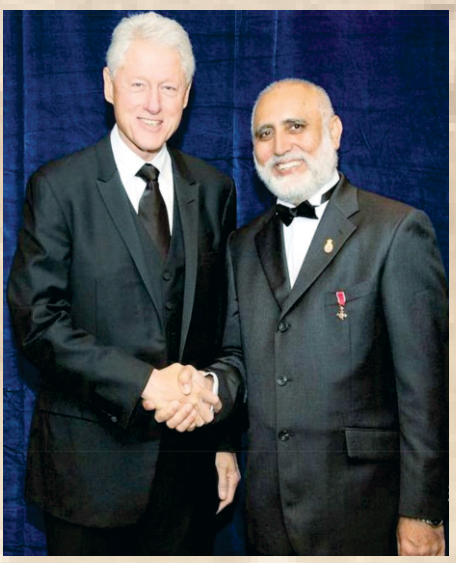

سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے ساتھ،
انٹراپرینیورل کانفرنس لندن 2012ء کے موقع پر

اغیار کی ''ٹیسٹنگ گراؤنڈ''

میں جناب طٰہٰ قریشی کے حلقہ احباب میں شرکت کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اُن سے قدرے تفصیلی تعارف کا شرف مجھے حاصل ہے۔ برطانیہ میں بھی ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا اور ان کی سوانح عمری کے مسودے کے مطالعے کی بدولت بھی قربت کا تعلق قائم ہوا۔

طٰہٰ قریشی صاحب ایک صاحب علم ''برطانوی نژاد پاکستانی مسلمان'' کے طور پر جانے جاتے ہیں اور ملکہ برطانیہ سے باقاعدہ ایوارڈ یافتہ بھی ہیں۔ تعلیمی میدان میں ان کی خدمات وسیع ہیں، بین المذاہب ہم آہنگی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے ان کی کوششیں دنیا بھر میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ بین الاقوامی نشریاتی اداروں (بی بی سی اور سی این این وغیرہ) سے ان کے تجزیے نشر ہو کر داد وصول کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زیر نظر کتاب میں ''قیام امن اور اقوام عالم'' کا تذکرہ عالم اسلام کی سسکتی ہوئی صورتِ حال کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ جہاں انہوں نے مغرب کے دہرے معیارات کی نشاندہی کی ہے، وہاں مسلمان ممالک کی بے حسی اور بے حمیتی کو بھی نظر انداز نہیں کیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ ''اپنوں'' کو انہوں نے 'غیروں' سے بڑھ کر آئینہ دکھایا ہے۔ ان کی تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ زوال امت کے حقیقی اسباب پر ان کی نظر ہے اور ان کے خاتمے کے لئے بھی ان کی بصیرت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

فاضل مصنّف محض ایک وسیع المطالعہ شخص نہیں ہیں، وہ ملکوں ملکوں پھرے ہیں اور مختلف معاشروں کے امراض اور احوال کا براہ راست مشاہدہ بھی کیا ہے اور بڑی مہارت سے ملت ابراہیمی سے منسلک مذاہب کی توجہ ان کی اجتماعی اقدار اور ان کے فروغ کے لئے مشترکہ کردار کی طرف مبذول کرائی ہے۔ ان کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ اس وقت دنیا میں جو کہرام مچا ہوا ہے اس وسائل کے حصول کی دھینگا مشتی کہنا زیادہ منصفانہ ہوگا۔ ان کے یہ الفاظ تو دل کو مٹھی میں بند کر لیتے ہیں کہ: ''پہلے ظلم کے خاتمے کے لئے یا کسی تنازع کے حل کے لئے جنگیں لڑی جاتی تھیں، لیکن اب ظلم یہ ہے کہ اسلحہ بیچنے کے لئے پہلے جنگی ماحول پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال کے لئے ایک ملک کو ٹیسٹنگ گراؤنڈ کے طور پر چن لیا جاتا ہے۔ آج کل مسلم دنیا تو مستقل طور پر ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنی ہوئی ہے۔'' مجھے امید ہے کہ فاضل مصنّف کی کاوش سے اہل علم کے ساتھ ساتھ طالب علم بھی استفادہ کریں گے اور بگڑی ہوئی تقدیر کو پھر سے سنوارنے کا جذبہ فزوں تر ہوگا۔

مجیب الرحمٰن شامی

AL-KITAB GRAPHICS
ISBN 978 969-9337-01-07
Toaha Qureshi FOUNDATION
METRON COLLEGE United Kingdom
FIRD PERSPECTIVESFOR TOMORROW
AL-KITAB